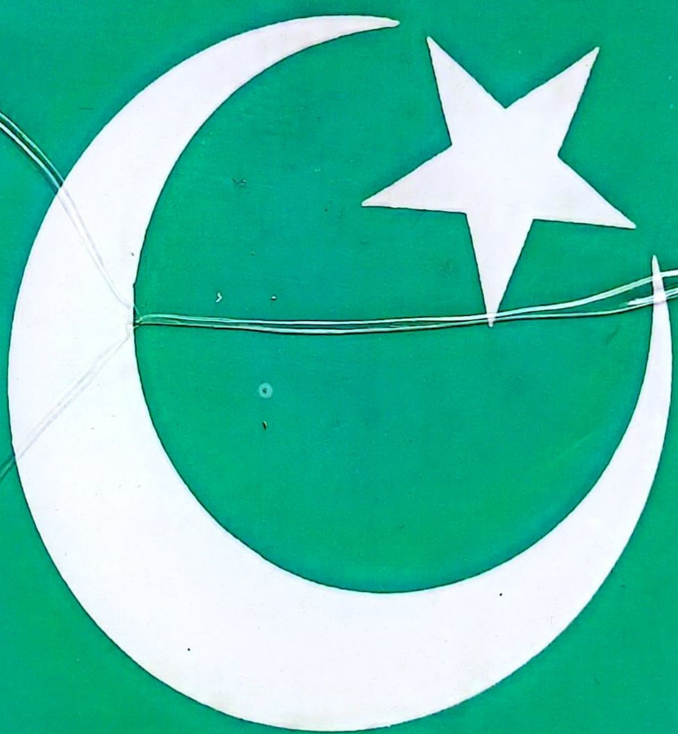
شاد باد



منزلِ مُراد

سعید راشد

آرمی پبلک سکو[ل]
جہلم کینٹ

بک اونر : آصف سعید

سکین بائے : سلمان سلیم
03048890501

تکنیکی معاونت: راحیل ارشد

شاد باد منزلِ مُراد

(ترمیم و اضافہ کے ساتھ)

سعید راشد

مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۲

مستقبل کو سلام

ایک بوڑھے اطالوی فلسفی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اکثر صبح سویرے شہر روم کے ایک ایسے چوراہے پر جا کر کھڑا ہو جاتا جہاں سے چھوٹے بچے سکول جاتے ہوئے اچھلتے کودتے گزرتے تھے۔ چنانچہ جو بچہ ادھر سے گزرتا وہ اسے بڑے چاؤ سے ہاتھ اٹھا کر سلام کرتا ایک روز ایک نیازمند نے اس سے اس طرزِ عمل کی توجیہہ چاہی تو اس عظیم دانشور نے جواب دیا

"میں اطالیہ کے مستقبل کو سلام کر رہا ہوں۔"

یہ ناچیز پاکستان کے مستقبل کو سلام کرتا ہے۔

انتساب

پاکستان میں جہاں کہیں بھی کوئی ایسا طالبعلم ہے جو محنتی ہے، جفاکش ہے، بلند حوصلہ ہے جسے سیکھنے کا شوق ہے، جو اپنے ذہن کو روشن کرنا چاہتا ہے، جو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو چمکانے کی کوشش کرتا رہتا ہے، جو اپنے کردار پر بھی نظر رکھتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جسے پاکستانیت کا شعور ہے، اور جو تحریک پاکستان کی قدر (یں) سے محبت رکھتا ہے، میں ہر ایسے طالب علم اور طالبہ کو سلام کرتا ہوں۔

سعید راشد

فہرست

باب اوّل

نشانِ منزل

باب دوئم

روشن راہیں۔ مذاکرے

باب سوئم
قائداعظمیات

باب چہارم

اقبالیات

باب پنجم
تقاریر اور مباحثے

باب ششم

منارۂ نور

باب ہفتم
دانشکدہ

۹۹ روشنی اے روشنی!
(نعتوں، ترانوں اور نظموں کا انتخاب)

نعتیں:

ملی ترانے:

نظمیں :

ضمیمہ

برجواناں سہل کن حرف مرا

ڈاکٹر غلام حسین اظہر

پروفیسر سعید راشد کی دردمندی و دلسوزی اور پاکستان سے والہانہ شیفتگی مختلف صورتوں میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ قائد اعظم، علامہ اقبال، شہدائے جنگ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء اور ملٹری کالج جہلم کے اساتذہ پر بڑا دقیع، فکر انگیز اور دلنشین کام کر چکے ہیں ان کی یہی لگن شاد باد منزل مراد میں کارفرما ہے، ان کی ایک ہی آرزو اور لگن ہے کہ وہ نئی نسل کی فکری آبیاری اور کردار سازی اس ڈھنگ سے کر سکیں کہ نئی نسل ان اقدار و روایات کا پیکر محسوس ہو، جن اقدار و روایات کے تحفظ اور سربلندی کی خاطر پاکستان وجود میں آیا، تخلیق پاکستان سے بھی مشکل مرحلہ استحکام پاکستان کا ہے، اس امر سے وابستگان تحریک پاکستان باخبر تھے لیکن ان میں سے اکثر کو اس مرحلہ کی تکمیل کا موقع نہیں مل سکا، تحریک پاکستان کے نامور رہنما نواب بہادر یار جنگ کا یہ فقرہ اسی حقیقت کا ترجمان ہے۔

"پاکستان حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا پاکستان کو بنانا مشکل ہوگا۔"

پاکستان کی تعمیر و ترقی کے لئے کس قسم کے کارکنوں کی ضرورت ہوگی، اس امر کی نشاندہی بھی بہادر یار جنگ نے ان الفاظ میں کی۔

"ہمیں ان لوگوں کی ضرورت ہے جو کھاد بن کر زمین میں جذب ہوتے ہیں اور جو مٹی اور پانی میں مل کر رنگین پھول پیدا کرتے ہیں، ہم بنیاد کے ان پتھروں کو چاہتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے زمین میں دفن ہو کر اور مٹی کے نیچے رہ کر اپنے اوپر عمارت کی مضبوطی کی ضمانت قبول کرتے ہیں" ایسے ایثار کیش افراد کے علاوہ پروفیسر سعید راشد کی دانست میں فکر و نظر کی روشنی بھی درکار ہے، اور فکر و نظر کی یہ روشنی تخلیقی نظام تعلیم پیدا کر سکتا ہے، انہوں نے اپنا

فلسفہ تعلیم ان بصیرت افروز الفاظ میں سمویا ہے۔

"تعلیم نصابی کتابیں رٹنے اور امتحان پاس کرنے کا نام نہیں۔ تعلیم کا مقصد ذہن کی نشوونما ہے، مطالعہ سے، مشاہدہ سے، تجربے سے دماغ کو روشن کرنا ہے اس لئے صرف جاننا کافی نہیں سمجھنا بھی ضروری ہے اور سمجھنا بغیر سوچنے کے ممکن نہیں، اس لئے بہتر تعلیم وہ ہے، صحیح تعلیم وہ ہے جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرے، خود ذہن کی تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کرے"۔

تخلیقی صلاحیتوں کی بیداری کے ساتھ ساتھ وہ کردار کو نکھارنے کے عمل کو بھی لازمی قرار دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے۔

"صرف علم بھی کافی نہیں صرف جاننے، سمجھنے اور سوچنے سے زندگی کی کٹھن منزلیں سر نہیں ہوں گی۔

بے معرکہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
علم ذریعہ ہے اور کردار مطلوب و مقصود"

علم کی ان دو بنیادی شرائط کو ملحوظ خاطر رکھ کر انھوں نے اپنی اس کتاب "شاد باد منزل مراد" کو ترتیب دیا ہے، ان دو مقاصد نے اس کتاب کے مختلف ابواب میں فکری ربط اور تسلسل پیدا کیا ہے، پہلے باب "نشان منزل" میں انھوں نے حب وطن کا جوہر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے دوسرے باب "روشن راہیں" میں انھوں نے ان اقدار کی نشاندہی کی ہے جو حب وطن کے لئے ضروری ہیں احترام انسانیت، حریت پسندی، سخت کوشی، اصول پرستی، صداقت شعاری اور حسن و صداقت کی خاطر سقراط کی طرح جاں سپاری کی اقدار کی اہمیت کو انھوں نے اس باب میں واضح کیا ہے تیسرے باب "مینارۂ نور" میں ان اقدار کی مزید تشریح و توضیح قرآن حکیم اور محسن انسانیت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اسوہ حسنہ کی روشنی میں کی ہے، اس باب میں انھوں نے مختلف قرآنی اصطلاحات کی روایتی انداز سے

ہٹ کر فکر انگیز توضیح کی ہے مثلاً تقویٰ پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے۔

"تقویٰ کا خوف محبت اور احترام سے پیدا ہوتا ہے"۔

ایسی ہی بصیرت افروز بحث انہوں نے تصور توحید پر انسانی شخصیت اور معاشرہ پر توحید کے ہمہ گیر اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے فرمایا ہے۔

"جو معاشرہ توحید پہ مبنی ہو اس میں افتراق اور انتشار کی گنجائش ہی نہیں رہتی، بلکہ توحید عالمگیر اخوت کی ضامن ہے"۔

ایک اور مقام پر توحید کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے یہ حقیقت بیان فرمائی ہے۔

"توحید پر ایمان رکھنے سے مسلمانوں کا لاشعوری رجحان تمام حد بندیوں سے اوپر اٹھنے کی طرف ہوتا ہے"۔

اسوۂ حسنہ اور احادیث کی روشنی میں انہوں نے منصب نبوت میں تعلیم و تعلم کے کام کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔

باب چہارم میں قائد اعظمؒ کی شخصیت کے امتیازی اوصاف پر روشنی ڈالی گئی ہے قائد اعظمؒ کی عظمت اور شخصیت کا تجزیہ بڑا فکر انگیز ہے اور معنوی اعتبار سے کئی ضخیم کتابوں پر بھاری ہے، قائد اعظمؒ کے تعلیمی افکار اور طلباء سے ان کی توقعات کو خصوصی طور پر اہمیت دی گئی ہے، قائد اعظمؒ کی عملی زندگی کی مثالوں سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ ان کے کردار اور گفتار میں کتنی زبردست مطابقت اور ہم آہنگی تھی، باب پنجم میں اقبال کے افکار اور کردار کی یک رنگی کو غیر معمولی اہمیت دے کر طلباء کو اپنے کردار کو مفکر پاکستان کے سانچے میں ڈھالنے کی راہ دکھائی گئی ہے، باب ششم میں تقریروں اور مباحثوں کے ذریعے قومی، ملی اور بین الاقوامی سطح پر طلباء کو مختلف قوموں کے عروج و زوال کے محرکات و اسباب سے آگہی بخشی گئی ہے جس فلسفہ تاریخ کو اس باب میں سمونے

کی کوشش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ بلند اقدار کی سربلندی کی خاطر جہد مسلسل اور جینے مرنے کی آرزو قوموں کو زندہ و تابندہ رکھتی ہے عیش کوشی، لذت پسندی اور سہل انگاری کا رجحان ان کے لئے زہر ہلاہل ثابت ہو سکتا ہے۔

نئے ایڈیشن میں "دانشکدہ" کے عنوان سے باب ہفتم کا اضافہ بھی کیا گیا ہے، اس میں فکر و تدبر کے لئے ذہنی آزمائشیں شامل کی گئی ہیں، یہ ذہنی آزمائشیں ان کے عمر بھر کے مطالعے، مشاہدے اور تجربے کا ماحصل ہیں، اور یہ فکر و نظر کے نئے دریچے واکرتی ہیں مشرق و مغرب کے نامور دانشوروں اور فلسفیوں کے صدیوں پر پھیلے ہوئے خزینہ حکمت کو ان ذہنی آزمائشوں میں سمو دیا گیا ہے، یہ ذہنی آزمائشیں طلبا میں ذوق تخلیق و تحقیق بڑھانے کے لئے یقیناً مہمیز کا کام دیں گی۔ ذوق تحقیق و جستجو اور فکر و تدبر کا جذبہ ہی ہمارے دور کی سب سے بڑی ضرورت ہے، یہ مشقیں مرتب کر کے ایک دور رس کام کی ابتدا کر دی گئی ہے، یہ مشقیں پاکستان کی تعلیمی تاریخ میں ایک فکر انگیز تجربے کی حیثیت رکھتی ہیں ان سے استفادہ کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ابتدا میں نمایاں تعلیمی اور تربیتی اداروں میں ایک مجلس فکر و تدبر THINKERS' FORUM قائم کر کے ذوق آگہی کو عام کرنے کی ابتدا کی جاتے "دانشکدہ" میں کلام اقبال کا منتخب حصہ بھی شامل ہے تاکہ طلبا اہم افکار اقبال سے روشناس ہو سکیں۔ اقبال کی منتخب نظموں کے علاوہ قومی نظموں کے انتخاب، "آواز دوست" کے منتخب اقتباسات اور طلباء سے قائد اعظمؒ کے خطابات کے انتخاب نے اس باب کی اہمیت و افادیت کو مزید بڑھا دیا ہے۔

پوری کتاب میں فکر و نظر کی روشنی اور سوز و گداز کا بڑا حسین امتزاج موجود ہے جو یقیناً ضمیر لالہ میں چراغ آرزو کو روشن کرے گا اور وطن عزیز کے ہر طالب علم کو شہید جستجو بنائے گا اور یہی سعید راشد کا اصل مقصود ہے۔

غلام حسین اظہر

۲۰/اکتوبر ۱۹۸۹ء

پیش لفظ

کسی قوم کی ترقی کا معیار اور حوالہ اس کے طلبہ ہوتے ہیں۔ ان کے ذہن کی روشنی اور کردار کی قوت سے قومیں آگے بڑھتی ہیں نام پاتی ہیں۔ پاکستان کا ارتقا اور استحکام بھی بڑی حد تک طلبہ اور نوجوانوں ہی سے وابستہ ہے۔ وہ طلبہ اور نوجوان جو نہ صرف تخلیقی ذہن رکھتے ہوں، باکردار ہوں بلکہ پاکستانیت کا گہرا شعور بھی رکھتے ہوں، کھرے اور پکے مسلمان اور پُرجوش پاکستانی ہوں گویا اقبالؒ کے الفاظ میں خبر، نظر اور اذانِ سحر میں یکتا ہوں

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا ✿ خبر میں، نظر میں، اذانِ سحر میں

اس مقصد وحید کی تکمیل کے لیے بہت سا اور ہر طرح کا لٹریچر بھی چاہیئے تاکہ شروع ہی سے طلبہ کی نظریاتی تربیت اور کرداری رہنمائی ہو سکے۔ اس ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کتاب "شادباد منزل مراد" مرتب کی گئی ہے۔

اس کا پہلا باب جس کا عنوان "نشان منزل" ہے تعلیم کے بنیادی تصورات اور پاکستانیت کی قدروں کو اجاگر کرتا ہے۔ دوسرا باب "روشن راہیں" طلبہ کی ذہنی اور کرداری تربیت کیلئے ہے اور ان چند مسائل سے بحث کرتا ہے جن سے طلبہ زمانہ طالب علمی میں دوچار ہو سکتے ہیں اس میں مذاکرہ کی تکنیک استعمال کی گئی ہے اس کا ایک مقصد تدبّر و تفکر کی صلاحیتوں کو ابھارنا بھی ہے۔ تیسرا باب "قائداعظمیات" کے عنوان سے ہے اس میں قائداعظمؒ کے حوالے سے پاکستان پر ضروری مواد یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس باب کے آخر میں قائداعظم کے عظیم کردار پر کچھ مکالمے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ یہ باب یوم پاکستان اور یوم قائداعظم کی تقریبات پر کام آ سکتا ہے۔ چوتھا باب "اقبالیات" کے نام سے مفکر پاکستان علامہ اقبالؒ پر ہے اس کے شروع میں فکر اقبال کا مختصر سا تعارف ہے اور بعد میں سیرت اقبال پر چند مکالمے ہیں جن سے علامہ کے کردار پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ پانچواں باب چند مختصر تقریروں اور خیال انگیز مباحثوں پر

مشتمل ہے۔ چھٹے باب کو منارۂ نور کا عنوان دیا گیا ہے اس میں اسلامی موضوعات کی روشنی ہے گو مواد نیا نہیں لیکن اسلوب میں جدت ضرور ہے۔

میری ساری عمر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزری ہے۔ مجھے اس قول کی صداقت پر پورا یقین ہے کہ قومیں درسگاہوں میں پروان چڑھتی ہیں اور اگر تباہ ہوتی ہیں تو وہیں تباہ ہوتی ہیں۔ پاکستان کو بنانے میں طالب علموں نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اب اس کو ترقی دینے اور مستحکم کرنے میں بھی انہیں اہم تر کردار ادا کرنا ہے۔

شاد باد منزل مراد

یہ مجموعہ تحریک پاکستان کے ایک پرانے سپاہی کی طرف سے ایک عاجزانہ کوشش ہے مجھے امید ہے یہ طلبہ کی نظریاتی، تعلیمی اور کرداری رہنمائی کے لیے ایک بنیاد فراہم کر سکے گا۔ اس کی حیثیت بارش کے پہلے قطرہ کی سی ہے۔ خدا کرے اس سے پاکستانیت کو فروغ ہو۔ جس کے لیے یہ کاوش کی گئی ہے۔

"شاد باد منزل مراد" کے اس تیسرے ایڈیشن میں چار نئے مذاکروں دس نئی تقریروں اور تین نئے فیچروں کے علاوہ دانشکدہ کے نام سے ایک نئے باب کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ جس میں قومی، علمی اور اخلاقی نظموں کا ایک انتخاب، اقبال کی چار مشہور نظموں کے ماخذ، آوازِ دوست کے اقتباسات، ارشادات قائداعظمؒ اور غور و فکر کے لیے مشغلیں شامل ہیں۔

اس ایڈیشن کے لیے جناب ڈاکٹر غلام حسین اظہر نے ایک خصوصی تعارف لکھا ہے۔ میں اس نظر کرم کے لیے اظہر صاحب کا از حد ممنون ہوں۔ یہ ایڈیشن تحریم نواز ایجوکیشنل ٹرسٹ کے چیئرمین ڈاکٹر شاہد احمد نواز کے تعاون سے شائع کیا جا رہا ہے۔ جزاک اللہ

سعید راشد

باب اوّل

نشانِ منزل

منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی

تعلیم نصابی کتابیں رٹنے اور امتحان پاس کرنے کا نام نہیں۔ تعلیم کا اصل مقصد ذہن کی نشوونما ہے۔ مطالعہ سے، مشاہدہ سے، تجربے سے دماغ کو روشن کرنا ہے۔ اس لیے صرف جاننا کافی نہیں۔ سمجھنا بھی ضروری ہے اور سمجھنا بغیر سوچنے کے ممکن نہیں، اس لیے بہتر تعلیم وہ ہے صحیح تعلیم وہ ہے جو سوچنے، سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرے اور جو ذہن کی تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کرے۔

لیکن صرف علم بھی کافی نہیں۔ صرف جاننے، سمجھنے اور سوچنے سے زندگی کی کٹھن منزلیں سر نہیں ہوں گی۔

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں

علم ذریعہ ہے اور کردار مطلوب و مقصود۔ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔ کردار کا تعلق تربیت سے ہے اس لیے تربیت کی اہمیت رسمی تعلیم سے بھی زیادہ ہے۔ محض علم تو دو دھاری تلوار ہے اس سے فائدہ بھی ہو سکتا ہے اور نقصان بھی۔ تربیت سے علم نفع کا سبب بنتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ سے جب علم کی دعا کی جاتی ہے تو علم نافع کی دعا کی جاتی ہے تعلیم راستہ ہے کردار منزل۔ بقول اقبالؒ:

نگہ بلند، سخن دلنواز، جان پرسوز
یہی ہے رختِ سفر، میرِ کارواں کے لیے

ایک مفکر کا قول ہے کہ آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا۔ آدمی پیدا ہوتا ہے اور انسان تہذیبی عمل سے بنتا ہے۔ تربیت ہی وہ تہذیبی عمل ہے جس کے ذریعے آدمی انسان میں بدلتا ہے جو اس کے اندر چھپا ہوتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ آدمی سے انسان کی طرف سفر ایک مشکل سفر ہے ہر ایک کی قسمت میں انسان ہونا بھی نہیں ہوتا۔

لیکن تم اس مشکل کو آسان کرو۔ تم اس مقام بلند پر کمند ڈالو، ہمت سے، حوصلے

سے سفر شروع کرو، اور بڑھے چلو ؂

شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا　اگر پردم ہے تُو تو نہیں خطرہ افتاد

زندگی آزمائش بھی ہے اور انعام بھی۔ زندگی اپنے عظیم انعامات صرف ان دلیروں اور بہادروں کو پیش کرتی ہے جو آزمائش کی بھٹی سے تپ کر نکلے ہیں۔ یہ آزمائش کبھی زہر کا پیالہ بن جاتی ہے اور کبھی کربلا کا میدان۔ تم ہر آزمائش کے لیے تیار رہو، خواہ وہ کسی شکل میں آئے۔

تم یکتا بنو، خیبر میں بھی نظر میں بھی۔ اور اذانِ سحر میں بھی۔

تم نے ایک بلند چوٹی پر پہنچنے کے لیے پتھروں پر چلنا شروع کر دیا ہے۔ احتیاط سے حوصلے سے آگے بڑھتے رہو۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو ع

تو راہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول

تُو اے مسافرِ شب، خود چراغ بن اپنا

عزیز طلباء!

ایک وقت تھا جب تم اپنی امی کی گود میں کھیلتے تھے۔ پھر انگلی پکڑ کر چلنے لگے۔ اس کے بعد تم نے خود چلنا سیکھا نہ صرف چلنا بلکہ کچھ دنوں میں دوڑنے بھی لگے۔ تمہیں یاد ہے جب تم تمہاری بسم اللہ ہوئی تھی۔ الف، ب سے ابتداء کی تھی۔ اب ماشاءاللہ فر فر پڑھتے ہو۔ بڑے سے بڑے کام کی ابتداء اسی طرح ہوتی ہے۔ بیج ہی سے پیڑ بنتا ہے۔ رفتہ رفتہ بچہ ماں کی گود سے نکل کر زندگی کی شاہراہ پر قدم رکھتا ہے، آہستہ آہستہ، لیکن ہر قدم آگے کی طرف اٹھتا ہے اور بلندی کی طرف بھی۔ تم جانتے ہو کہ بلندیوں کو سر کرنا آسان نہیں ہوتا اس میں جان بھی مارنی پڑتی ہے اور خطرات کا مقابلہ بھی کرنا پڑتا ہے لیکن جنہیں کامیابی و کامرانی کی اونچی چوٹی تک پہنچنا ہے، وہ نہ مشقت سے جی چرائیں گے اور نہ خطروں سے ڈریں گے بلندیوں تک پہنچنے کا انعام بھی تو بڑا ہوتا ہے۔ اگر زندگی میں بڑا بننا آسان ہوتا تو ہر شخص

بڑا بن جایا کرنا۔ ہر قیمتی چیز کی طرح بڑائی بھی، عزت بھی، اپنی قیمت رکھتی ہے۔ اگر تم بڑائی حاصل کرنا چاہتے ہو، اگر تمہیں عزت پانے کا شوق ہے اگر تم صحیح معنوں میں کامیاب و سرفراز ہونا چاہتے ہو، تو کمر کس کے تیار ہو جاؤ۔

اب تک تم سایہ دار درختوں کی چھاؤں میں ہموار راستوں میں سفر کر رہے تھے، اب چڑھائی شروع ہوتی ہے، اب ہمت و حوصلے اور کردار کے امتحان کا وقت آن پہنچا ہے اب کھرا اور کھوٹا کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ اب جو آگے بڑھے گا وہ منزل مراد تک پہنچے گا۔

گھر اور سکول میں، والدین اور باہر کی دنیا میں جو فرق ہے وہ تم اچھی طرح سمجھ لو۔ گھر میں دوسرے تمہیں سہارا دیتے تھے۔ گھر سے باہر نکلتے ہی رفتہ رفتہ انسان کو خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ خود اپنا سہارا بننا پڑتا ہے، یہی دنیا کی ریت ہے، یہی قانون فطرت ہے۔ پیڑ بھی بڑا ہو جائے تو خود اپنے تنے کے سہارے کھڑا ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی سمجھو کہ گھر میں ماں باپ قابلیت کو نہیں ضرورت کو دیکھتے ہیں۔ گھر میں کوئی مقابلہ، کوئی امتحان نہیں ہوتا۔ اسکول میں مقابلہ کی فضا ہوتی ہے۔ یہاں ہر معاملہ میں ہر قدم پر استحقاق دیکھا جاتا ہے گھر میں لاڈ ہو سکتا ہے، باہر نہیں، گھر میں من مانی، ضد، سستی چل سکتی ہے، باہر نہیں۔

کرے اسکول قابلیت، محنت اور شوق کا کھیل ہے۔ یہاں تو وہی آنکھ کا تارا، کامیاب و کامران ہو گا جو جان مارے، جو کوشش کرے، جو محنت کرے، جو دوسروں کے کام آئے جو احسان کر سکے، جو مل جل کر کام کرے، جو کلاس کی اور اسکول کی عزت کا خیال رکھے یہاں تنگ دلی، تنگ نظری نہیں چل سکتی، یہاں تن آسانی کی کوئی جگہ نہیں۔

اسکول میں تم صرف کتابیں پڑھنے اور امتحان پاس کرنے نہیں آئے ہو۔ یہاں تم زندگی بنانے آئے ہو۔ یہ کامیابی کی شاہراہ پر تمہارا پہلا قدم ہے۔ یہاں بہت سی کامیابیاں اور عزتیں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ اسکول کا زمانہ کئی لحاظ سے زندگی کا بہترین زمانہ ہوتا ہے۔ یہاں زندگی بھر کے اچھے دوست ہی نہیں ملتے، یہاں تمہیں روشنی ملے گی، راہنمائی ملے گی، بہت

اچھے، بلند نظر اور بلند کردار اساتذہ ملیں گے، جو تمہاری صلاحیتوں کو اجاگر کریں گے اور جو تمہاری ہمت افزائی کریں گے۔ اگر سب نہیں تو دو ایک ایسے اساتذہ ضرور ہوں گے جو ممکن ہے تمہیں اتنی شفقت، اتنی توجہ دیں کہ ہو سکتا ہے تم گھر کو بھول جاؤ۔

یہ اس لیے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ جس طرح وہ ماں باپ کے دل میں بچوں کی محبت ڈال دیتا ہے اسی طرح وہ بعض استادوں کے دل میں بھی شاگردوں کی محبت ڈال دیتا ہے تاکہ بچے محبت و شفقت کی راحتوں اور نقوینوں سے گھر سے باہر کی دنیا میں محروم نہ رہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ربوبیت ہے کہ وہ اپنے بندوں کی ہر ضرورت کا، ہر منزل اور ہر مرحلہ میں خیال رکھتا ہے۔

بہر حال، مختصر یہ کہ عزیزو اور پیارو، اسکول بھی تمہارا گھر ہی ہے یہاں تم اپنے آپ کو تنہا نہ سمجھو، لیکن اپنے پیروں پر کھڑا ہونا، اپنے زورِ بازو پر اعتماد کرنا بھی سیکھو، اپنے ذہن سے کام لو، اپنے اندر کردار کی قوت پیدا کرو اور یاد رکھو کہ ؏

سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں

یہ مصرعہ اقبالؒ کا ہے۔ آخر میں اقبالؒ ہی کا ایک شعر سنو اور اسے گرہ میں باندھ لو ؎

تُو اے مسافرِ شب، خود چراغ بن اپنا
کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

شاد باد منزلِ مراد

معزز مہمانِ خصوصی، خواتین و حضرات!

پاکستان ہی وہ منزلِ مراد ہے جس کی ابتداء وہ پہلی اذان تھی جو سندھ کے ریگزاروں میں محمد بن قاسم نے دی۔ اور مسلم قومیت کی بنیاد بقول قائدِ اعظمؒ اس دن پڑی، جب ہند کے بُت کدہ میں پہلے ہندو نے کلمۂ حق لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ پڑھا۔ اس کے بعد صدیوں مسلمان اور ہندو یکجا رہے لیکن مسلمانوں نے اقلیت میں ہوتے ہوئے بھی اپنے علیحدہ قومی وجود کو

ہمیشہ برقرار رکھا۔ وہ قومی وجود جو لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کی بنیاد پر ہی قائم رہ سکتا ہے۔

یہ پاک سرزمین، یہ کشورِ حسین، یہ مرکزِ یقین، یہ ارضِ پاکستان، ہی وہ منزلِ مراد، وہ نشانِ عزمِ عالی شان، ہے جس کے لیے مسلمان جدوجُہد کرتے رہے۔

شاد باد منزلِ مراد

خدا کرے، یہ پرچم ستارہ و ہلال، یہ رہبرِ ترقی و کمال، ہمیشہ پائندہ و تابندہ رہے اور اس پر تا ابد سایۂ خدائے ذوالجلال رہے۔ آمین!

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ منزلِ مراد یعنی پاکستان شاد کیسے ہو، اس کو پائندہ اور تابندہ کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ ارض پاکستان کو صحیح معنوں میں ارض پاک اور کشور حسین کیسے بنایا جائے؟

اس سوال کا جواب زیادہ مشکل نہیں۔ پاکستان کو زندہ اور تابندہ بنانے کی طرف پہلا قدم یہ ہے کہ ہر پاکستانی کو یہ شعور ہو کہ میں پاکستانی ہوں۔ تعلق کا یہ احساس، یہ شعور ہی پاکستان کو شاد و آباد کرنے کی پہلی شرط ہے۔

خواتین و حضرات!

ایک مشہور قومی نغمہ ہے کہ "تیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے"۔ یہ بھی ایک خیال انگیز اور خوب صورت نغمہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ارضِ پاک کا ذرہ ذرہ ہمارا ہے۔ اس کے کوہ و دمن، اس کے دشت و دریا، اس کے گل و نسترن ہمارے ہیں۔ اس کی بہاریں، اس کی فضائیں ہماری ہیں، لیکن میرے دل کی آواز، میرے ذہن کی سوچ، میری امنگوں کا ترجمان وہ نغمہ ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے:

میں بھی پاکستان ہوں تو بھی پاکستان ہے

یہ کہنا کہ میں بھی پاکستان ہوں تو بھی پاکستان ہے ایک بہت بڑا دعویٰ ہے۔ ایک بہت بڑے چیلنج کو قبول کرنا ہے، ایک بہت بڑی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا

عزم ہے۔ اس عزم کو نبھانے کے لیے ہر پاکستانی کو اپنی نگاہ کو بلند، سخن کو دل نواز اور جان کو پرسوز کرنا ہوگا اور گفتار و کردار دونوں میں اللہ کی برہان بھی، بننا ہوگا۔

جس پیڑ کی چھاؤں میں انسان بیٹھا ہو، اس کی جڑوں کو پانی دینے میں اپنا ہی فائدہ ہے۔ پاکستان ہے تو ہم بھی ہیں۔ پاکستان مستحکم و محفوظ رہے گا تو ہم بھی زمانے کی ہوائے گرم سے محفوظ رہیں گے۔

آخر میں، میں صمیم قلب سے یہی دعا کروں گا کہ:

شاد باد منزلِ مراد

مرکزِ یقین شاد باد

مرکزِ یقین شاد باد

صدرِ مجلس: ابھی آپ نے "منزلِ مراد" کی تشریح سُنی، اب ہم اس سوال کا جواب تلاش کرنا چاہتے ہیں کہ منزلِ مراد یعنی پاکستان، شاد کیسے ہو۔ اس کو پائندہ اور تابندہ کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ ارض پاکستان کو صحیح معنوں میں ارضِ پاک اور کشورِ حسین کیسے بنایا جائے؟ ۔۔۔ میں سب سے پہلے محمود کو اظہار خیال کی دعوت دیتا ہوں۔

محمود: پاکستان کو مضبوط اور خوب صورت بنانے کی طرف پہلا قدم یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو احساس ہو، شدید احساس، کہ ہم پاکستانی ہیں تعلق کا یہ احساس سب سے اہم چیز ہے۔

صدر: احمد آپ کا خیال کیا ہے؟

احمد: یہ احساس کہ ہم پاکستانی ہیں، پاکستان ہمارا ہے، ہمیں اس کو بنانا ہے، سنوارنا ہے، صحیح تعلیم کے بغیر ممکن نہیں، اس لیے میرا خیال ہے کہ ہمارے اسکولوں کو قومی شعور پیدا کرنے کی طرف خصوصی توجہ کرنی چاہیئے۔

صدر : کس طرح؟ سعید، آپ کیسے محسوس کرتے ہیں؟

سعید : مثلاً اسکول میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا اسکول ہی ہمارا پاکستان ہے۔ ہمارا کمرہ ہمارا پاکستان ہے۔ یہاں کے لان، پھول، فرنیچر، بجلی، پانی ہر چیز ہماری ہے۔ چاک کا ٹکڑا ہو یا بجلی کا سوئچ کوئی چیز ضائع نہ ہو۔ قائداعظمؒ نے ایک بار فرمایا تھا کہ اپنی چیز کو ضائع کرنا بیوقوفی ہے لیکن قومی چیز کو ضائع کرنا جرم ہے۔

صدر : خلیل، آپ کا کیا خیال ہے؟

خلیل : میں سمجھتا ہوں کہ طلبا میں قومی شعور کی کمی کی ذمہ داری ایک حد تک، والدین اور اساتذہ پر بھی ہے جب تک والدین اور اساتذہ اس پہلو پر زور نہیں دیں گے، طلبا میں قومی شعور پیدا نہیں ہو گا۔ پاکستان پر فخر کرنے پر ہمیں فخر کرنا چاہیے۔

صدر : آخر میں، شمیم سے درخواست کروں گا کہ وہ اختتامی بحث کریں۔

شمیم : حاصل کلام یہ ہے کہ منزل مراد یعنی پاکستان کو شاد کرنے کا احساس، پاکستان کو شاد کرنے کی طرف پہلا قدم ہے۔ طلبا میں اپنے پاکستانی ہونے کا شعور ہونا چاہیے، انہیں پاکستانی ہونے پر فخر ہونا چاہیے اور اپنے علم کو وسعت دینی چاہیے، اپنے ذہن کو روشن کرنا چاہیے، ہمارا پاکستان ہمارا اسکول، ہمارا ہوسٹل، ہمارا کلاس روم ہے۔ اچھا طالب علم بھی وہی ہے جو پاکستان کے لیے ہر روز کچھ کرے۔ خواہ وہ کام، کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھانا، یا بے ضرورت پنکھے اور بلب کو آف کرنا ہی کیوں نہ ہو۔ یوں ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے پاکستان سے محبت بڑھے گی۔

میں بھی پاکستان ہوں، تُو بھی پاکستان ہے

صدر : ایک مشہور قومی نغمہ ہے، تیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے۔ اس سے متاثر

ہو کر ہم نے اس مذاکرے کا عنوان چُنا ہے۔

میں بھی پاکستان ہوں تو بھی پاکستان ہے

اس موضوع پر بولنے کے لیے میں سب سے پہلے اختر کو دعوت دیتا ہوں۔

اختر : یہ بڑا اچھا موضوع ہے اور نیا موضوع ہے۔ اگر موضوع یہ ہوتا کہ میں بھی پاکستانی ہوں تو بھی پاکستانی ہے تو کوئی خاص بات نہ ہوتی۔

صدر : کیوں؟

اختر اس لیے کہ ہر شخص جو پاکستان کا شہری ہے پاکستانی ہے، اس میں کوئی نکتہ نہیں لیکن یہ کہنا کہ میں بھی پاکستان ہوں تو بھی پاکستان ہے بالکل نئی اور انوکھی بات ہے اور بڑی خیال انگیز اور معنی خیز بات ہے۔

صدر : ذرا وضاحت فرمائیے۔

اختر : دیکھئے جب میں یہ کہتا ہوں کہ میں پاکستانی ہوں اس کا مطلب ہے میرا تعلق پاکستان سے ہے۔ لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ میں بھی پاکستان ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ میں خود پاکستان ہوں، یہ بہت بڑا دعوای اور بہت بڑی ذمہ داری ہے یہ وہی کہہ سکتا ہے جو پاکستان سے محبت بلکہ عشق کرتا ہو۔ یہ تو قائدِاعظمؒ ہی کہہ سکتے تھے کہ میں پاکستان ہوں، وہ واقعی پاکستان تھے۔

صدر : انور، آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

انور : مجھے اس سے اختلاف ہے صرف قائدِاعظمؒ ہی پاکستان نہیں تھے، ہم بھی پاکستان ہیں۔ ہمیں بھی اس سے وہی تعلق ہونا چاہیئے جو قائدِاعظمؒ کو پاکستان سے تھا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ پاکستان کے بچے بچے کو قائدِاعظمؒ بننا چاہیئے اور پاکستان بننا چاہیئے۔

صدر : سبحان اللہ! بہت بڑی اور بہت اچھی بات کہی آپ نے۔ آپ یہ فرمائیے کہ ہم

قائداعظمؒ کیسے بن سکتے ہیں؟

اشرف : میں یہ عرض کروں گا کہ ہم خود قائداعظمؒ بنیں بلکہ ان کو یقین تھا کہ ہم نوجوانوں میں سے بہت سے جناحؒ پیدا ہوں گے۔ ۱۹۳۷ء میں کلکتہ میں مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس میں قائداعظمؒ نے مسلم نوجوانوں سے کہا۔

نوجوانو! مستقبل آپ کے ہاتھوں میں محفوظ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میں سے بہت سے جناحؒ پیدا ہوں گے!

صدر : بہت سے جناح پیدا ہونے کا کیا مطلب ہے؟

اطہر : اس کا مطلب ہے کہ جناحؒ کے سے کردار کے لوگ پیدا ہوں گے اور جناحؒ کا کردار کیا تھا؟ اقبالؒ کے الفاظ میں؛

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز

گفتار اور کردار دونوں میں اللہ کی بُرہان۔ قائداعظمؒ پر دیانت ختم تھی محنت اور خدمت میں ان کا جواب نہیں تھا۔ وہ حد درجہ کھرے اور سچے اور جرأت مند انسان تھے۔ قائداعظمؒ بننے کا مطلب یہی ہے کہ ہم بھی ان کے کردار کو اپنا آئیڈیل بنائیں اور پاکستان سے بھرپور اور پُرشعور جذباتی تعلق پیدا کریں جو قائداعظمؒ کو پاکستان سے تھا۔

صدر : آپ کچھ کہنا پسند کریں گے؟

اکرم : اطہر نے بہت خوبصورت اور موثر انداز میں قائداعظمؒ بننے کے تصور کو اجاگر کیا ہے۔ میں اس میں صرف یہ اضافہ کروں گا کہ جس پیڑ کی چھاؤں میں انسان بیٹھا ہو، اس کی جڑوں کو پانی دینے میں اپنا ہی فائدہ ہے۔ پاکستان ہے تو ہم بھی ہیں۔ پاکستان مستحکم اور محفوظ ہے تو ہم بھی زمانے کی ہوائے گرم سے محفوظ ہیں ورنہ ہندوستان اور مقبوضہ کشمیر میں جو مسلمانوں کا حال ہے وہ ہم سب کو

معلوم ہے اس لیے یہ سوچنا کہ میں بھی پاکستان ہوں تو بھی پاکستان ہے نہ صرف ایک بہت بڑا عزم اور بہت بڑی ذمہ داری ہے بلکہ وقت کا اہم ترین تقاضا بھی ہے۔

صدر : آپ سب حضرات کا شکریہ۔

زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

صدرِ مجلس : معززِ سامعین، مذاکرے کا عنوان ہے :

"زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری"

اس موضوع پر اظہارِ خیال کے لیے میں سب سے پہلے انور کو دعوت دیتا ہوں۔

انور : جناب والا اور حاضرینِ گرامی۔

مذاکرے کا عنوان اقبال کی مشہور نظم "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" کا دوسرا مصرعہ ہے۔

اقبالؒ نے کمسن طلبار کے لیے جو کچھ لکھا ہے، اس میں یہ نظم بہت اہمیت رکھتی ہے اس میں جس طالب علم کی تصویر کھینچی گئی ہے وہ صحیح مسلمان سچا پاکستانی ہے۔ چونکہ طلب علم ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔ اس لیے وہ علم کی شمع سے پروانے کی طرح محبت رکھتا ہے ؎

زندگی ہو میری پروانے کی صورت یا رب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب

صدرِ مجلس : اب اکرم اظہارِ خیال کریں گے۔

اکرم : میں آپ کی توجہ اس نکتے پر مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ یہ طالب علم، علم کس لیے حاصل کر رہا ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ علم حاصل کرنے سے اس کا مقصد کیا ہے۔ اس کا جواب اسی دعا میں موجود ہے یہ اچھا طالب علم خدا سے دعا کرتا

ہے کہ اس کی زندگی شمع کی صورت ہو تاکہ وہ اس روشنی سے اجالا کر سکے۔ صرف اپنے ملک میں نہیں بلکہ اسلام کی روشنی کی طرح علم کی روشنی بھی ساری دنیا کے لیے ہے۔ اپنوں کے لیے بھی اور غیروں کے لیے بھی، اسی لیے وہ کہتا ہے ؎

دُور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے

"ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے"۔ اس میں ہر جگہ کا لفظ غور طلب ہے۔ یہی صحیح اسلامی نقطہ نظر ہے۔

اشرف میں کچھ عرض کروں؟

صدر فرمائیے۔

اشرف اس دعا میں وطن کو نظر انداز نہیں کیا گیا ؎

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

اس شعر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وطن کی محبت اور خدمت تعلیم کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔

صدر مجلس : وطن سے محبت اور خدمت کے کیا معنی ہیں؟

اشرف : محبت کا مطلب ایثار اور احسان کرنا ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہمیں اپنے ہم وطنوں سے، اپنے ساتھیوں، دوستوں اور پڑوسیوں سے اچھی طرح پیش آنا ہے، ان کے ساتھ انصاف کرنا ہے، ہمدردی کرنا ہے اور قومی مفاد کو ملحوظ رکھنا ہے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہمارے اندر قومی شعور ہو۔ اس لیے قومی شعور کو بیدار کرنا اور اس کو ترقی دینا پاکستان میں تعلیم کے اہم مقاصد میں سے ہے۔

صدر : اختر آپ اس سلسلے میں کچھ کہنا پسند کریں گے؟

اختر — قوم سے محبت کے سو طریقے ہو سکتے ہیں لیکن اقبال نے قومی خدمت کے ایک اہم ذریعے کی خود وضاحت کر دی ہے۔

صدر — وہ کیا؟

اختر — اسی دعا کا شعر ہے:

ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کمزوروں اور ضعیفوں کی مدد کرنا اور ان کے کام آنا بہت بڑی نیکی ہے اور یہی عین اسلام ہے۔

صدر — آخر میں رشید سے درخواست کروں گا کہ وہ اس موضوع پر تبصرہ کریں۔

رشید — اس نظم کا سب سے زیادہ خوب صورت اور معنی خیز ٹکڑا اس کا آخری شعر ہے ؎

میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس راہ پہ چلانا مجھ کو

یہ ہر مسلمان کی پہلی دعا ہے۔ نیکی کی تلاش اور برائی سے گریز، یہی مومن کی پہچان ہے۔ سورۂ فاتحہ کی آیت ہے:

"اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ"

گویا مسلمان طالب علم برائی سے بچتا ہے اور جو راہ نیک ہوتی ہے اس راہ پہ چلتا ہے۔ معروف کو اختیار کرتا ہے اور منکر سے گریز کرتا ہے۔

صدر — میں اس مذاکرے کا اختتام اس شعر پر کرتا ہوں ؎

ہر دشت کو نغموں سے گلزار بنا جائیں
جس راہ سے ہم گزریں کچھ پھول کھلا جائیں

شکریہ۔

ایک ترانہ ایک قول و قرار

ہم سب سے پہلے مسلمان ہیں اور پاکستانی۔
ہم اسلامی عظمتوں کے امین ہیں اور پاکستان کے ناموس کے محافظ بھی۔
ہم یکتا ہیں خبر میں بھی، نظر میں بھی۔
ہم صداقتوں کے شاہد ہیں۔
اور شہادت مطلوب ہے اور مقصود بھی۔
ہم نرم دم گفتگو ہیں اور گرم دم جستجو۔
ہم پاکستان کے جری فرزند ہیں، ہم خطر پسند ہیں۔
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان۔
ہم پاک سرحدوں کے پاک دل، پاک نظر محافظ ہیں۔
ہماری سیرت صورت فولاد ہے۔
ہم دشمن پر عقاب بن کر جھپٹتے ہیں۔
ہم صحرا و دریا کو دو نیم کرنا جانتے ہیں۔
لیکن ہم امن کے سفیر بھی ہیں۔
ہمارے قلب روشن ہیں اور دماغوں کے دریچے کھلے ہوئے ہیں۔
ہم نے قدیم روایتوں کو تازہ کیا ہے۔
لیکن ہم نئی روایتوں کو قائم کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔
سخن دلنواز، نگہ بلند، جاں پُرسوز
ہم ہیں ارض پاک کے ہونہار سپوت
ہم صرف ایک خوف سے واقف ہیں۔

اور وہ ہے اللہ کا خوف۔

اور ہمیں صرف ایک کھیل پسند ہے اور وہ ہے شہادت کا کھیل،

ہمارے دلوں میں صرف ایک آرزو مچلتی ہے اور وہ ہے اسلام کی عداقتوں پر جان سے شہادت دینے کی آرزو۔

ہم اسلامی عظمتوں کے جواں سال امین ہیں اور پاکستان کے ناموس کے باحوصلہ محافظ۔

ہم یکتا ہیں خبر میں بھی، نظر میں بھی۔

ہم پاکستان کی سرحدوں کے محافظ ہیں۔ زمینی سرحدوں کے بھی۔ نظریاتی سرحدوں کے بھی۔

شاد باد منزل مراد

پوستین اور پاکستان

ایک بادشاہ کے بارے میں جو کبھی گڈریا تھا، مشہور ہے کہ اس نے اپنی پرانی پھٹی ہوئی بُودار پوستین خزانے کے ایک گوشے میں محفوظ رکھ چھوڑی تھی۔ جب سلطنت کے کروفر اور جاہ و حشم کا نشہ چڑھتا تو چپکے سے خزانے کا دروازہ کھولتا، صندوق سے پوستین نکالتا۔ آنکھوں سے لگاتا، سر پر رکھتا، شکر گزاری کے آنسو اس کی آنکھوں سے نکلتے، وہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہوتا اور کہتا۔ اے معبود! تیرا کتنا کرم ہے کہ تو نے ایک گڈریئے کو بادشاہ بنایا۔ مٹی کو آسمان کیا۔

ہر شخص کی اپنی پوستین ہوتی ہے جو اسے سنبھال کر رکھنی چاہیئے تاکہ وقتاً فوقتاً اسے اس کی اوقات یاد دلاتی رہے اور جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کی ہیں ان کی قدروقیمت سے وہ غافل نہ ہوجائے۔ افراد کی طرح اقوام کی پوستین بھی ہوتی ہے۔ ایک پوستین پاکستانی قوم کی بھی ہے اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات کے بعد سے ہم مسلسل تباہی کی طرف جا رہے تھے۔ ۱۸۵۷ء تک ہم انگریزوں کے محکوم ہو چکے تھے اور اس کے بعد ہندوؤں کی دائمی غلامی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہمارا قومی وجود خطرے میں تھا۔ اسلام کا تمدنی مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ محکوم ہو کر مسلمان

بحیثیت مسلمان کے زندگی بسر کر ہی نہیں سکتا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے مسلمانوں کے روحانی وجود کو بھی خطرہ تھا اور ان کے مادی وجود کو بھی۔

پاکستان نے نہ صرف ہماری روحانی بقا کا موقع فراہم کیا بلکہ ہماری مادی زندگی کو بھی ہزار ہا درجے بہتر اور برتر بنا دیا۔

پاکستان ہمارا گھر ہے، پاکستان ہمارا ملجا و ماوی ہے، پاکستان ہماری زندگی ہے پاکستان کو قائم رکھنا، اس کو مستحکم کرنا، اس کی خدمت کرنا، خود اپنے آپ کو مستحکم کرنا، اپنے آپ کو زندہ رکھنا ہے اور آخر میں، میں آپ کو بتا دوں کہ پاکستان کو مستحکم کرنے اور پاکستان کو مضبوط بنانے کے لیے آپ کو دور جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کے لیے آپ کا اسکول ہی آپ کا پاکستان ہے۔ آپ کا ہاؤس آپ کا پاکستان ہے۔ آپ کا کلاس روم آپ کا پاکستان ہے۔ آپ کا جہاد اپنے ذہن کو روشن کرنا اور اپنے کردار کو مضبوط کرنا ہے جو قدم بھی آپ ذمہ داری اور سچائی کی راہ میں اٹھائیں گے وہ پاکستان کی تعمیر و ترقی کی طرف اٹھے گا۔ تعمیر و ترقی

ہم ہیں وطن کے پاسباں

جناب صدر!

میں پاکستان کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ وطن کی خاطر جان دینے والوں کی کمی نہیں۔ صحرا و دریا دونیم کرنے والے بھی ہیں۔ دشت تو دشت ہیں دریا کو پامال کرنے کا حوصلہ بھی لوگ رکھتے ہیں۔ غرض وطن سے جذباتی محبت کا شدت سے اظہار کرنے والوں کی کمی نہیں اس مسئلے پر سوچ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پاکستان کو زندہ رہ کر کام کرنے والوں کی بھی کم ضرورت نہیں بلکہ ایک لحاظ سے زیادہ ہے۔

پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے لیے وطن کے جیالے موجود ہیں اور چوکس ہیں۔ جب بھی دشمن نے انہیں للکارا وہ میدان کارزار میں آ گئے۔ مسئلہ پاکستان کی نظریاتی

سرحدوں کا ہے، شر اور انتشار کی ان قوتوں کو شکست دینے کا ہے جو گلی گلی اور گاؤں گاؤں برسرِ پیکار ہیں۔ پاکستان کو قائم اور مضبوط کرنے کا مسئلہ درپیش ہے۔ پاکستان بن تو گیا لیکن پاکستان کو قائم کرنے کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔

میں پاکستان کو قائم کرنے کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ پاکستان کو قائم کرنے کی لڑائی گھروں اور سکولوں میں جاری ہے۔ یہیں ہار ہوگی یہیں جیت۔ میں چھوٹا ضرور ہوں، لیکن اتنا چھوٹا بھی نہیں کہ پاکستان کے بُرے بھلے کو نہ سمجھ سکوں۔ مجھے معلوم ہے کہ پاکستان کو بنانے میں طلباء نے کیا کردار ادا کیا تھا اور کتنی جدوجہد کی تھی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اب اس کو استوار کرنے اور مستحکم کرنے کے لیئے اس سے بھی زیادہ طویل اور صبر آزما جدوجہد کی ضرورت ہوگی اور میں اس کے لیئے دل و جان سے تیار ہوں۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ میں پاکستان کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں تو میں اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ کسی بڑے مقصد کے لیے زندہ رہنا اس کے لیے جان دے دینے سے کم مشکل نہیں مجھے معلوم ہے کہ میری راہ میں کتنے کانٹے ہیں؟ ہر روز نئے چیلنج ہوں گے، ہر لمحہ نئے مرحلوں سے گزرنا ہوگا، خود غرضی چھوڑنا پڑے گی، محنت کرنا سیکھنا ہوگا، علم کی سرحدوں کو وسیع کرنا ہوگا۔ خبر میں اور نظر میں یکتا ہونے کے لیئے بڑی کاوش کرنا پڑے گی اور نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو ہونے کی عادت ڈالنی ہوگی۔ یہ ایک طویل سفر ہے اور وہ بھی تپتی دھوپ میں۔ اے میرے رب! میرے دست و بازو کو قوت اور عزم کو ثبات عطا کر۔

اہل دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہل نظر

بعض انسانوں کی زندگی سے جرأت اور قربانی کا نشان ملتا ہے اور بعض اہل نظر سے حکمت، اور خدمت کے معانی کا پتہ چلتا ہے پہلے گروہ کے لوگ شہید کہلاتے ہیں اور اس دوسرے گروہ میں جو لوگ شامل ہیں انہیں اہل احسان میں شمار کیا جاتا ہے

اہل شہادت اور اہل احسان میں فرق صرف اتنا ہے کہ شہید دوسروں کے لیے جان دیتا ہے اور محسن دوسروں کے لیے زندہ رہتا ہے۔ ایک کا صدقہ جان ہے تو دوسرے کا تحفہ زندگی۔ ایک سے ممکن وجود میں آتا ہے اور دوسرے سے اس وجود کو توانائی ملتی ہے ان کے علاوہ ایک تیسرا گروہ وہ بھی ہوتا ہے جو اس توانا وجود کو تابندگی بخشتا ہے۔ جو لوگ اس آخری گروہ میں شامل ہیں انہیں اہل جمال کہتے ہیں۔ اہل جمال کی پہچان یہ ہے کہ یہ لوگ مسجد قرطبہ کی تعمیر کرتے ہیں اور تحریر بھی۔ یہ الحکمؒ کی طرح بادشاہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اور اقبال کی طرح درویش بھی۔ انہیں تخلیق حسن پر مامور کیا جاتا ہے۔ نثر ہو کہ شعر، نقش ہو کہ نغمہ، رنگ ہو کہ خشت و سنگ یہ خون جگر سے اسے یوں تمام کرتے ہیں کہ جو نظر ان کی تخلیق پر پڑتی ہے وہ روشن ہو جاتی ہے۔ اگر ان کی تخلیق میں حسن صورت ہے تو خود ان کی ذات میں بھی ایک حسن ہوتا ہے۔ جسے حسن سیرت کہتے ہیں۔

حسن کی دولت اہل جمال کو اتنی وافر مقدار میں ملتی ہے کہ وہ اسے دوسروں میں تقسیم کرتے پھرتے ہیں۔ یہ تقسیم ان کی زندگی کے بعد بھی جاری رہتی ہے اور اس کی بدولت بدی اور بدنمائی کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملتا۔

زندگی کو ایک گروہ نے ممکن بنایا، دوسرے نے توانا اور تیسرے نے تابندہ، جہاں یہ تینوں گروہ ہوں وہاں زندگی موت کی دسترس سے محفوظ ہو جاتی ہے اور جس ملک یا عہد کو یہ گروہ میسر نہ آئیں اسے موت سے پہلے بھی کئی بار مرنا پڑتا ہے۔

جس معاشرے کو اہل شہادت میسر نہ آئیں وہ مٹ جاتی ہے۔ جس آبادی میں اہل احسان نہ ہوں اسے خانہ جنگی اور خانہ بربادی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس تمدن کو اہل جمال کی خدمات حاصل نہ ہوں وہ خوشنما اور دیرپا نہیں ہوتا۔

پاکستان کو اہل شہادت کی بھی ضرورت ہے اور اہل احسان و اہل جمال کی بھی۔

(آواز دوست سے ماخوذ)

گمنام مجاہدوں کو سلام

قائداعظمؒ کے دست راست اور تحریک پاکستان کے پرجوش کارکن نواب بہادر یار جنگ نے ایک بار کہا تھا:

"ہمیں ان لوگوں کی ضرورت ہے جو کھاد بن کر زمین میں جذب ہوتے ہیں اور جو مٹی اور پانی میں مل کر رنگین پھول اور میٹھے پھل پیدا کرتے ہیں۔ ہم بنیاد کے ان پتھروں کو چاہتے ہیں، جو ہمیشہ کے لیے زمین میں دفن ہو کر اور مٹی کے نیچے رہ کر اپنے اوپر عمارت کی مضبوطی کی ضمانت قبول کرتے ہیں۔"

میں ایسے گمنام مجاہدوں کو سلام کرتا ہوں۔ قومیں ایسے ہی خاموش مجاہدوں سے بنتی ہیں، ایسے خاموش مجاہد جو خوشی سے گمنامی کی زندگی اور گمنامی کی موت قبول کر لیتے ہیں۔ ایسے جاں نثار جو شہرت طلبی کے جال میں نہیں پھنستے ..... ایسے خدمت گزار جو اپنے نفس کے ناروا مطالبوں سے بلند ہوتے ہیں۔ قوم کے ان محسنوں کے نام سے دنیا واقف نہیں ہوتی ان کے نام تاریخ میں نہیں لکھے جاتے۔ طاقت کا نشہ انہیں نہیں ہوتا دھن دولت کی مستی کا مزہ وہ نہیں جانتے۔

ہمیں اس وقت ایسے گمنام مجاہدوں کی ضرورت سب سے زیادہ ہے۔

سخت جان بیج

برائی ہی نہیں پھیلتی، نیکی بھی پھیلتی ہے۔ کبھی کبھی روا روی میں کی ہوئی ایک معمولی سی نیکی بھی بہت بڑی نیکیوں کی بنیاد بن جاتی ہے۔ کبھی کبھی چلتے پھرتے بے خیالی میں کی ہوئی ایک میٹھی بات کسی کے دل میں اتر جاتی ہے اور بھلائے نہیں بھولتی۔ کبھی محبت

اور شفقت کی ایک نظر سے زندگی بدل جاتی ہے۔ ذرا سی ہمدردی سے ٹوٹے ہوئے دل جڑ جاتے ہیں اور دُکھی دلوں کو آرام آجاتا ہے۔ لہٰذا ایک چھوٹی سی نیکی کو، معمولی سی بھلائی کو، تھوڑی سی ہمدردی کو تھوڑا نہ سمجھو، اندھیرے میں ایک کرن اور پیاسے کے لیے ایک بوند بھی بہت ہوتی ہے۔

لیکن بھلائی کے کاموں میں بے صبری سے نہیں صبر سے چوکھا رنگ آتا ہے۔ انسان جو کچھ ہوتا ہے وہ ایک روز میں نہیں بنا ہوتا۔ اُس لیے ایک روز میں اس کا بدلنا بھی مشکل ہوتا ہے اسی وجہ سے اچھے کاموں کی ظاہری بے اثری سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ یہ ضروری نہیں کہ آج کا بُرا آدمی ہمیشہ بُرا رہے۔ انسان کی فطرت میں برائی نہیں۔ ہر انسان فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ نیکی کی طرف لوٹنا اس کی مٹی میں ہے۔ اس لیے ہر وہ شخص جو نیکی سے محبت کرتا ہے۔ کسی بُرے آدمی سے مایوس نہ ہوگا اور نہ اس سے نفرت کرے گا پتہ نہیں کب گم کردہ راہ دل، ایمان کی روشنی سے روشن ہو جائے۔ چونکہ نیکی وہ بیج ہے جو ذرا دیر سے پھوٹتا ہے اور نہ بھی پھوٹے تو بڑا سخت جان ہوتا ہے۔ مدتوں کیچڑ میں، ریت میں، بنجر زمین میں، پتھروں میں، سنگلاخ نہوں میں پڑا بارش کے دو قطروں کا انتظار کرتا رہتا ہے۔

انسان اچھا نہیں بنتا نہ بنے لیکن اچھائی کے احساس کو دل سے نوچ پھینکنے پر اسے قدرت حاصل نہیں۔ بھٹکے ہوئے دل میں بھی کھٹک برابر رہتی ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ بُرے سے بُرا آدمی بھی پہلے برائی کرنے کا کوئی جواز ڈھونڈتا ہے پھر برائی کرتا ہے۔ آخر کیوں؟ اس لیے کہ برائی کو برائی سمجھ کے کرنا انسان کے لیے ممکن ہی نہیں انسان سب چوٹیں سہہ لیتا ہے۔ لیکن ضمیر کی چوٹ اس سے نہیں سہی جاتی۔

دل میں کس نے جھانکا ہے۔ ضمیر کو کون دیکھ سکتا ہے، نہیں کیا خبر کہ اندر سے کوئی کیسا ہے۔ اُس لیے کیا یہ بہتر نہیں کہ تم ہر ایک سے پُر امید رہو۔ اس وقت بھی امید کے ٹمٹماتے دیئے سے آس لگاتے رہو جب دوسرے اندھیرے سے ہار کر دل چھوڑ بیٹھے

ٹمٹماتے

ہوں۔ تم بیج ڈالتے رہو، جس راہ سے، جس راستے سے گزرو، تم اپنے کام سے کام رکھو نتیجے کی فکر نہ کرو، وہ تمہاری ذمہ داری نہیں۔

زہر کا پیالہ

اچھے بُرے لوگ مر جاتے ہیں لیکن ان کے اچھے بُرے کام نہیں مرتے۔ دونوں کے اچھے بُرے اثرات باقی رہتے ہیں اور دیر تک باقی رہتے ہیں۔ جس طرح صدقہ جاریہ ہوتا ہے اسی طرح شر جاریہ بھی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں خاص طور سے ایسی برائیوں سے بچائے جن کے اثرات دیر تک باقی رہ سکتے ہیں۔

ایسا اچھا کام جو مثال بن جائے جس سے دوسروں کی راہیں روشن ہو جائیں، بہت بڑی سعادت ہے جو کسی کسی کے حصے میں آتی ہے۔ تاریخ میں ایک ایسا روشن نام سقراط کا ہے۔ یونان کے اس دانشور، اس فلسفی نے اپنی ساری زندگی سچائی کی تلاش اور سچائی کی ترویج میں گزار دی اور آخر میں سچائی ہی کے لیے زہر کا پیالہ پی لیا اور خوشی خوشی پی لیا۔ اس کو اس جرم میں، زہر کا پیالہ پینے کی سزا سنائی گئی تھی کہ وہ نوجوانوں کو دیوتاؤں سے برگشتہ کرتا ہے۔ اور تفکر و تدبّر کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ چاہتا تو جیل خانہ سے بھاگ بھی سکتا تھا۔ اس کے دوستوں اور عقیدت مندوں نے اس کے فرار کا منصوبہ تیار کر لیا تھا لیکن اس نے کہا، میں اپنی ریاست کے قانون کا احترام کرنا چاہتا ہوں سچائی کے لیے جان دینا سچائی کے لیے بھاگ جانے سے بہتر ہے۔

اب زہر کا پیالہ ایک علامت ہے۔ اُس تکلیف کی اس قربانی کی، اس ایثار کی جو سچائی کے لیے، بھلائی کے لیے، دیانت کے لیے، محبت کے لیے ہر بھلے اور اچھے آدمی کو دینی (سہنا) پڑتی ہے۔ ہر دور میں، ہر عہد میں، ہر جگہ کسی نہ کسی کو سقراط بننا پڑتا ہے اور زہر کا پیالہ پینا پڑتا ہے۔ یہ کام مشکل ہے اور بہت مشکل، لیکن جو زہر کا پیالہ

پی لیتا ہے وہ امر ہو جاتا ہے۔ جو شخص ہنسی خوشی ایک اچھے کام کے لیے مشقتیں اٹھا لیتا ہے۔ اذیتیں برداشت کر لیتا ہے، دکھ جھیل لیتا ہے وہ کندن بن جاتا ہے بلکہ پارس ہو جاتا ہے۔ ایسا کہ جو اس سے مس ہو جائے۔ وہ بھی سونا بن جائے۔

مولانا محمد علی جوہر کا شعر ہے؛

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ہر کربلا کے لفظ سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ کربلا بھی ایک علامت ہے کربلا سچائی کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کی علامت ہے۔ ہر انسان کی اپنی کربلا ہوتی ہے۔ اپنا زہر کا پیالہ ہوتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے جب اسے سچائی کے لیے، روشنی کے لیے ایک کٹھن اور پُر خطر راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جو شخص اس کربلا میں اُترنے۔ یہ زہر کا پیالہ پینے کا حوصلہ رکھتا ہے وہی نوجوان قبیلہ کی آنکھ کا تارا ہوتا ہے۔

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے

یہ مولانا محمد علی جوہر کے ایک شعر کا پہلا مصرعہ ہے۔ دوسرا مصرعہ بھی کم معروف نہیں۔

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اس شعر میں حسین اور قتل حسین یہ دونوں الفاظ علامت کے طور پر استعمال ہوئے ہیں جس طرح تلوار علامت ہے جنگ کی۔ قلم علامت ہے علم کی۔ شمع علامت ہے روشنی کی مینار علامت ہے مسجد کی اور مسجد علامت ہے اسلام کی اسی طرح حضرت امام حسینؓ علامت ہیں مزاحمت کی، ظلم سے ٹکر لینے کی، حق و صداقت سے ہر قیمت پر وفاداری کی ایک عظیم مقصد سے مکمل وابستگی کی اور قتل حسین علامت ہے اس بات کی کہ ایک مقصد کے لیے اپنی مرضی

سے حوصلے سے جان بھی دینی پڑتی ہے۔ اپنا سب کچھ لٹانا پڑتا ہے۔ مال و دولت دنیا اور رشتہ و پیوند سے اونچا بھی اٹھنا پڑتا ہے۔ قتل حسین اس بات کا اشارہ بھی ہے کہ حق و صداقت کی بظاہر ہار بھی ہوتی ہے اسے ظاہری مظلومی و بے بسی سے دو چار بھی ہونا پڑتا ہے ظلم و زیادتی سہنا بھی پڑتی ہے۔ بظاہر بے عزتی و رسوائی کا سامان بھی ہوتا ہے لیکن یہ سب ظاہری تماشا ہوتا ہے عارضی۔ اصل میں یزید مرتا ہے، ہار ظالم کی ہوتی ہے۔ جابر ہی آخر میں خوار ہوتا ہے۔ یہ زندگی کی بہت بڑی حقیقت ہے۔ یزید اور اس کے حواریوں کا عبرتناک انجام تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے ع

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

قتل حسین کے کچھ عرصے بعد ہی بنی امیہ کو بنو عباس نے کس طرح بیخ و بن سے اکھیڑا۔ وہ داستان کسے یاد نہیں۔ وہ انجام تو جان و مال کے اعتبار سے تھا۔ جو ذلت یزید کا مقدر ہوئی وہ بھی قابل غور ہے شاعر نے دوسرے مصرعہ

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

میں پہلے مصرعہ کے تصور کو آگے بڑھایا ہے اس مصرعہ میں ہر کربلا کا لفظ توجہ چاہتا ہے یہاں کربلا بھی علامت ہے آزمائش کی ابتلا کی۔ شدید ترین امتحان کی سخت ترین دیا ؤ کی تو مطلب یہ ہوا کہ کربلا سے ڈرنا نہیں چاہیئے۔ پیچھے نہیں ہٹنا چاہیئے۔ کربلا کی ظاہری بربادی ظاہری نقصان سے بددل یا مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ حضرت حسین کی طرح کی بڑی سے بڑی قربانی دینے سے ہچکچانا نہیں چاہیئے۔ حق و صداقت کی راہ میں بظاہر جو ہار ہوتی ہے وہی آخر کار جیت اور کامیابی کی نشانی بن جاتی ہے۔

آخر میں میں یہ عرض کروں گا کہ ہر آدمی کی اپنی کربلا ہوتی ہے۔ زندگی میں کبھی نہ کبھی اندر کے یا باہر کے کسی نہ کسی یزید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر آدمی کے سامنے کسی نہ کسی شکل میں وہ سوال، وہ مسئلہ سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جو یزید کی شکل میں حضرت امام حسین کے

سامنے تھا۔ حق و باطل کی آویزش بہت پرانی ہے۔ یہ آدم کی میراث ہے اور ہر یزید کا نام یزید نہیں ہوتا اور کبھی یزید اپنے اندر ہوتا ہے اور کبھی باہر۔ شر، ظلم، نفسانیت یزیدیت ہی کا دوسرا نام ہے۔

شہادت امام حسین کا پیغام یہی ہے کہ ہم اندر اور باہر کی یزیدی قوتوں سے ٹکرائیں ان کا مقابلہ کریں اگر سچائی اور بھلائی کے لیے قربانی بھی دینی پڑے تو ضرور دیں۔ قربانی زندگی کا اصل اصول ہے۔ اور یہ قربانی رنگ لاتی ہے۔ یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے ؎

غریب و سادہ رنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسماعیلؑ

اسرارِ پیدا

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی!
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد
ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے
وہ عالم مجبور ہے، تو عالم آزاد
موجوں کی تپش کیا ہے؟ فقط ذوقِ طلب ہے
پنہاں جو صدف میں ہے وہ دولت ہے خداداد
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُر دم ہے اگر تو، تو نہیں خطرۂ افتاد

اقبالؒ

باب دوم

روشن راہیں

(مذاکرے)

مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

میزبان مجلس اقبال کے زیرِ اہتمام آج کی گفتگو کا موضوع ہے ع

مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

موضوع کا تعارف کرانے کے لیے میں سلیم صاحب کو زحمت دوں گا۔

سلیم بانگ درا میں، جواب شکوہ کے بعد تین شعروں کا ایک قطعہ ہے۔ بعنوان ساقی زیرِ بحث موضوع اس کا دوسرا مصرعہ ہے ؎

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

یہ بڑا چونکا دینے والا شعر ہے اس کے الفاظ نئے نہیں۔ خیال نیا ہے لفظوں اور علامتوں کو نئے معنی دیئے گئے ہیں۔

نعیم یہ شعر کئی کتابوں پر بھاری ہے۔ کتنی بڑی بات کتنی سادگی سے کہہ دی گئی ہے شعر سنتے ہی ذہن میں تصورات و احساسات کی جو لہریں اٹھتی ہیں وہ پھیلتی ہی چلی جاتی ہیں ؎

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

تعلیم زور کس پر ہوا گرتوں کو تھامنے پر کتنا اچھوتا خیال ہے۔ قیادت، سیاست، باہمی تعلقات تعلیم و تعلّم غرض زندگی کے ہر شعبہ اور ہر منزل کے لیے ایک نئی اپروچ ایک نیا رویہ دیا گیا ہے۔

کمال اپروچ نئی نہیں۔ اس کا اظہار نیا ہے۔ یہ اپروچ مذہبیت اور انسانیت کی روح ہے۔ انبیاء پیغمبر اولیاء دنیا کے بڑے بڑے انسان کیا کرتے رہے

ہیں ؟ یہی گرتوں کو تھامنا۔ معاشرہ کے مظلوم و مجبور طبقے کو سنبھالنا، اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی۔

میزبان بڑی دلچسپ اور خیال انگیز باتیں ہو رہی ہیں لیکن چونکہ اس سلسلہ میں گفتگو کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ بحث طلباء اور تعلیم کے حوالے سے کی جائے اور مختصر بھی ہو۔ اس لیے میں اپنے سینئر ہاؤس ماسٹر جناب عرفان علوی صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ طلباء اور تعلیم کے حوالے سے اس شعر پر روشنی ڈالیں۔

عرفان علوی اس شعر میں تعلّم اور تادیب (ڈسپلن) دونوں عملوں Process کیلئے ایک بہتر اور موثر تر طریق کار کی تلقین کی گئی ہے۔ اساتذہ کے لیے اشارہ ہے کہ کلاس میں کمزور لڑکوں کو نظر انداز نہ کریں جو پیچھے ہیں انہیں پیچھے ہی نہ پڑا رہنے دیں۔ صرف ذہین لڑکوں کو ابھارا تو کیا ابھارا وہ تو خود ابھرتے ہیں بلکہ اپنے کارناموں سے استادوں کو ابھار دیتے ہیں ع

مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

استاد تو استاد بعض تعلیمی ادارے بھی اس Temptation کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کہ تھوڑے سے ذہین اسمارٹ Smart لڑکوں کو آگے بڑھاتے ہیں اور ان سے شو ونڈو Show Window کا کام لیتے ہیں اور اوسط درجے کے بیشتر طلباء ہم نصابی سرگرمیوں قیادتی ذمہ داریوں کے تجربے اور تربیت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ باہر بڑی چمک دمک ہوتی ہے لیکن اندر اندھیرا ہوتا ہے۔ اسی طرح ڈسپلن کا معاملہ ہے۔ ڈسپلن قائم کرنے کے روایتی جبر و تشدد کے طریقوں سے اور دہشت Terror کے ذریعے، خوف کی فضا قائم کر کے ڈسپلن قائم کرنا مشکل نہیں۔ لیکن جبر و خوف پر مبنی، ڈسپلن کے منفی اثرات نہ صرف طلبہ کی شخصیت و کردار پر مرتب ہوتے ہیں بلکہ آخرکار

بالواسطہ طور پر ان سے معاشرہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ میں ڈسپلن کے خلاف نہیں ہوں اس کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کے روایتی طریقوں کے خلاف ہوں۔ ڈسپلن ضبط و نظم تو تہذیبی ترقی اور تعلیمی عمل کی پہلی شرط ہے۔ اسی طرح وہ پریفکیٹس جو نیابتی ذمہ داریاں سنبھالتے ہیں انہیں بھی یہ نکتہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ چیخ پکار کرکے۔ مار دھاڑ کر کے پریفکیٹی کی تو کیا کی۔ کمال تو یہ ہے کہ جو لڑکے ٹیڑھے ہیں انہیں اپنے کردار سے اپنے رویئے سے سیدھا کیا جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہو گا جب سینئر صرف عمر میں عہدے ہی میں سینئر نہ ہو بلکہ اپنی شخصیت میں، اپنے کردار میں، اپنے احساس ذمہ داری، اپنی کارکردگی کے معیار میں بھی سینئر یعنی سپیرئر ہو تاکہ کسی جونیئر کو اس پہ انگلی اٹھانے کا موقع نہ مل سکے اگر کوئی سینئر واقعی ہر لحاظ سے سپیرئر ہے اگر وہ قابل قدر، قابل عزت اور قابل تقلید ہے مختصر یہ کہ اگر وہ انسپائر کر سکتا ہے تو پھر اس کے لیے کمانڈ کرنا کوئی مشکل نہ ہو گا۔ آخر میں اس شعر کے حوالے سے میں تمام طلبار سے ایک اور بات بھی کہنا چاہوں گا وہ بات یہ ہے کہ طلبار اپنی پسند کے مضمون کے علاوہ کسی اور مضمون کو توجہ سے نہیں پڑھتے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ان کا زندگی میں عام رویہ ہی مشکل اور بے مزہ چیزوں سے بچنے کا ہوتا ہے۔ انہیں ہر چیز بورنگ نظر آتی ہے۔ یہ رویہ صحیح نہیں۔

سپیرئیر

اپنی دلچسپی، شوق یا مزے کے کام کو سب ہی کرتے ہیں اور بھاگ کر کرتے ہیں۔

مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

یعنی اس مضمون کو بھی جو خواہ مشکل ہو یا غیر دلچسپ لیکن اگر وہ ضروری ہے تو اسے توجہ اور شوق سے پڑھا جائے۔ وہ کام جو از خود خواہ کتنا ہی ناخوشگوار ہو اگر وہ افادیت کا حامل ہے اور اگر اس کے دوررس نتائج خوشگوار ہوں گے تو وہ کام بھی پوری توجہ سے سرانجام دینا عقل و فراست کا تقاضا اور ذہنی پختگی کی علامت ہے۔

ساحل کی سوغات؟ خار وخس وخاک

میزبان : مجلس اقبال کے زیرِ اہتمام آج کے مذاکرہ کا عنوان ہے

ساحل کی سوغات ؟ خار وخس وخاک

سب سے پہلے میں نعیم کو اظہارِ خیال کی دعوت دیتا ہوں۔

نعیم : زیرِ بحث موضوع ضربِ کلیم کے جس شعر کا دوسرا مصرعہ ہے وہ شعر یوں ہے۔

دریا میں موتی۔ اے موجِ بیباک

ساحل کی سوغات خار وخس وخاک

شعر کے کتابی متن میں لفظ سوغات کے بعد سوالیہ نشان ہے اس لیے اس مصرعے کے پہلے ٹکڑے ساحل کی سوغات کو سوالیہ انداز میں پڑھا جانا چاہیئے۔ جیسے یہ پوچھا جا رہا ہو کہ ساحل کی سوغات کیا ہے؟ اس کا جواب مصرعے کے دوسرے ٹکڑے میں ہے سوغات تحفے کو کہتے ہیں۔ تو ساحل کا تحفہ خار وخس وخاک ہے جس کسی نے کسی بڑے دریا یا سمندر کے کنارے کو دیکھا ہے تو اس نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ ساحل پر کانٹے گھاس تنکے جیسی بیکار چیزیں موجیں لا لا کر پھینکتی رہتی ہیں۔ اسی بات کو اقبال نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا ہے کہ اے موج بیباک موتی تو سمندر کی تہہ میں ملتے ہیں۔ ساحل پر خس وخاشاک کے سوا کیا رکھا ہے۔

میزبان : یہ شعر کا نثری مطلب ہوا۔ اس کے شعری معنی کیا ہیں؟

نعیم : اس شعر میں بنیادی نکتہ وہی ہے جو فکرِ اقبال میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے یعنی اپنی خودی کو بروئے کار لانے کے لیے مشکل پسندی کا رویہ اختیار کیے بغیر اور ہر کام میں تن آسانی سے قصداً اجتناب کیے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ دریا کی پر آشوب موجوں سے ٹکرانا مشکل بلکہ پرخطر تو ہوتا ہے لیکن سمندر کی تہہ سے

موتی بھی اسی طرح نکالے جا سکتے ہیں۔ انسان اکو زندگی میں جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ جدو جہد کرنے خطرہ مول لینے اور حالات سے ٹکرانے اور ان کو بدلنے کی کاوش سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

میزبان وقار آپ کچھ کہنا پسند کریں گے ؟

وقار میں نعیم صاحب کی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہوں گا۔ کہ تن آسانی سے اجتناب اور سخت کوشی بلکہ خطر پسندی اقبال کے بنیادی تصوّرات میں سے ایک تصوّر ہے۔ جو سب سے پہلے ان کی معرکتہ الآراء فارسی نظم "اسرار خودی" میں بیان ہوا ہے۔ سخت کوشی اور نبرد آزمائی کے تصوّر کی بازگشت اقبال کے کلام میں بار بار سنائی دیتی ہے "پیام مشرق" کی ایک بڑی خوبصورت اور معنی خیز نظم کا عنوان یہ ہے "اگر خواہی حیات اندر خطرزی" یعنی اگر زندگی چاہتے ہو تو خطرہ میں جینا سیکھو یہ نظم ایک مکالمے کی شکل میں ہے پہلے بند میں ایک دل برداشتہ ہرن دوسرے ہرن سے اپنا درد دل یوں بیان کرتا ہے کہ میرا تو دل چاہتا ہے کہ حرم کے گوشے میں جا کر پناہ لے لوں۔ صحرا میں تو شکاری میری گھات میں لگے رہتے ہیں نہ مجھے صبح چین ہے نہ شام کو۔ مجھے تو صیاد کے فتنے سے امان کی تلاش ہے۔ دل چاہتا ہے کہ ہر وقت کے اندیشوں سے آزاد رہوں" یہ سن کر اس کے دوست نے کہا "اے یار خرد مند!

اگر خواہی حیات۔ اندر خطرزی

اگر زندگی چاہتے ہو تو خطرہ میں زندہ رہنا سیکھو۔ ہر لمحہ فساں (دھار تیز کرنے والے پتھر) پر اپنے آپ کو رگڑ تا رہ۔ اور اصیل تلوار سے زیادہ اپنے آپ کو تیز کر" اس نظم کے آخر میں اقبال نے خودی یا خطر پسندی کا فلسفہ بھی بیان کر دیا ہے کہ خطر پسندی کیوں ضروری ہے۔ فرماتے ہیں۔

"خطرہ تاب و تواں کا امتحان ہے۔ یہ جسم و جاں کے امکانات کی کسوٹی ہے یعنی خطرہ کا مقابلہ کرنے سے، رکاوٹوں سے ٹکرانے سے انسان کے جسمانی اور ذہنی امکانات بروئے کار آتے ہیں۔"

"پیام مشرق" ہی کی ایک رباعی میں اقبال نے ساحل اور دریا کے حوالے سے اس خیال کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

"ساحل پر بزم آرائی نہ کر وہاں نوائے زندگی نرم خیز ہے سمندر میں اتر اور موجوں سے ٹکرا کر اس آویزش ہی میں حیات جاوداں ہے۔"

خطر پسندی کا یہ رویہ مشرقی ادب میں بالکل نئی چیز ہے۔ مشرقی زبانوں میں صدیوں سے سکون اور شانتی کی تلاش اور تلقین کی جاتی رہی ہے۔ شیخ سعدی کا مشہور شعر ہے کہ سمندر میں فائدے تو بے شمار ہیں لیکن اگر سلامتی چاہتے ہو تو وہ ساحل ہی پہ ملے گی۔ سلامتی چاہنے اور خطرہ نہ مول لینے کا رویہ عام ہے۔ اقبال نے اس کو مسترد کیا اور خطر پسندی کے نظریے کو پیش کیا۔

میزبان آخر میں، میں اپنے محترم استاد جناب سید مسعود الحسن صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ طلبا کی زندگی کے حوالے سے موضوع زیر بحث پر روشنی ڈالیں۔

مسعود الحسن . دریا میں موتی اے موج بیباک
ساحل کی سوغات؛ خار و خس و خاک

اس شعر میں ساحل اور دریا کے الفاظ علامت اور استعارے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ساحل علامت ہے آسان کوشی کے رویے کی، سکون و جمود کی کو برقرار رکھنے کی روایت پرستی کی ~~ذوق جستجو کی کمی کی~~۔ دریا علامت ہے تگ و تاز کی، ذوق جستجو کی، جد و جہد کی، ذہنی جمود کو توڑنے کی، اجتہاد

اجتہاد

کرنے کی جرأت کی، نئے تجربے کرنے کی۔ نئی راہیں نکالنے کی، جرأت رندانہ کی، اقبال نے جو خطرہ کے اندر جینے کو کہا ہے۔ وہ دراصل چیلنج قبول کرنے جرأت سے آگے بڑھنے، نئی راہیں نکالنے، نئے تجربے کرنے، نئے خواب دیکھنے۔ نئے طریق کار وضع کرنے کا رویہ اختیار کرنے کی تلقین ہے۔ طلبار کو خاص طور پر تحقیق، تجسس، تجربے اور تفکر کا رویہ اپنانا چاہیئے تعلیم میں بھی اور زندگی میں بھی۔ اگر تعلیم تخلیقی Creative نہ ہو صرف Reproductive ہو تو بات نہیں بنتی۔ تعلیم میں بھی دنیا کے بہت سے معاملوں کی طرح

The way of least resistance is

also the way of least advantage.

ہوتا ہے آخر میں، میں تو یہ کہوں گا کہ نہ صرف طلبہ اور نوجوانوں بلکہ پوری قوم کے لیے یہ شعر

دریا میں موتی، اے موج بیباک

ساحل کی سوغات؟ خار و خس و خاک

روشنی کی ایک لکیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ کوئی سمجھے تو کلام اقبالؒ میں بہت کچھ ہے۔

فریب نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند — سفر اس کو منزل سے بڑھکر پسند

سفر زندگی کے لیے برگ و ساز — سفر ہے حقیقت، حضر ہے مجاز

یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے — خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات

(اقبالؒ)

جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

میزبان — حضرات آج کے مذاکرہ کا موضوع ہے

جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

سب سے پہلے میں رفیق صاحب کو اظہار خیال کی دعوت دیتا ہوں۔

رفیق — جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

یہ مصرعہ اقبال کی لافانی نظم خضر راہ سے ماخوذ ہے۔

شاعر کے سوال

زندگی کا راز کیا ہے؟

کے جواب میں خضر نے زندگی پر جو بھرپور اور پر مغز تبصرہ کیا ہے، اس نظم کے چوتھے شعر کا یہ دوسرا مصرعہ ہے۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم، رواں، ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

اقبالؒ کے فلسفۂ زندگی کو یہ نظم بڑی خوبصورتی سے بیان کرتی ہے اور اس نظم کی جان زیر بحث مصرعہ ہے۔

جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

میزبان اب میں رفیع صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ بحث کو آگے بڑھائیں۔

رفیع اس مصرعہ میں زندگی کا پورا لائحہ عمل موجود ہے۔ زندگی کی پہلی حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک سنگ گراں ہے، ایک چیلنج ہے، ایک امتحان ہے۔

قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحان ہے زندگی

زندگی کی دوسری حقیقت یہ ہے کہ اس سنگ گراں میں جوئے شیر بھی خوابیدہ ہے جوئے شیر استعارہ ہے۔ زندگی کے بے انتہا تخلیقی اور ارتقائی امکانات سے

آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے

اور تیشہ استعارہ ہے سخت کوشی اور جانفشانی کی زندگی سے۔ تیشہ ہی سے اس سنگ گراں کو چیر کر جوئے شیر نکالی جا سکتی ہے۔

میزبان آخر میں نعمان صاحب سے گزارش کروں گا کہ وہ طلبہ اور نوجوانوں کے حوالے سے موضوع زیر بحث پر کچھ روشنی ڈالیں۔

نعمان طلبہ کے لیے زندگی سے مراد تعلیمی زندگی ہے تعلیم ایک طویل اور صبر آزما عمل ہے۔ جو پوری توجہ اور مسلسل جدوجہد چاہتا ہے۔ سخت کوشی کے رویے کے بغیر تعلیمی ترقی ممکن نہیں لیکن جو یہ "کوہ کنی" کرلے جس کے تیشہ کی ضرب کاری ہو اس کا انعام، بھی بہت ہے جوئے شیر بھی اسی کو ملتی ہے۔

اُردو کے مشہور ادیب و مفکر رشید احمد صدیقی کا ایک بڑا خوبصورت اور فکر انگیز فقرہ ہے۔

زندگی آزمائش بھی ہے اور انعام بھی

یہ قول بھی اسی حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ

جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

میزبان حضرات آج کے مذاکرہ کا عنوان ہے

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

سب سے پہلے میں نعمان صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ بحث کا آغاز کریں۔

نعمان : زیر بحث موضوع بال جبریل کے شعر

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

کا دوسرا مصرعہ ہے

بہتر ہو گا کہ پہلے اس کے الفاظ پر غور کیا جائے۔

تلخ زندگانی سے مراد یہ ہے کہ زندگی ایک کڑوی، کسیلی، مشکل، صبر آزما چیز ہے اس کو سخت کوشی سے انگبیں یعنی انگور کے رس ایسا میٹھا یا خوشگوار بنایا جا سکتا ہے۔ اس پورے مصرعہ میں سخت کوشی کا لفظ بنیادی اہمیت رکھتا ہے سخت کوشی کو فکر اقبال میں ایک بنیادی تصوّر کی اہمیّت حاصل ہے۔

میزبان اس امر کی وضاحت کے لیے میں شفیق صاحب کو زحمت دوں گا۔

شفیق ۱۹۰۵ء میں علامہ اقبال یورپ گئے یہ کوئی تفریحی دورہ نہ تھا۔ مطالعاتی سفر تھا۔ یورپ میں دو تین سال کے قیام کے دوران انھوں نے فلسفہ اور قانون کی اعلیٰ ڈگریاں ہی حاصل نہیں کیں بلکہ یورپ کا تہذیبی و تمدنی مطالعہ بھی کیا۔ وہ زمانہ یورپ میں سامراجی قوتوں کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک یورپ کی سامراجی طاقتوں کے پنجہ استبداد میں گرفتار تھے

خصوصاً مسلمان ملکوں کی تو بُری حالت تھی۔ وہ سیاسی اور معاشی طور پر ہی نہیں نفسیاتی طور پر بھی مغلوب ہو چکے تھے۔ ان میں ایک طرح کا احساس کمتری اور احساس مجبوری پیدا ہو گیا تھا۔ اقبال نے ساری صورتحال کا اسلامی تعلیمات اور تاریخ کی روشنی میں مطالعہ کر کے اس کا حل خودی اور تصور سخت کوشی کی شکل میں پیش کیا۔

سلیم : فلسفہ خودی کیا ہے؟

شفیق : سادہ اور عام فہم زبان میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خودی اپنی خداداد صلاحیتوں کو پہچاننے، ابھارنے اور خود شناسی اور خود اعتمادی کے ذریعے سے اپنی شخصیت کو پروان چڑھانے کا نام خودی ہے اور سخت کوشی اس کا عملی پہلو ہے۔

نعیم : کیا سخت کوشی اور محنت وجفاکشی ایک ہی چیز ہے۔

شفیق : نہیں۔ سخت کوشی ایک نظریئے کی حیثیت سے محنت ومشقت سے آگے کی چیز ہے۔ مثلاً حالی نے مسدس حالی میں بھی مسلمانوں کو محنت اور مشقت کی تعلیم دی ہے۔

مشقت کی ذلت جنہوں نے اٹھائی
جہاں میں ملی ان کو آخر بڑائی

لیکن اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ افراد اور قوموں کو سخت کوشی اور جفاکشی کا راستہ اختیار کرنا چاہیئے اور ستاروں پر کمندیں ڈالنے کا حوصلہ پیدا کرنا چاہیئے اقبال کہتے ہیں۔

محروم رہا دولت دریا سے وہ غواص
کرتا نہیں جو صحبت ساحل سے کنارا

چنانچہ صحبتِ ساحل سے کنارا کرنے اور عمق دریا میں غواصی کرنے کا خطرہ مول لینے کو تیار رہنا چاہیئے۔ اسی لیے وہ جوانوں سے کہتے ہیں۔

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری

"ضرب کاری" کو اقبال ایک اصول زندگی کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ بغیر تگ و تاز کے ذوق کے، بغیر مہم جوئی کی اسپرٹ کے، نہ قومیں ابھرتی ہیں نہ افراد ابھرتے ہیں۔

میزبان آخر میں، میں شمیم صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اس مذاکرہ پر تبصرہ کریں۔

شمیم میں صرف یہ کہنا چاہوں گا کہ سخت کوشی کے فلسفہ پر اقبال نے اپنے فارسی کلام میں بھی بہت کچھ کہا ہے۔ سخت کوشی ان کا خاص موضوع ہے۔ خودی کی زندگی سخت کوشی کی زندگی ہوتی ہے۔

اقبال کا مصرعہ

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

ان کے فلسفہ عمل کا نچوڑ ہے۔ خطر پسندی ذوق تسخیر کی علامت ہے زیر بحث شعر

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

کے حوالے سے میں طلبہ سے یہ کہوں گا کہ وہ سخت کوشی کے رویئے کو اپنے کردار کی بنیاد بنائیں۔

میزبان جناب والا! طلبہ اپنی تعلیمی زندگی میں سخت کوشی کے رویئے کو کیسے اپنا سکتے ہیں؟

پرنسپل : اس شعر کے مخاطب نوجوان طلبہ ہی ہیں طلبہ سخت کوشی کا رویہ اپنے لائف اسٹائل یا طرز زندگی میں اپنا سکتے ہیں اس طرح کہ وہ اپنے آپ کو غیر ضروری آسائشوں کا عادی نہ بنائیں اپنی جسمانی اور ذہنی قوت برداشت کو بڑھائیں۔ ضروری جسمانی اور ذہنی مشقت سے نہ گھبرائیں۔ تعلیم میں شارٹ کٹ نہ ڈھونڈیں۔ نوٹس بنانا ہو تو خود بنائیں۔ ریفرنس بکس (حوالے کی کتابیں) خود دیکھیں۔ مشکل موضوعات پر مشکل کتابیں پڑھنے سے گریز نہ کریں۔ امتحان کی تیاری اتنی

مکمل کریں کہ پرچے کے مشکل سے مشکل سوالوں کا جواب آسانی سے دے سکیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ لکیر کے فقیر نہ بنیں۔ سوچنے اور سمجھنے، تفکر و تدبر کی عادت ڈالیں اور اپنی تخلیقی قوتوں کو بیدار کریں اور ان کو آگے بڑھائیں۔ یہی خودی کا راستہ ہے۔

معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

میزبان حضرات! آج کا موضوع اقبال کا یہ مصرعہ ہے۔

معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود

سب سے پہلے میں رضوی صاحب کو اظہارِ خیال کی دعوت دوں گا۔

رضوی زیرِ بحث مصرعہ اقبال شہرہ آفاق نظم مسجد قرطبہ سے لیا گیا ہے۔

پورا شعر یوں ہے۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

اس شعر سے پہلے یہ شعر آتا ہے۔

اے حرم قرطبہ۔ عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

ان دو شعروں کو ملا کر پڑھا جائے تو یہ مفہوم نکلتا ہے۔

بیدلی، بے توجہی سے کی ہوئی چیزیں دیر سویر مٹ جاتی ہیں۔ ختم ہو جاتی ہیں

اوّل و آخر فنا۔ باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو۔ منزل آخر فنا

لیکن تخلیقی کام جو ذوق و شوق سے، جذب و عشق سے کیا جائے، وہ درجہ کمال کو پہنچتا ہے اور لازوال ہوتا ہے۔

ہے مگر اس نقش میں رنگ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو، کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل، عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام

اپنے اس نظریئے کے ثبوت کے طور پر اقبال مسجد قرطبہ کو پیش کرتے ہیں اس کا جلال و جمال، اس ذوق و شوق، اس عشق کا مرہون منت ہے۔ جس سے اس کی تعمیر و تزئین کی گئی۔

سلیم : رضوی صاحب نے شعر کی بڑی عالمانہ تشریح کی ہے سبحان اللہ لیکن میں یہ جاننا چاہوں گا کہ ہم طلبہ کے لیے عملی طور پر اس میں کیا سبق ہے، یا کیا رہنمائی اور روشنی ہے؟

میزبان : اس اہم سوال کے جواب کے لیے میں رفیق ملک صاحب کو زحمت دوں گا۔

رفیق ملک : معجزہ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

اقبال کا یہ خیال کہ کوئی تخلیقی عمل، یا فنی کارنامہ جو اپنے جمال و کمال کی وجہ سے معجزہ سا نظر آئے اس میں یہ جمال و کمال خونِ جگر سے پیدا ہوتا ہے محض شاعری نہیں۔ یہ زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت کا شاعرانہ اظہار ہے۔ اس کا اطلاق صرف خشت و سنگ یا فن تعمیر کے نمونوں، یا موسیقی، ادب، شاعری جیسے فنونِ لطیفہ پر ہی نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کا اطلاق تمام زندگی پر ہوتا ہے۔

اسی پیڑ کی ڈالیاں پھلوں سے ڈولتی ہیں۔ اسی پودے میں بہت سے پھول آتے ہیں۔ جس پر باغباں کی، مالی کی ذاتی توجہ پیار کی نظر ہوتی ہے۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ جن پیڑوں اور پودوں سے باتیں کی جاتی ہیں وہ زیادہ پھلتے پھولتے ہیں۔ پالتو جانوروں کے بارے میں تو عام مشاہدہ ہے کہ وہ چارے سے زیادہ

توجہ کے بھوکے ہوتے ہیں۔ وہ محبت و نفرت، تعلق و لاتعلقی کی زبان کو خوب سمجھتے ہیں۔ بچے کو ہر چیز سے زیادہ پیار کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھول سے بچے ہر طرح کی آسائش کے ہونے ہوئے لاتعلقی کی ہوائے گرم سے کملا جاتے ہیں۔ طالب علم کو بھی استاد کے علم سے زیادہ اس کی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے مشہور ادیب اور فلسفی خلیل جبران نے کہا ہے کہ تم بچوں کو اپنا تخیل نہیں اپنی توجہ دو۔ تمام انسانی تعلقات میں سب سے اہم چیز توجہ کا تعلق ہے۔

جو والدین اپنے بچوں کو سونے میں تول دیتے ہیں۔ لیکن اپنی توجہ نہیں دیتے یا نہیں دے سکتے۔ ان کے بچے ان سے بیگانہ ہو جاتے ہیں اور پیار کی پیاس کی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اقبال نے جو یہ کہا ہے۔

معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود

بالکل صحیح ہے۔ صرف معجزہ فن ہی کی نہیں، ہر کمال کی نمود خون جگر سے ہوتی ہے کسی پرانے شاعر نے اسی بات کو یوں بیان کیا۔

مٹا دے اپنی ہستی کو گر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

اس شعر میں اقبال کے شعر کا سا فنی اور شعری حسن نہیں لیکن بات وہی ہے۔

میزبان : آخر میں، میں آج کی مجلس مذاکرہ کے مہمان خصوصی سے درخواست کروں گا کہ وہ اظہار خیال فرمائیں۔

مہمان : ماشاءاللہ، اس شعر پہ بڑی فکر انگیز اور معنی خیز بحث ہوئی ہے۔ میں اس میں طلبہ کے حوالے سے صرف یہ اضافہ کروں گا کہ ہمارے طلبہ میں آگے بڑھنے کی خواہش اور بلندیوں کو سر کرنے کی آرزو تو بہت ہے لیکن آگے بڑھنے کے لیے جس لگن اور بلندیوں کو سر کرنے کے لیے جس سخت کوشی کے رویے کی

ضرورت ہے اور لازمی ضرورت ہے اس سے وہ اکثر کتراتے اور دامن بچاتے نظر آتے ہیں۔ محبت اور محنت کا کوئی بدل نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی ملاوٹ ممکن ہے۔ ہم نے بچپن میں ایڈیسن کا ایک قول اپنے استادوں سے سنا تھا کہ جینئس دس میں سے نو حصے پرس پی ریشن PERSPIRATION ہے اور ایک حصہ INSPIRATION ہے۔ پس پچپن برس کی زندگی کے تجربے نے بعد مجھے اس قول کی صداقت پر اور پکا یقین ہو گیا ہے۔ پچاس

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغ زندگی

میزبان : مجلس اقبال کے اس مذاکرہ کا عنوان ہے

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغ زندگی

یعنی ہم طلبہ کے لیے خودی کا مفہوم کیا ہے۔ میں سب سے پہلے رفیع سے درخواست کروں گا کہ وہ بحث کا آغاز کریں۔

رفیع : جس طرح ایک بیج میں ایک پیڑ چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر فرد میں کچھ صلاحیتیں چھپی ہوئی یا سوئی ہوئی ہیں۔ ابتداء میں فرد کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ اس کے اندر ترقی کے کون سے امکانات خوابیدہ ہیں۔ شخصیت کی ان خوابیدہ یا چھپی ہوئی صلاحیتوں اور امکانات کو تلاش کرنا اور پھر ان کو ترقی دینا خودی ہے۔

جمال میں سمجھتا ہوں جس طرح ایک فرد کی خودی ہوتی ہے اسی طرح قوم کی بھی ایک خودی ہوتی ہے۔

رفیع اور ایک فرد کی خودی کی طرح ایک قوم کی خودی بھی ایک امتیازی شان رکھتی ہے اپنی ذات کے خوابیدہ امکانات کو تلاش کرنا اور ان کو ترقی دینا زندگی کا مقصد وحید ہے۔

اسلم : خودی، کی ترقی کا پیمانہ کیا ہے ؟

رفیع : اس کا جواب بھی عرض کرتا ہوں۔ دیکھئے جب ہم اسکول میں آئے تھے تو ہم وہ نہیں تھے۔ جو آج ہیں۔ اب ہمیں اپنے اوپر اعتماد زیادہ ہے اب ہمیں ذات کا شعور زیادہ ہے ہمیں اپنی صلاحیتوں کا احساس زیادہ ہے اب ہمارے اندر آگے بڑھنے، جدوجہد کرنے اور اپنی شخصیتوں کو ترقی دینے کا حوصلہ زیادہ ہے۔ اسی کا نام خودی کی بیداری ہے۔

اسلم لیکن ہم میں سے ہر لڑکے کی خودی کی بیداری کی رفتار یکساں کیوں نہیں؟ کہیں اس لیے تو نہیں کہ ہر ایک کی فطری صلاحیتوں میں کافی فرق ہے؟

رفیع نہیں، میرا تو خیال ہے کہ اتنا فرق ذہانت یا صلاحیت میں نہیں جتنا مختلف وجوہ سے خودی کو بیدار کرنے کی امنگ میں ہے۔

اسلم تو پھر یہ امنگ کیسے پیدا ہو؟

رفیع ہر قسم کی ترقی کا پہلا مرحلہ خودشعوری (Awareness) اور خوداعتمادی SELF-CONFIDENCE ہے۔ I CAN کہہ سکنا خودی کی بیداری کی طرف پہلا قدم ہے خودشعوری سے I WILL کہنے کا شعور پیدا ہوتا ہے اور خوداعتمادی سے I CAN کے عزم کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔ اقبال کا کمال یہی ہے کہ انہوں نے قومی سطح پر خوداعتمادی بحال کی اور خودشعوری بیدار کی بلکہ پیدا کی۔

احساس کمتری خودی کی نفی ہے۔ اس صدی کے شروع میں جب اقبال نے خودی کا نظریہ پیش کیا تو ہندی مسلمان شدید احساس کمتری کا شکار تھے۔ نہ انہیں اپنی قوتوں کا علم تھا اور نہ اپنی صلاحیتوں کا شعور۔ وہ بھی قومی سطح پر خودداری اور خوداعتمادی سے محروم تھے۔ اس لیے اقبال نے مسلمانوں کو

اپنے آپ کو پہچاننے اور اپنے امکانات کو بروئے کار لانے کا درس دیا۔

اسلم براہ کرم اقبال کے وہ شعر بھی پڑھیئے جو اس وقت آپ کے ذہن میں ہیں۔

رفیع میرا اشارہ ۱۹۱۲ء میں لکھی گئی نظم "شمع و شاعر" کے ایک بند کی طرف ہے۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو
آہ کس کی جستجو رکھتی ہے آوارہ تجھے
راہ تو رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہو گیا
مے بھی تو، ساقی بھی تو، مینا بھی تو، محفل بھی تو

اس میں واضح طور پر اپنے اوپر اعتماد اور اپنی صلاحیتوں کے سہارے آگے بڑھنے کی تلقین ہے۔ جو ۱۹۱۲ء کے دور کی غلامانہ ذہنیت کو کھلا چیلنج ہے۔

میزبان : مذاکرہ کا وقت ختم ہوتا ہے۔ آپ حضرات کا بے حد شکریہ۔

غوّاص محبت کا اللہ نگہبان ہو

میزبان : حضرات، آج کے مذاکرہ کا موضوع ہے

غواص محبت کا اللہ نگہبان ہو
ہر قطرہ دریا میں دریا کی ہے گہرائی

میں سب سے پہلے اپنے فاضل استاد ریاض صاحب سے درخواست کروں گا۔ کہ وہ تشریح سے مذاکرہ کا آغاز فرمائیں۔

ریاض : شعر کے دو طرح کے معنی ہوتے ہیں۔ ایک نثری معنی Prose meaning دوسرے شعری معنی یعنی Poetic meaning پہلے اس شعر کے نثری یا لفظی معنی تلاش کرتے ہیں۔ پہلا مصرعہ ہے ؎

نگہباں

غواص محبت کا اللہ نگہبان ہو

غواص غوطہ لگانے والے کو کہتے ہیں۔ غواص محبت کا مطلب ہوا وہ جو دریائے محبت میں غوطہ لگاتا ہے۔ مصرعہ کا دوسرا حصہ اللہ نگہبان ہو۔ دعائیہ ہے۔ جب کوئی خطرہ سے دو چار ہو رہا ہو یا دو چار ہو سکتا ہو۔ یا جب کوئی کسی پر خطر مہم پر جانے کے لیے تیار ہو رہا ہو تو اس کے پیارے اس کے ہم درد و غمگسار اور دوست اور وہ دانا بزرگ جو اس مہم کی پر خطر اور عزم آزما نوعیت سے آگاہ ہوں، واقف ہوں۔ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں تمہارا اللہ نگہبان ہو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

سلیم : آخر کیوں، غواص محبت کو آخر وہ کون سا خطرہ درپیش ہوتا ہے جس کے پیش نظر اقبال نے کہا ہے کہ :-

نگہباں

غواص محبت کا اللہ نگہبان ہو

ریاض : ماشاء اللہ تم نے بہت اچھا سوال پوچھا۔ اس کا جواب دوسرے مصرعے میں موجود ہے کہ ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی

غواص محبت کا اللہ نگہبان ہو۔ کیونکہ اس نے بہت گہرے پانی میں غواصی کرنے کا عزم کیا ہے۔ دریا فارسی میں سمندر کے معنی میں آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دریائے محبت کی تھاہ نہیں ہے۔ اس سمندر کا ہر قطرہ گہرائی میں اپنی جگہ سمندر ہے۔ یعنی کہ یہ دریا بہت ہی گہرا ہے۔ اتھاہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اتھاہ سمندر میں غواصی کرنا آسان کام نہ ہوگا۔ بہت

نعیم : تو پھر شعر کا اصل مطلب کیا ہوا؟

ریاض : میں اسی کی طرف آرہا ہوں۔ میں نے شروع میں کہا تھا ہر اچھے شعر کے دو معنی ہوتے ہیں ایک نثری دوسرے شعری۔ نثری مطلب تو یہ ہے دریائے محبت گہرا ہے۔ بہت گہرا ہے۔ اس لئے شاعر اس غواص کے عزم کو حوصلے اور عزم کو دیکھ کر جو دریائے محبت میں غواصی کے لیے پر تول رہا ہے۔ بے اختیار دعائیہ انداز میں پکار اٹھتا ہے۔

غواص محبت کا اللہ نگہباں ہو

سلیم : سر اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنا سوال دہراؤں آخر کیوں؟

ریاض : بتاتا ہوں۔ اس شعر میں یہ لفظ محبت بہت وسیع معنوں میں کسی بڑے عظیم مقصد سے عشق یا گہری لگن Commitment کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

تو پورے شعر کا شعری مطلب یہ ہوا کہ کسی بڑے اور عظیم مقصد کو لے کر اٹھنا اور اس کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ بہت جان جوکھوں کا کام ہے۔

نعیم تو اس پر ہاتھ ڈالنے سے فائدہ؟ اگر ہر قطرہ دریا میں دریا کی گہرائی ہے تو جان جوکھوں میں ڈالنے سے حاصل؟

ریاض : اس لئے کہ یہی تو شیوہ مردانگی ہے اس لئے کہ یہی کام تو کرنے کا ہے۔ جو یہ حوصلہ کرے گا وہی دریا کی تہہ سے موتی نکال کے لاسکے گا۔ جو کاوش ہی نہیں کرے گا وہ کیا خاک کامران ہوگا۔ شعر میں وارننگ بھی ہے۔ ہمت افزائی بھی ہے اور تعریفی دعا بھی۔

میزبان : اب میں اپنے محترم استاد صدیقی صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ فرمائیں۔

صدیقی : میں اس ضمن میں صرف ایک شعر سنانا چاہوں گا جو ریاض صاحب کی گفتگو سن کر

بے اختیار مجھے یاد آرہا ہے۔

میزبان ارشاد۔

صدیقی : یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

ریاض : بہت خوب۔ آپ نے بہت برمحل شعر پڑھا۔ بات یوں ہی ہے۔

میزبان اب میں اپنے دانشور پرنسپل صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اس امر پر روشنی ڈالیں کہ ہم طلبا کی زندگی پر زیر بحث شعر کا اطلاق کیسے ہو سکتا ہے۔

پرنسپل : یہ سوال بہت اہم ہے۔ اس لیے میں اس موضوع پر وضاحت سے کچھ کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔

غواص محبت کا اللہ نگہبان ہو
ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی

دیکھئے جو کام بھی محبت سے، شوق سے، عشق کے جذبے سے کیا جائے اس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ اس کے تقاضے بے انتہا ہوتے ہیں۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے طویل اور صبر آزما جدوجہد کرنی پڑتی ہے تب کہیں جاکر اس کا تھوڑا بہت حق ادا ہوتا ہے۔ یا اس میں تھوڑی بہت کامیابی حاصل ہوتی ہے محبت کی غواصی کی سب سے پہلی اور سب سے اچھی مثال ماں کی ہے۔ بچے کی پرورش ایک نرس یا آیا بھی کر سکتی ہے۔ لیکن جب ماں محبت سے بچے کی پرورش و پرداخت شروع کرتی ہے تو پھر اسے جن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے وہ ہر ماں جانتی ہے اسی طرح جو کام بھی محبت و شوق سے کیا جائے خواہ وہ کوئی فن ہو، سائنسی تحقیق و تدقیق یا تجربہ کاری یا کوئی تفریحی مشغلہ یا کوئی دینی یا قومی جذبہ غرض محبت کوئی بھی ہو وہ بہت لگن بے انتہا جدوجہد بے حساب ایثار اور عزم چاہتی ہے

تب کہیں جاکر بات بنتی ہے۔ مذہب، سیاست، سائنس، شعر و ادب فن کی دنیا کے جتنے بھی عظیم کارنامے ہوئے ہیں وہ آسانی سے، اتفاق سے حادثاتی طور پر ظہور پذیر نہیں ہوئے، ان کے پیچھے برسوں کی ریاضت، طویل جدوجہد، انتھک جفاکشی اور سخت کوشی تھی۔ یا اقبال کے الفاظ میں دریائے محبت میں غواصی کوئی آسان کام نہیں۔ چونکہ

ہر قطرہ دریا میں دریا کی ہے گہرائی

طلبا کے لیے اس شعر میں یہ اشارہ ہے کہ حصول علم کے لیے تعمیر کردار کے لیے اور عملی زندگی میں دیانت و جرأت سے اپنا کام کرنے کے لیے انہیں بہت سے کٹھن مرحلوں سے گزرنا ہوگا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردہ سے انسان نکلتے ہیں

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گِل بھی ہے

میزبان سامعین گرامی،

آج کے مذاکرہ کا موضوع یہ شعر ہے:

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے، پا بہ گل بھی ہے
انہیں پابندیوں میں حاصل، آزادی کو تو کر لے

مسئلہ یہ ہے کہ آزادی کا پابندیوں سے کیا رشتہ ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں پابندیوں سے آزادی کس طرح حاصل ہوتی ہے۔ اس تصور کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے یہ مذاکرہ منعقد کیا جا رہا ہے۔ میں سب سے پہلے حامد کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ شعر کی وضاحت سے بحث کا آغاز کریں۔

حامد : زیر بحث شعر جس کا پہلا مصرعہ ہے :

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے

یہ اقبال کی نظم "پھول" کا تیسرا شعر ہے۔ میں پہلے اس شعر کا لفظی مطلب بیان کرتا ہوں۔ صنوبر ایک قسم کا سرو ہے جو بلند قامت اور سیدھا ہوتا ہے۔ اس کی جڑیں گِل یعنی مٹی میں دور دور اور بہت گہرائی میں پھیلی ہوتی ہیں۔ باغ میں صنوبر کے بلند و بالا درخت کو دیکھ کر شاعر کہتا ہے۔ کہ صنوبر اس لیے بلند و بالا ہے کہ وہ پا بہ گل ہے۔ اس کے پاؤں یعنی اس کی جڑیں زمین میں جکڑی ہوئی ہیں۔ گویا۔ پا بہ گل ہونے نے اسے آزادی دی ہے

یہ تو شاعرانہ استدلال ہے۔ اصل میں اقبال کے صنوبر کی مثال سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آزادی بغیر پابندیوں کو قبول کیے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ پابندیاں ہی آزادی کی ضمانت ہوتی ہیں۔

میزبان اب میں محمود سے درخواست کروں گا کہ وہ اس امر کی وضاحت کریں کہ پابندیاں کس طرح آزادی کی ضمانت بنتی ہیں۔

محمود میں اس تعلق کی وضاحت کرنے کی کوشش کروں گا، جو آزادی اور پابندی میں ہے اصل میں پابندی سے اقبال کا اشارہ نظم و ضبط اور ترتیب و تنظیم کی طرف ہے نظم و ضبط اور ترتیب و تنظیم سے قوت میں اضافہ ہوتا ہے، کارکردگی بڑھتی ہے اور استحکام ملتا ہے جس فرد کی زندگی میں ضبط و نظم ہو، ترتیب و تنظیم ہو، وہ یقیناً کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔

میزبان کس طرح، براہِ کرم اس کی وضاحت کیجیے۔

محمود ضبط سے قوت ضائع نہیں ہوتی اور نظم سے قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اقبالؒ نے اپنے شعر میں جس پابندی کا ذکر کیا ہے وہ یہی ضبط و نظم ہے۔ ترتیب و تنظیم

یا ڈسپلن سے ایک فرد ہی نہیں سارا معاشرہ ترقی کرتا ہے۔

انسانی تہذیب و ترقی کی کہانی انسانی ذہن اور اس کی زندگی کی ترتیب و تنظیم کی کہانی ہے۔ انسان نے جتنا اپنے آپ کو منظم کیا اس کی قوتوں میں اتنا ہی اضافہ ہوا۔ مثالیں تو بے شمار ہیں، لیکن میں ایک بہت قریب کی مثال دیتا ہوں اسکول میں کون لڑکا زیادہ ترقی کرتا ہے۔ وہی جس کی زندگی میں نظم زیادہ ہے، ضبط زیادہ ہے، ترتیب و تنظیم زیادہ ہے جس کو منزل کا احساس زیادہ ہے۔ جس کو سمت کا شعور زیادہ ہے اس کے برعکس جو لڑکا اپنی قوتوں، اپنی صلاحیتوں کی تنظیم و ترتیب نہیں کر پاتا۔ جس کی زندگی میں نظم و ضبط کی کمی ہوتی ہے جو اپنے وقت اور اپنی توانائیوں کو ضائع کرتا ہے وہ پیچھے رہ جاتا ہے اور بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں۔

درماندہ کے لینے کو آتا نہیں کوئی

میزبان آخر میں میں نعمان صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ بحث کا جائزہ لیں۔

نعمان ماشاء اللہ مقررین نے بڑے اچھے نکتے پیدا کیے ہیں۔ میں صرف اس پر یہ اضافہ کروں گا کہ اسلام میں ضبط و نظم کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اسلامی عبادات اور شعائر اسلام مسلمانوں میں منجملہ اور چیزوں کے ضبط و نظم بھی پیدا کرتے ہیں۔

میزبان آپ سب حضرات کا شکریہ ہے۔

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے
انہیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

ہر قطرہ دریا میں دریا کی ہے گہرائی

میزبان معزز سامعین! آج ہم ایک ایسے موضوع پر مذاکرے کا اہتمام کر رہے ہیں جس

کی عملی اہمیت بہت زیادہ ہے لیکن جس پر غالباً اس سے پہلے کوئی مذاکرہ نہیں ہوا۔ وہ موضوع ہے۔

ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی

یعنی سچائی کا راستہ اختیار کرنے سے کون کون سی مشکلات پیش آسکتی ہیں اوران کا حل کیا ہے؟ میں سب سے پہلے انور کو اظہار خیال کی دعوت دیتا ہوں۔

انور — میں سمجھتا ہوں کہ آج کا موضوع بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ہمارے بزرگ یہ تو بتادیتے ہیں کہ سچ بولو، لیکن یہ نہیں بتاتے کہ سچ بولنے سے فوری طور پر کن کن مصیبتوں میں پڑنے کا امکان ہے، اوران سے کس طرح نمٹا جاسکتا ہے، ایمانداری دیانتداری کا درس بھی بہت ملتا ہے، ہمدردی اور احسان کرنے کی تلقین بھی کی جاتی ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا جاتا کہ صاف گوئی، جرأت اظہار اور دیانت داری سے عارضی ہی سہی۔ لیکن کون سے مسائل پیدا ہوسکتے ہیں اورکیوں اور مشکلات کے باوجود، ان رکاوٹوں کے باوجود، ان مسائل کے باوجود سچائی، دیانت احسان اور جرأت ہی اچھی قدریں ہیں۔ سچ سے بظاہر کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے، دیانت داری فوری طور پر خواہ کتنے ہی گھاٹے کا سودا نظر آئے۔ ہمدردی تعاون اور احسان کے رویے ایک آدھ بار کے تجربے سے خواہ کتنے ہی بے کار بلکہ تکلیف دہ ثابت ہوں، محنت، خدمت خواہ ضائع ہی ہوتی نظر آئے۔ اس کے باوجود کیوں محبت، دیانت اور خدمت کرتے رہنا ضروری ہے؟

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس مسئلہ پر عملی نقطہ نظر سے غور کرنا چاہیئے۔

میزبان — اب میں اکرم صاحب کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ بحث کو آگے بڑھائیں۔

اکرم — سچائی کا راستہ کوئی الہ دین کا چراغ نہیں ہے کہ ادھر رگڑا ادھر جن حاضر ہوا اور سارا کام پورا ہوگیا۔ محنت، دیانت، خدمت، دیر طلب اور دقت طلب

چیزیں ہیں۔ سچائی کا راستہ دشوار گزار راستہ ہے۔ اس راہ میں پتھر بھی آتے ہیں اور کانٹے بھی چبھتے ہیں اس لئے جو بھی نیکی کا، بھلائی کا، سچائی کا، خدمت کا، محنت کا، دیانت کا راستہ چنتا ہے اس کو راستہ کی مشقتوں کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔

غواص محبت کا اللہ نگہباں ہو
ہر قطرۂ دریا میں، دریا کی ہے گہرائی

ہر قطرہ میں دریا کی گہرائی کا مطلب یہ ہے کہ یہ کام عظیم تو ہے لیکن مشکل بھی بہت ہے۔ محنت، محبت، دیانت کے دریا کے ہر قطرہ میں دریا کی گہرائی ہے لیکن جس کو اس دریا کے موتیوں کی تلاش ہے۔ اس کو گہرائی میں اترنے سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ ماں بچہ کو جس مشکل سے پالتی ہے، وہ ایک ماں ہی جانتی ہے۔ بچہ کے پروان چڑھنے کی لازوال خوشی بھی پھر ماں ہی کو ہوتی ہے۔ اسی طرح خواہ سائنسدان ہو، قائد ہو، مصلح ہو، ہر ایک کو اپنی راہ کے کانٹے چننے پڑتے ہیں۔ کسی پرانے شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

میزبان اب میں سلمان سے کہوں گا وہ مثال دے کر ان چند کانٹوں کا تذکرہ کریں جو سچائی کی راہ میں آتے ہیں۔

سلمان شکریہ! میں عرض کرتا ہوں۔ پہلا کانٹا تو مخالفت بلکہ دشمنی کا ہے۔ جونہی آپ صحیح قدم اٹھاتے ہیں، وہ جن کے مفادات پر اس صحیح اقدام سے زد پڑتی ہے وہ ایک دم چوکنا ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ سچائی پر ثابت قدم رہنے پر اصرار کرتے ہیں تو وہ اپنے مفادات کو خطرے میں دیکھ کر آپ کی مخالفت بلکہ دشمنی پر آمادہ ہو جائیں گے اس مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیئے اس کی ایک

ٹھوس مثال اسکول کی زندگی سے دی جا سکتی ہے۔ جو لڑکا امتحان میں نقل کر رہا ہے وہ اس سے کیسے خوش ہوگا جو نہ خود نقل کرتا ہے اور نہ اسے کرنے دیتا ہے۔ اسی طرح اگر کلاس میں چار پانچ لڑکوں نے کوئی غلطی کی ہے مثال کے طور پر کوئی شیشہ توڑا ہے یا کوئی اور نقصان کیا ہے اور جھوٹ بول کر اپنے جرم کو چھپانا چاہتے ہیں وہ اس لڑکے کے پیچھے کیوں نہ پڑیں گے جو سچ بول کر ان کی غلطی کو بے نقاب کرتا ہے۔

میزبان : تو پھر اس کا حل کیا ہے؟

سلمان : حل یہی ہے کہ جو سچ بولتا ہے، اسے مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیئے اس میں اتنی جرأت ہونی چاہیئے کہ برائی کا مقابلہ کر سکے اور اس کا ایمان بھی پکا ہونا چاہیئے۔ اسے یہ یقین ہونا چاہیئے کہ دیر سویر جیت سچائی ہی کی ہوگی۔ عارضی طور پر، وقتی طور پر کوئی نقصان یا تکلیف بھی ہو تو اسے برداشت کرنے کے لیے اسے تیار رہنا چاہیئے۔

میزبان : میں اشفاق سے درخواست کروں گا کہ وہ ان چند مشکلات کا تذکرہ اور تجزیہ کریں، جو ایک محنتی، دیانتدار اور احسان شعار طالب علم کو پیش آتی ہیں یا پیش آ سکتی ہیں۔

اشفاق : مجھے اس ضمن میں ایک مفکر کا یہ قول یاد آ رہا ہے کہ بعض لوگ دوسروں کی عزت کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ایک ذہین اور محنتی طالب علم بھی اس صورتحال سے دوچار ہو سکتا ہے کہ اس کے کچھ ساتھی اس کی عزت کو اپنی توہین اور اس کی ترقی کو اپنی تذلیل سمجھیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک ہونہار طالب علم سے اس کے بعض نا اہل ساتھی حسد کرنے لگتے ہیں، اس کو پڑھنے نہیں دیتے۔ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور بعض اوقات اس کو عملی طور پر تنگ کرنے سے باز نہیں آتے۔ یہ عام مشاہدہ

ہے کہ جہاں کسی محنتی لڑکے نے اس وقت کتاب کھولی، جب دوسرے باہر کر کے وقت ضائع کر رہے ہوں اس پر طنزیہ فقروں کی بارش ہونے لگی ہے۔ لو بھئی اس کو تو بورڈ میں فرسٹ آنا ہے، اس کا فوٹو اخبار میں چھپے گا وغیرہ اگر کسی اچھے لڑکے کی کلاس میں استاد تعریف کر دے تو گھنٹی بجتے ہی اس لڑکے کی شامت آجاتی ہے۔ اس طرح کی باتوں کا ایک ہی علاج ہے کہ آدمی سمجھے کہ دوسرے ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ وہ دل برداشتہ نہ ہو اور خاموشی سے اپنا کام جاری رکھے اور اپنا عام رویہ تحمل، ہمدردی، خوش مزاجی اور صبر و ضبط کا رکھے بدمزاجی اور مایوسی دونوں سے بچنا چاہیئے۔

میزبان اب میں اشتیاق سے درخواست کروں گا کہ وہ بحث کو آگے بڑھائیں۔

اشتیاق اس ضمن میں ہمیں اسوۂ حسنہ سے بھی روشنی ملتی ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچائی کے لیے شروع شروع جن مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑا، وہ ہمارے لیے مشعلِ ہدایت ہے۔ پاکستان کے مورث اعلیٰ سرسید رح اور معمارِ پاکستان قائداعظم رح کو اپنے مشن میں جن جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ ان اکابر کی زندگی سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ ضبط و تحمل صبر و استقلال سے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قرآن حکیم میں وعدہ ہے۔ لیس للانسان الا ما سعیٰ ۔ انسان کو اس کی سعی و کاوش کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ محنت و محبت کے رویے کا کچھ اور فائدہ ہو یا نہ ہو، یہ ضرور ہے کہ محنتی دیانتدار اور ہمدرد انسان بہت چین سے سوتا ہے۔ اس کے دل میں کوئی کھٹکا نہیں ہوتا وہ خود اپنی نگاہوں میں نیچا کبھی نہیں ہوتا۔

فرشتے سے بڑھ کر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

میزبان : عقیل آپ کو کچھ کہنا ہے۔

عقیل : میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ بھلائی بھی ایک ذمہ داری ہے جو آدمی کوئی صحیح کام کرتا ہے یا سچائی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس کو بھی محتاط ہونا چاہیئے کہ وہ اترائے نہیں۔ اشارے، کنائے یا اپنے رویّے سے یہ ظاہر نہ کرے کہ وہ کوئی بڑی چیز ہے اور نیکی کر کے یا بھلائی کر کے وہ دنیا پر احسان کر رہا ہے۔ اس کو یہ بھی توقع نہیں کرنی چاہیئے چونکہ وہ سچا ہے، راست باز ہے، احسان شعار ہے۔ دنیا اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہے گی، سب لوگ اس کو اچھا سمجھیں گے، اس کی عزت کریں گے چونکہ بقول غالب ؎

ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

سب لوگ تو پیغمبروں کو بھی نہیں مانتے۔ ایک عام گنہگار آدمی کی کیا حیثیت ہے اس لیئے میں سمجھتا ہوں کہ سب سے اچھا رویہ یہی ہے کہ اچھا آدمی، بھلا لڑکا خدا پر اور اپنے کام پر اعتماد رکھے اور سر جھکا کر، خاموشی سے، صبر و شکر کے ساتھ اپنے کام سے کام رکھے۔

جس کا عمل ہے بے غرض، اس کی جزا کچھ اور ہے

آخر میں، میں یہ عرض کروں گا کہ اس مسئلہ پر خود قرآن حکیم میں واضح ہدایت موجود ہے۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

یعنی ایک دوسرے کو سچائی کی تلقین کرو اور صبر کی تلقین کرو۔

میزبان : میں اس شعر پر یہ مذاکرہ ختم کرتا ہوں۔

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے

لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا، اے عقاب

میزبان : سامعین گرامی!

گذشتہ مذاکرہ کا موضوع تھا کہ سچائی کے کانٹے یعنی سچائی کی راہ میں کون سی مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ آج کے مذاکرہ کا موضوع ہے کہ یہ مشکلات کیوں پیدا ہوتی ہیں؟ سب سے پہلے میں رفیق سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ بحث کا آغاز کریں اور یہ بتائیں کہ ایک اچھے طالب علم کو کچھ مشکلات کیوں پیش آتی ہیں۔

رفیق : میں عرض کرتا ہوں۔ پہلے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ مشکلات کس سمت سے پیش آتی ہیں۔ ظاہر ہے والدین اور اساتذہ تو اچھے اور ذہین طالب علموں کی حوصلہ افزائی ہی کرتے ہیں۔ اگر انہیں کچھ دقت کا سامنا کرنا ہوتا ہے تو اپنے چند ساتھیوں کی طرف سے۔ یہی حسد کرتے ہیں، تنگ کرتے ہیں اور طرح طرح سے زچ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میزبان بنیادی سوال تو یہی ہے کہ یہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔

رفیق احساسِ کمتری کی وجہ سے! وہ اتنی عقل تو رکھتے ہیں کہ انہیں صاف نظر آجاتا ہے کہ یہ محنتی لڑکا آگے نکلنے والا ہے لیکن اتنا حوصلہ، اپنے اوپر اتنا اعتماد نہیں رکھتے کہ وہ اس کے ساتھ کھلے میدان میں مقابلہ کریں اور اس سے آگے نکلنے کی کوشش کریں، وہ منفی رویّہ اختیار کرتے ہیں۔ بجائے خود آگے بڑھنے کے جو آگے بڑھ رہا ہے، اس کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ یہ منفی رویّہ احساسِ کمتری کی دلیل ہے۔ اصل میں ایسا کرنا اپنی نالائقی کا اعتراف ہے۔

میزبان : وہ تو ٹھیک ہے لیکن جس کی راہ میں پتھر ڈالے گئے ہیں وہ تو ان سے ٹکرا کر گرے گا یا کم از کم اس کی پیش رفت کی رفتار کم ہو جائے گی۔

رفیق وہ تو ہوگی، لیکن یہی تو زندگی ہے۔ زندگی میں رقابت تو چلتی ہے۔ سیدھا اور ہموار راستہ تو پیغمبروں کا بھی نہیں ہوتا۔ مخالفت تو ان کی بھی ہوئی ہے بلکہ مخاصمت اور دشمنی بھی۔ زندگی نام ہی کشمکش کا ہے۔

میزبان رفیع آپ کچھ کہنا پسند کریں گے۔

رفیع میں بھی رفیق صاحب کی دلیل کو آگے بڑھاؤں گا کہ تندیٔ باد مخالف سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ تندیٔ باد مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب

یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

مخالفت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے آدمی کو چوکنا ہونا پڑتا ہے۔ زیادہ احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ اقبالؒ نے اپنی مثنوی اسرارِ خودی میں حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ کے ذکر میں لکھا ہے کہ ان سے ان کے کسی مرید نے پوچھا کہ حضرت، مجھے میرے مخالفوں کے شر سے بچایئے تو آپ نے اسے تلقین کی کہ دشمنی سے نہ گھبرا، تیرا دشمن تجھے چوکنا رکھتا ہے۔ تجھے اپنے دفاع سے غافل نہیں ہونے دیتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ دشمنی کوئی اچھی چیز ہے۔ یہ کہنے کا مقصد یہ یاد دلانا ہے کہ شر بھی زندگی کی حقیقت ہے، اس سے نبرد آزما ہونا سیکھنا چاہیئے۔ جرأت کردار کا مطلب یہ بھی ہے کہ آدمی ہر قسم کے حالات میں دیا جلائے رکھے۔

اقبالؒ کا شعر ہے: تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں

تو کانٹوں سے الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

ایک اور اردو شاعر اصغر گونڈوی نے اس سے بھی آگے بڑھ کر کہا ہے۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے ؛ اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

تو مختصر یہ کہ کانٹوں میں الجھنا اور موجِ حوادث سے کھیلنا زندگی ہے۔

میزبان : رفیع صاحب کے اس خوب صورت تبصرہ پر ہی یہ مذاکرہ ختم ہوتا ہے۔ آپ سب حضرات کا بے حد شکریہ۔

کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

میزبان: حضرات، آج کے مذاکرہ کا موضوع ہے

کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

اس پر تحقیقی گفتگو کے لیے میں شاہد صاحب کو دعوت دیتا ہوں۔

شاہد: زیر بحث موضوع بال جبریل کی نظم "حال و مقام" کے آخری شعر کا دوسرا مصرعہ ہے۔ پورا شعر یوں ہے۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

اب میں سعید صاحب سے اظہار خیال کی درخواست کرتا ہوں۔

سعید:

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور

فکر اقبال کے ایک اہم نکتے کو ظاہر کرتا ہوں اور وہ یہ کہ انسان ماحول سے بلند ہوتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے۔ یکساں ماحول میں رہتے ہوئے بھی ایک انسان کا عمل دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔

میزبان: کیوں؟

سعید: اس لیے کہ وہ خود اندر سے مختلف ہے، اس کی سوچ، اس کا کردار مختلف ہے اس کی ترجیحات مختلف ہیں۔

اس شعر میں "کرگس" اور "شاہین" دو کردار، دو دائمی رویے ہیں۔ "شاہین" کا لفظ ایک علامت کے طور پر اقبال کے کلام میں بار بار آتا ہے۔

۱۲ دسمبر ۱۹۳۶ء کو لکھے ہوئے ظفر احمد صدیقی کے نام کے ایک خط میں خود اقبال نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ انہوں نے شاہین کو ایک مثالی مسلمان کی

علامت کے طور پر کیوں استعمال کیا۔

میزبان براہ کرم اقبال کے اپنے الفاظ کوٹ کیجئے۔

سعید عرض کرتا ہوں۔ اقبال نے اس خط میں لکھا:

"شاہین" کی تشبیہ محض شاعرانہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

۱۔ خوددار اور غیرت مند ہے کہ غیر کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔

۲۔ لاتعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔

۳۔ خلوت پسند ہے۔

۴۔ تیز نگاہ ہے۔

اقتباس ختم ہوا، اس سلسلہ میں، میں آپ کی توجہ اس امر کی طرف بھی مبذول کراؤں گا کہ "شاہین" ظاہری طور پر بھی شاندار اور پُر وقار Impressive ہوتا ہے کرگس کی خصوصیات اور صفات اس کے بالکل الٹ ہیں۔ ظاہری طور پر بھی اور باطنی طور پر بھی۔

میزبان اس شعر میں دو اور لفظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ فضا اور جہاں۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

فضا اور جہاں سے کیا مراد ہے۔

سعید فضا سے مراد ماحول اور جہاں سے مراد رویہ کردار یا شخصیت ہے۔

میزبان پھر شعر کا اصل مفہوم کیا ہوا۔

سعید یہ کہ ایک سی فضا میں، ایک سے ماحول، ایک سے حالات میں بھی اس شخص کا عمل Behaviour جس کا کردار شاہین کا سا ہے۔ اس فرد کے عمل Behaviour

سے بالکل مختلف ہوگا جس کا کردار کرگس کا سا ہے۔

شعر کا نکتہ یہ ہے کہ اصل چیز فضا، ماحول، حالات نہیں انسان کا کردار اس کی خودی، اس کی شخصیت ہے۔ انسان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ اپنے ماحول کے دباؤ Compulsions اور Pressures سے بلند بھی ہو سکتا ہے اور جو ہو جاتا ہے وہی جواں قبیلے کی آنکھ کا تارا بنتا ہے۔

میزبان بہت خوب، سعید صاحب! آپ نے بڑی گہرائی میں جا کر بڑی خوبصورتی سے اس شعر کی تشریح اور تفسیر کی۔

اب میں اپنے استاد سلمان صاحب سے گزارش کروں گا کہ وہ اسکول کی زندگی کے حوالے سے کرگس اور شاہین کے کردار کے فرق کو واضح کریں۔

سلمان میں تین واقعات سے یہ فرق واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

کئی برس ہوئے یہاں میٹرک کا امتحان ہو رہا تھا نگرانی بہت ڈھیلی تھی۔ بلکہ نگراں صاحب خود "کرگس" تھے یعنی بعض لڑکوں سے پیسے کھا گئے تھے چنانچہ جن سے پیسے لیے تھے ان کی خوب مدد کر رہے تھے (جس کا کھانا، اس کا گانا، مشہور مثل ہے)

وہ نگراں صاحب آدمی چالاک تھے۔ اپنے "آقاؤں" کے ساتھ ادھر ادھر بھی تھوڑا بہت بتا رہے تھے تاکہ بات بنی رہے اور کوئی شکایت نہ کر دے جب ان صاحب نے دیکھا کہ ایک لڑکا نہ ان سے نہ کسی اور سے کچھ مدد لینے کی کوشش کرتا ہے تو وہ ایک سوال کا جواب لے کر اس کے پاس آئے (اس کا نام امجد تھا۔ آج ماشاءاللہ ڈاکٹر ہے۔ کے، ای، سے ایم بی بی ایس کر کے لاہور میں پریکٹس کرتا ہے) اور پوچھا "تمہیں کچھ نہیں پوچھنا۔ یہاں تو سب ہی لگے ہوئے ہیں مجھے تو تمہارا یہ سوال غلط نظر آتا ہے" امجد نے بڑے وقار سے جواب دیا "سر، توجہ کا شکریہ امتحان نام

ہی اس کا ہے کچھ صحیح ہوتا ہے کچھ غلط۔ جو مجھے آتا ہے وہی میرے لیے کافی ہے۔
دوسری مثال ایک اور طرح کی کرگسی اور شاہینی کی ہے۔ یہ واقعہ ہوسٹل کا ہے
عام طور پر مالدار سے مالدار والدین صرف اپنے بچوں کو پوچھتے ہیں اور کھانے پینے
کی جو چیز بھی لاتے ہیں۔ بیٹے چھپا کر رکھنا۔ کوئی کھا نہ لے۔ بہر حال میں جن صاحب
کی بات کر رہا ہوں وہ کوہاٹ کے تھے۔ جب وہ اپنے بیٹے امیر رحمان کے لیے
مونگ پھلیوں کا ایک تھیلا لائے تو ایک پوری ہوسٹل کے باقی ساٹھ لڑکوں کے
لیے بھی لائے۔ گویا یہ بھی ایک طرح کے شاہین تھے لیکن ہوسٹل میں ایک اور لڑکا
رحم شیر ان سے بھی بڑا شاہین تھا (ماشاءاللہ آج کپتان ہے) اس نے گلا خراب
ہونے کا بہانہ کر کے اپنے حصے کی مونگ پھلیاں نہیں لیں۔ جب میں نے اس
سے پوچھا کیوں بھئی رحم شیر اپنے حصے کی مونگ پھلی لینے میں کیا تکلف تھا۔ تو کہا
سر آپ کو معلوم ہے میں بنوں سے بھی آگے قبائلی علاقے کا ہوں میرے والدین مجھ
سے ملنے نہیں آسکتے اور اگر آئیں بھی تو میرے لیے اتنا سامان نہیں لا سکتے۔ جب
میں دوستوں کو کھلا نہیں سکتا تو دوستوں کا کھا کر اپنے غریب والدین کی توہین نہیں
کرنا چاہتا (اس کے مقابلے میں ان کرگسوں کو دیکھیے جو دوسروں کا مال اڑانے
کی تاک میں لگے رہتے ہیں اور اپنی چیزیں تالوں میں چھپا کر رکھتے ہیں)
آخر میں تعلیم میں کرگسی اور شاہینی کی ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک لڑکا فاروق تھا
(اب انجینئرنگ کر رہا ہے) وہ اپنے جوابات خود لکھتا تھا (یہ نہیں کہ کسی دوسرے
کی کاپی یا ٹیسٹ پیپر سے جواب نقل کیا اور سرخ رو ہو گئے) اور لائبریری جا کر
حوالے خود تلاش کرتا تھا۔ اس کی ریفرنس اسٹڈی کی کاپی دیکھنے کے قابل تھی۔ یہ
طالب علم شاہین تھا۔ روشنی کی تلاش میں ہر دم، ہر وقت سرگرم، اس کو معلومات
اور علم کا فرق معلوم تھا وہ اپنی تخلیقی قوتوں کو پوری یکسوئی اور لگن سے پروان

چڑھا رہا تھا۔ حالانکہ اس کی "فضا" وہی تھی جس میں دوسرے "کرگس" پرواز کر رہے تھے لیکن "جہاں" اور تھا۔

شکریہ، سلمان صاحب! اسکول کی زندگی کے حوالے سے آپ نے "شاہینیت" اور "کرگسیت" کی جو فکر انگیز تشریح کی ہے اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔

تیری خاک میں شرار زندگی نہیں ہے

میزبان اقبالیات کے سلسلے میں آج کے مذاکرہ کا عنوان ہے۔

"تیری خاک میں شرار زندگی نہیں ہے۔"

اس موضوع پر توضیحی گفتگو کے لیے میں سب سے پہلے اشعر صاحب کو دعوت دیتا ہوں۔

مذاکرہ کا عنوان اقبال کے ایک فارسی شعر

اگر امروز تو تصویر دوش است　　بخاک تو شرار زندگی نیست

کے دوسرے مصرعے کا لفظی ترجمہ ہے۔ پورے شعر کا مطلب کچھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اگر تمہارا آج (حال) تمہارے گزرے ہوئے کل (ماضی) کی تصویر ہے اور تم آج بھی بعینہٖ وہ ہو جو کل تھے یعنی تم بہتر طور پہ بدلے نہیں ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تمہاری خاک میں شرار زندگی نہیں ہے۔ یعنی تم صحیح معنوں میں زندہ نہیں ہو۔

کیا اس شعر میں ماضی سے رشتہ توڑنے کی تلقین کی گئی ہے؟

نہیں۔ اقبال نے ماضی سے رشتہ توڑنے کو کبھی نہیں کہا۔ انسان کی جڑیں اس کے ماضی میں ہوتی ہیں۔ کلچر نام ہی روایتوں Traditions کے تسلسل کا ہے اقبال نے اس تسلسل کو برقرار رکھنے پر بھی بڑا زور دیا ہے۔

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

انہی کا شعر ہے۔ لیکن اقبال ماضی کو زنجیر نہیں بنانا چاہتے۔ صرف پس منظر

با حوالہ رکھنا چاہیئے ہیں جس کی روشنی میں آگے بڑھا جا سکے۔ اس لیے وہ بااصرار کہتے ہیں ؎

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

میزبان کمال۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

کمال میں اشعر سے اتفاق کرتے ہوئے کہوں گا کہ فکرِ اقبال کا بنیادی نکتہ یہی ہے کہ ضمیرِ لالہ میں چراغِ آرزو روشن ہو، اور چمن کا ذرہ ذرہ شہیدِ جستجو ہو۔ اقبال کی نظم "چاند اور تارے" کا موضوع بھی یہی ہے۔

اس راہ میں مقام بے محل ہے پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

اور "خضرِ راہ" میں زندگی کے عنوان سے یہ فکر انگیز شعر ملتے ہیں۔

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ جاوداں پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

میزبان آخر میں، مجلسِ اقبال کے صدر، اپنے محترم اور فاضل استاد پروفیسر عرفان علوی صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اس موضوع پر اظہارِ خیال فرمائیں۔

عرفان زیرِ بحث موضوع اقبال کے جس فارسی شعر سے ماخوذ ہے وہ اقبال کے فارسی مجموعہ کلام "پیامِ مشرق" کے شروع میں آتا ہے۔ اور ایک قطعہ کا دوسرا شعر ہے۔ دو شعروں کا وہ قطعہ یوں ہے۔

دما دم نقشہائے تازہ ریزد بیک صورت قرار زندگی نیست
اگر امروز تو تصویر دوش است بخاکِ تو شرار زندگی نیست

یعنی یہ لمحہ بہ لمحہ نئی نئی صورتیں اختیار کرتی رہتی ہے۔ زندگی کو کسی ایک صورت

میں فراز ہیں ہے۔ چنانچہ اگر تمہارا آج تمہارے کل کی تصویر ہے تو تمہاری خاک میں شرار زندگی نہیں ہے۔

اس سے پہلے کہ میں اس آخری شعر کے مضمرات پر گفتگو کروں۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس شعر کے پس منظر پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔

یہ شعر یوں تو "پیام مشرق" کا ہے جو ۱۹۲۳ء میں چھپی تھی۔ لیکن اس میں جو فلسفۂ خودی ہے وہ "اسرار خودی" کی بازگشت ہے۔ اقبال کی یہ شہرۂ آفاق فارسی نظم ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اور یہی وہ کتاب ہے جس میں اقبال کے بنیادی تصورات وضاحت سے بیان ہوئے ہیں۔ اس لیے اس کے تاریخی پس منظر کو جاننا ضروری ہے۔

مسلمانوں کے سیاسی زوال پر مہر تو ۱۴۹۲ء میں سقوط غرناطہ کے المیہ کے موقع پر لگی لیکن تہذیبی زوال اس سے کئی صدی پہلے شروع ہو چکا تھا اور مسلمان مفکروں اور مدبروں نے اس کے اسباب پر غور و فکر کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلہ میں پہلا نمایاں نام ابن خلدون کا ہے (جس کی تاریخ کا "مقدمہ" علم تاریخ کی تاریخ میں ایک اونچا مقام رکھتا ہے) اس کے بعد جن مفکروں نے اس مسئلہ کا تجزیہ کیا ان میں سترھویں صدی میں مجدد الف ثانی اٹھارویں صدی میں شاہ ولی اللہ اور انیسویں صدی میں جمال الدین افغانی اور مصر کے محمد عبدہ، سر فہرست ہیں۔ موجودہ صدی کے شروع میں اقبال نے اس مسئلہ پر گہرائی میں جا کر غور کیا۔ اقبال کو ایک اور بھی غیر معمولی ADVANTAGE حاصل تھا۔ انہیں قدیم و جدید مشرقی و مغربی فلسفہ پر پورا عبور حاصل تھا۔ اور چند سال یورپ میں رہ کر انھوں نے خود جدید تہذیب کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ وہ اس کی خامیوں سے بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے نیشنلزم (علاقائی قوم پرستی کے مغربی تصور پر) اور اس کی اخلاقی اقدار پر سخت لب و لہجہ میں تنقید کی ہے۔

تمہاری تہذیب، اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہو گا

واضح رہے کہ علامہ نے یہ شعر ۱۹۰۷ء میں لکھا تھا۔ جب وہ جرمنی میں فلسفہ میں پی ایچ ڈی کے لیے اپنا تحقیقی مقالہ لکھ رہے تھے لیکن اقبال کی تحقیق کا اصل منشا تو یہ معلوم کرنا تھا کہ اسلامی ملت کو کس طرح زندہ و تابندہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ گہرے تفکر و تدبر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اقوام مشرق خاص طور پر مسلمانوں کی خودی کو بیدار اور مستحکم کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کہ مسلمانوں کو فکری آزادی کی بھی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ اسلامی اصولوں، قدروں اور روایتوں کو جدید سیاسی، سماجی اور معاشی اداروں کی شکل میں تشکیل دے سکیں۔ اس امر کے لیے اجتہاد کی ضرورت تھی تاکہ تہذیبی ترقی کا سفر جاری رہے۔ اس لیے اقبال نے زور دے کر کہا کہ اجتہاد کرتے ہوئے آگے بڑھو اور بڑھتے جاؤ۔ خوب سے خوب تر کی جستجو میں۔ ہر دم جواں پیہم دواں، زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے۔

اگر امروز تو تصویر دوش است، بخاک تو شرار زندگی نیست

کا مطلب یہی ہے کہ اگر تمہارا آج بالکل ویسا ہی ہے جیسا کل تھا یعنی اس میں کوئی جوہری تبدیلی نہیں آئی تو گویا تمہاری خاک میں شرار زندگی نہیں ہے۔ یعنی تم مر چکے ہو۔ اس شعر میں دو لفظ امروز (آج) اور دوش (گزرا ہوا کل) بھی توجہ طلب ہیں یعنی جو تبدیلی ہوتی ہے وہ دن بدن لمحہ بہ لمحہ ہوتی ہے۔

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

میزبان سر، آپ نے اس شعر کے پس منظر پر اور اس کے مضمرات پر بڑی عالمانہ گفتگو کی اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔ اب آخر میں، میں آپ سے یہ گذارش کروں گا کہ آپ اس امر پہ بھی روشنی ڈالیں کہ اقبال کے اس شعر کا اطلاق ہم طلبہ کی زندگی پر کس طرح ہو سکتا ہے؟

۱۸/۱۸

عرفان : اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ طلبہ کے نام اقبال کا پیغام کیا ہے تو میں بے ساختہ "پیام مشرق" کے یہی اشعار پڑھوں گا۔

دمادم نقشہائے تازہ ریزد — بیک صورت قرار زندگی نیست
اگر امروز تو تصویر دوش است — بخاک تو شرار زندگی نیست

طلبہ کی زندگی کا تو سب سے واضح مقصد ہی روشنی کی تلاش، خوب سے خوب تر کی جستجو اپنی شخصیت کے ارتقار کے لیے مسلسل کاوش ہوتا ہے اس شعر میں تصور ارتقار چھپا ہوا ہے طلبہ کو بتایا گیا ہے کہ ترقی ایک تدریجی عمل Process ہے۔ اگر ایک طالب علم ہر روز شعوری طور پر ذہنی، اخلاقی، جسمانی ارتقار کے لیے جد و جہد کرے تو اس کا مستقبل یقیناً تابناک ہوگا۔ طلبہ کو خاص طور پر سمجھ لینا چاہیئے کہ تعلیم و تربیت بھی ایک مسلسل عمل ہے۔ یہ ایک دو ہفتے یا دو چار ماہ کی بات نہیں کہ امتحان آیا تو پڑھ لیا۔ کچھ رٹ لیا۔ باقی وقت خواب خرگوش کے مزے لیے۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ زندگی میں امتحان نہ کبھی شروع ہوتا ہے اور نہ کبھی ختم ہوتا ہے۔ یہ مسلسل جاری رہتا ہے۔ اس لیے کتابی امتحان کی تیاری بھی مسلسل جاری رہنی چاہیئے۔ تاکہ تعلیمی اعتبار سے بھی ہر آج ہر کل سے بہتر ہو۔

اپنی گفتگو ختم کرنے سے پہلے، بس ایک اور نکتے کی وضاحت کرنا چاہوں گا "آج" کے "کل" سے بہتر ہونے کا انحصار Quantitative تبدیلی پر نہیں۔ Qualitative تبدیلی پر ہوتا ہے۔ اس لیے طلبار کو معلوم ہونا چاہیئے کہ Qualitative Change صرف نصابی کتابوں کے خلاصے رٹ لینے سے نہیں آئے گی۔ معلومات، اور علم میں فرق ہے۔ طلبار کو صرف معلومات ہی میں اضافہ کرنے پر اکتفار نہیں کرنا چاہیئے بلکہ علم میں اضافہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور علم میں اضافہ کسی مضمون کے

بنیادی تصورات کو سمجھے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے اصل علم حاصل کرنے کے لیے سوچنا اور سمجھنا لازمی ہے۔ اس کے لیے ہر مضمون کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے تعلیم ایک تخلیقی Creative عمل ہے Reproductive کارروائی نہیں۔ جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے۔ تعلیم کا آخری امتحان یہ ہے کہ وہ کس حد تک متعلم کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارتی ہے اس لیے اقبال نے طلباء کو مشورہ دیا تھا کہ علم حاصل کرو اور علم پیدا بھی کرو۔

آخر میں، میں یہ بھی کہوں گا "آج" کو "کل" سے بہتر بنانے کے لیے طلباء کو اپنے کردار پر نظر رکھنی ہوگی۔ اپنے لائف اسٹائل کو بھی طالب علمانہ بنانا پڑے گا۔ اور اپنی ترجیحات کو بھی تعلیم کے نقطۂ نظر سے مرتب کرنا ہوگا۔

مختصر یہ کہ "آج" کو "کل" سے بہتر بنانے کا عمل روشنی کی تلاش کا سفر ہے جس کے کئی پہلو Dimensions ہیں۔

تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول

سُلطان ٹیپو کی وصیت

تو رہ نورد شوق ہے؟ منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو، تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب، بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدہ کائنات میں
محفل گداز، گرمی محفل نہ کر قبول

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول (اقبالؒ)

اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

میزبان : مطالعہ اقبال کے سلسلے میں آج کے مذاکرہ کا عنوان ہے۔

اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

اس موضوع پر توضیحی گفتگو کے لیے میں رفیع صاحب کو زحمت دوں گا۔

رفیع : پورے مذاکرہ کا عنوان اقبال کی طویل نظم "طلوع اسلام" کے ایک شعر کا دوسرا مصرع ہے۔ پورا شعر یوں ہے۔

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

ہر بڑے شاعر کا ایک وژن VISION ہوتا ہے۔ معاشرہ کا ایک تصور معاشرتی قدروں اور رویوں کا ایک پیٹرن PATTERN کہ دنیا ایسی ہونی چاہیے۔ اقبال پوری اسلامی ملت بلکہ ساری دنیا کے لیے جس قسم کا معاشرہ چاہتے تھے اس کی ایک قدر، ایک رویے کی نشاندہی اس شعر میں کی گئی ہے ؎

اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

میزبان : کیا اس شعر کے پس منظر پر آپ کچھ کہنا پسند کریں گے؟

رفیع : عرض کرتا ہوں۔ مثالی دنیا کا یہ وژن VISION محض ایک خیالی تصور نہ تھا۔ اقبال نے "طلوع اسلام" کا یہ شعر ۱۹۲۳ء کے انقلاب ترکی کے پس منظر میں لکھا۔ اس وقت عالم اسلام کی سیاسی صورت حال یہ تھی کہ انڈونیشیا سے مراکش تک کوئی اسلامی ملک بشمول ایران، افغانستان اور مصر پورے طور پر سامراجی طاقتوں کے بالواسطہ یا بلاواسطہ تسلط سے آزاد نہ تھا۔ اور نہ کسی مسلمان ملک میں اتنی طاقت تھی کہ وہ عالم اسلام کے لیے کچھ کر سکے۔ ایسے میں ترکی نے پہلی جنگ عظیم میں

کے باوجود جس ڈرامائی انداز میں ۲۲-۱۹۲۱ء میں سنبھالا لیا اور ایک یورپی طاقت یونان (جس کو دوسری اتحادی طاقتوں کی ہمدردیاں اور اعانتیں حاصل تھیں) کو شکست دے کر جس طرح ایک جاندار اور پرعزم قوم کے طور پر اپنے آپ کو ابھارا اس سے اقبال بہت متاثر ہوئے ترکی کی نشاۃ ثانیہ میں انہیں ملت اسلامی کی نشاۃ ثانیہ کے آثار یا امکانات نظر آئے۔ اس تاریخی اور جذباتی پس منظر میں انہوں نے ۲۳-۱۹۲۲ء میں خضر راہ اور طلوع اسلام، دو نظمیں لکھیں، یہ نظمیں امید اور امنگ سے چھلکی پڑتی ہیں۔ ان نظموں کا پرجوش آہنگ اور رجزیہ انداز فوری طور پر متاثر کرتا ہے۔ "طلوع اسلام" نظم کا عنوان ہی غمازی کرتا ہے۔ کہ اقبال ترکی کی نئی زندگی کو اسلام کی نئی زندگی کی نوید سمجھتے تھے۔ چنانچہ استقلال ترکی کے حوالے سے انہوں نے ترکوں کو اور تمام عالم اسلام کو یاد دلایا کہ نئے دور میں، ایک نئے معاشرے کی تشکیل میں ان کو کن اصولوں، قدروں اور رویوں کو ملحوظ رکھنا ہے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

صداقت، عدالت اور شجاعت، اقبال کا تصور قیادت (لیڈر شپ) ان الفاظ میں پوشیدہ ہے۔ یہ تو حکومت یا جہانبانی کے رموز ہوئے لیکن معاشرتی تعلقات کی بنیاد کیا ہو؟ مسلمانوں کے تعلقات آپس میں، کیسے ہوں۔ اس کا جواب وہ شعر ہے جو آج کے مذاکرے کا موضوع ہے۔

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی   اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

اقبال قوم پرستی کے اس شر سے بے خبر نہ تھے جو اس وقت ملکوں میں سر اٹھا رہا تھا۔

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

آگے چل کر اسی نظم میں کہتے ہیں۔

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل، اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودہ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم، اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

میزبان بے حد شکریہ آپ نے اس شعر کے پس منظر پر بڑی فکر انگیز بحث کی۔ اب آخر میں میں مجلس اقبال کے صدر اپنے فاضل استاد ماجد صدیقی صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اس نکتے پر روشنی ڈالیں کہ آج کے موضوع "اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی" کے ہماری سماجی زندگی کے لیے کیا مضمرات ہیں۔

ماجد صدیقی جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ اسلام کا بنیادی تصور توحید ہے اسی سے اسلام کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی معیارات نکلتے ہیں۔ سیاست میں جمہوریت، معیشت میں مساوات۔ اور معاشرت میں اخوت کا رویہ عقیدہ توحید کے برگ و بار ہیں۔ اقبال نے قومیت پرستی کے جس نظریہ پر انتہائی شدت سے تنقید کی اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ علاقائی نیشنلزم لاالہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کی نفی ہے۔

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

اب میں اس سوال کا جواب دوں گا کہ

اخوت کی جہانگیری اور محبت کی فراوانی

کا اطلاق طلبا کی روزانہ کی زندگی میں کیسے ہو سکتا ہے۔ طلبہ کلاس میں ہوں یا ہوسٹل میں ایک دوسرے سے ان کا ہر وقت واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ ہر قدم پہ ایک، دوسرے کا تعاون درکار ہوتا ہے۔ پبلک اسکولوں میں جہاں طلبا رہائشوں میں اپنے والدین

اعزار و اقربا سے دور رہتے ہیں ان کی سوشل لائف کا انحصار سراسر اسکول فیلوز یا کلاس فیلوز پر ہوتا ہے۔ وہاں بہترین سماجی رویّہ عدل سے بھی آگے تحمل، فراخدلی اور فیاضی کا ہوتا ہے۔ اس نکتہ کو اقبال نے اخوت کی جہانگیری اور محبت کی فراوانی سے تعبیر کیا ہے۔ زور کس پہ ہوا۔ اخوت کی جہانگیری پر محبت کی فراوانی پر۔

میزبان کیا یہ رویّہ اختیار کرنا مشکل نہیں ہے؟

صدیقی مشکل تو ہے۔ کچے پن Immaturity کی عمر میں تنگ نظری خود غرضی اور حرص غیر متوقع نہیں۔ صرف کم عمر طلبا ہی میں نہیں ہر عمر کے سماجی گروپ میں ایک تعداد تنگ نظر و تنگ دل، حاسد، حریص، خود غرض لوگوں کی بھی ہوتی ہے اس سے انکار نہیں لیکن یہاں تو اقبال ایک معیاری یا آئیڈیل سماجی رویے کی بات کر رہے ہیں جو صحیح اور صائب ہے اس پہ انہوں نے دو دلیلیں دی ہیں۔

میزبان کون سی؟

صدیقی جن کا تذکرہ پہلے مصرعے میں ہے۔

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی

اقبال فلسفی تھے نا، فلسفی گہرائی میں جا کر بات کرتا ہے اور جو کہتا ہے۔ اس کی منطقی دلیل بھی دیتا ہے۔

اقبال نے اخوت کی جہانگیری اور محبت کی فراوانی کی ضرورت پر جو دلیل دی ہے وہ قابل غور ہے۔ یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی

یعنی یہ فطرت کا منشا بھی ہے اور اسلام کا تقاضا بھی۔

میزبان وہ کس طرح؟

صدیقی تمدنی اور تہذیبی زندگی کے ارتقار کا بنیادی اصول تعاون ہے بغیر تعاون و اشتراک

کے سماجی ترقی ممکن نہیں بلکہ جتنا تعاون واشتراک زیادہ ہوتا ہے ترقی وتعمیر کی رفتار اتنی زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ مقصودِ فطرت اور رمزِ مسلمانی بھی اخوت کی جہانگیری اور محبت کی فراوانی ہے۔ اس مسئلہ کو عملی طور پر بھی دیکھئے۔ اگر ہم دوسروں کے مفادات کو ملحوظ رکھیں ہم ان کے لئے وہ نہ چاہیں جو ہم اپنے لئے نہیں چاہتے تو لازماً دوسرے بھی ہمارے مفادات اور ضروریات کا لحاظ رکھیں گے۔ اس طرح باہمی اعتماد و مروّت کی ایک فضا تیار ہو جائے گی، جس میں سب سکھ کا سانس لیں گے نہ صرف یہ بلکہ سکون و مروّت کی اس فضا میں انفرادی و اجتماعی ترقی کی رفتار بھی تیز تر ہو گی۔ تو اخوت کی جہانگیری نہ صرف رمزِ مسلمانی اور مقصودِ فطرت ہے بلکہ عقل اور وسیع تر مفاد کا تقاضا بھی۔

اخوت کی جہانگیری اور محبت کی فراوانی کے رتبے سے انسان کسی Tension کا شکار نہیں ہوتا۔ اسے ہر جھاڑی کے پیچھے ایک دشمن نظر آتا ہے۔ بڑا اعتماد کرتا ہے جو محبت کرتا ہے، جس کے دل میں ہمدردی موجیں مارتی ہے۔ وہ خزاں کے پتے کی طرح نہیں شاہ بلوط کے پیڑ کی طرح ہوتا ہے جو آندھیوں اور طوفانوں میں سر اٹھائے وقار سے کھڑا رہتا ہے۔ محبت میں، احسان میں، ایثار میں بڑی روشنی ہی نہیں، بڑی توانائی بھی ہوتی ہے۔ کوئی محبت کو فراواں کر کے تو دیکھے۔ کوئی اخوت کی جہانگیری کا چراغ جلا کر تو دیکھے۔

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید، تیرا جمالِ بے نقاب

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سرِ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر

جس راہ سے گذرو پھول کھلاتے جاؤ

میزبان آج کے مذاکرہ کا عنوان ہے۔

جس راہ سے گذرو پھول کھلاتے جاؤ

میں سب سے پہلے سلیم صاحب کو اظہار خیال کی دعوت دوں گا۔

سلیم میں آپ حضرات کی توجہ موضوع زیر بحث کے شروع کے الفاظ جس راہ سے گزرو کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ یعنی پھول کھلانا ہیں لیکن صرف اپنے آنگن، اپنی گلی اپنی راہ گزر پر نہیں۔ جس راہ سے گزرو کا مطلب یہی ہے کہ پھول کھلانے، بھلائی کرنے کا ایک عام رویہ ایک General attitude ہونا چاہیئے۔

میزبان نعیم، کچھ آپ کہنا پسند کریں گے؟

نعیم میرا تو خیال ہے کہ پھول کھلانے کے الفاظ بھی توجہ چاہتے ہیں۔ عدل احسان اور ایثار یہ تین بنیادی اخلاقی قدریں ہیں۔ عدل یعنی انصاف کرنا ایک فرض کی حیثیت

رکھتا ہے۔ وہ تو کرنا ہی کرنا ہے۔ اس کے بغیر کوئی پائیدار اور مستحکم تمدنی اور تہذیبی زندگی ممکن ہی نہیں۔ پھول کھلانا احسان اور ایثار کے زمرہ میں آتا ہے۔

"آواز دوست" میں مختار مسعود نے لکھا ہے۔

"اہل شہادت اور اہل احسان میں فرق صرف اتنا ہے کہ شہید دوسروں کے لئے جان دیتا ہے اور محسن دوسروں کے لئے زندہ رہتا ہے۔ ایک کا صدقہ جان ہے اور دوسرے کا تحفہ زندگی۔ ایک سے ممکن وجود میں آتا ہے اور دوسرے سے اس وجود کو توانائی ملتی ہے۔"

خاقان مجھے کچھ عرض کرنے کی اجازت ہے۔

میزبان ضرور، جی فرمائیے!

خاقان سوال یہ ہے کہ آپ کو پھول کھلانے کون دے گا۔ ایک ایسے معاشرہ میں جہاں لوگ سرشاخ پھول کیا پتے بھی نہیں چھوڑتے۔ وہاں پھول کھلانے کی تلقین وہ بھی سرراہ گزر، کیا غیر حقیقت پسندانہ نہیں؟ میرے خیال میں تو موجودہ حالات میں پھول کھلانا تو بڑی بات ہے انصاف اور دیانتداری سے زندہ رہنا بھی ممکن نہیں رہا۔

اشرف جی ہاں بنجر زمین میں پھول کھلانے سے کیا حاصل؟ یہ تو پھولوں کو بھی ضائع کرنے کے مترادف ہے۔

نعیم میں آپ لوگوں سے اختلاف کی اجازت چاہوں گا۔ یہ صورت حال کی ضرورت سے زیادہ مایوس کن تصویر ہے۔ حالات اتنے بھی برے نہیں اور اگر ہیں بھی تو ہم آنکھیں بند کر کے نہیں بیٹھ سکتے۔ جب دریا سے زمین کا کٹاؤ ہو رہا ہو۔ جب بستی طوفان کی زد میں ہو۔ تو اس کے تحفظ کے لئے تگ و دو کرنا زندگی کی پہلی ترجیح بن جاتا ہے پھول کھلانا تو اس سے بہت آگے کی بات ہے یہ زندگی کو مروت و محبت سے تر و خوب تر بنانے کے مترادف ہے۔ ہاں یہ میں ضرور کہوں گا کہ پھول کھلانا مشکل ضرور ہے اس کے لیے فضا سازگار نظر نہیں آتی۔ لیکن اگر کوئی کام ضروری ہو تو یہ نہیں

دیکھا جاتا کہ یہ مشکل ہے یا نہیں۔ ماحول ساز گار ہے یا نہیں دوسرے یہ کہ پھول کھلانا صرف ایک اختیاری کارِ خیر ہی نہیں اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک اشد سماجی اور نفسیاتی ضرورت بھی ہے۔ جن بستیوں کی راہوں میں پھول نہیں کھلتے وہ بے رونق ہی نہیں ہوتیں بلکہ بہت جلد ویرانی سے ہمکنار بھی ہو جاتی ہیں۔ راہ گزروں پر پھول کھلانا اصل میں اپنی سماجی اور قومی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہے اور بغیر قومی عصبیت کے کوئی قوم زندہ نہیں رہتی تابندہ ہونا تو بعد کی بات ہے پھول نہ کھلانا تنگ دلی اور تنگ نظری کی غمازی کرتا ہے۔ اگر نتائج کے اعتبار سے دیکھا جائے تو خود غرضی خود اپنی جڑیں کاٹنے کے مترادف ہے۔

آخر میں، میں اپنے ہیڈ ماسٹر صاحب قبلہ سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے ارشادات سے ہمیں مستفید فرمائیں۔

پھول کھلانے کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے۔ پھول وہی کھلاتا ہے جس کے دل میں روشنی ہو، خوشبو ہو، جو غنی ہو، جو خود خوش ہو، وہی دوسروں کو خوش کرتا ہے۔ جس کی اپنی جھولی میں کچھ ہو وہی کسی کو کچھ دیتا ہے۔ یہ وہ خوش بختی ہے جو کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے لوگوں کو چھوٹی چھوٹی خوشیاں دینا، ہر کس و ناکس کے دکھ سکھ میں خواہ تھوڑی دیر ہی کے لیے سہی، شریک ہونا، کسی گرتے ہوئے کا ہاتھ تھامنا کسی اجنبی کے آنسو پونچھنا پھول کھلانے کے زمرے میں آتا ہے۔

ہمارے سامنے تو آپ کی مثال رہتی ہے۔ خود آپ کے سامنے کس کی مثال تھی؟ آپ نے پھول کھلانا کب، کہاں اور کس سے سیکھا؟

ہیڈ ماسٹر: یہ بالکل صحیح ہے کہ آدمی جتنا مثال سے سیکھتا ہے۔ کسی اور طریقے سے نہیں سیکھتا میں اپنے پھول کھلانے کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتا لیکن میں نے زندگی میں، جو پھول سب سے پہلے کھلتے دیکھے۔ ان کی خوشبو آج بھی میرے دل میں تازہ ہے۔ وہ

واقعات سناتا ہوں یہ پہلا واقعہ میرے بچپن کا ہے جہلم میں ہمارے گھر کے قریب کمپنی باغ تھا۔ اس میں میرے والد صاحب خدا انہیں غریق رحمت کرے ہر روز صبح سویرے فجر کی نماز کے بعد سیر کے لیے جایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتے ایک روز میں ان کی انگلی پکڑے باغ میں گھوم رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ چاندنی کے ایک پودے کے قریب ایک ماں بلی لیٹی ہوئی ہے (ایک ماں کے لیے اس سے بڑھ کر سکون کا لمحہ کوئی اور نہیں ہوتا جب اس کا بچہ اس کے پاس ہو) اور اس کا چھوٹا سا بچہ اس سے کھیل رہا ہے۔ مجھے وہ بڑا اچھا لگا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اسے دوڑ کر پکڑلوں۔ ٹھیک اسی لمحے اباجی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے پیچھے کھینچا اور ادھر سے لوٹ پڑے۔ اور پھر لمبا سا چکر کاٹ کر کچہری کی طرف کے دروازے سے باہر آئے۔ راستے میں انہوں نے صرف یہ کہا کہ جو چین سے ہوا سے بے چین نہیں کیا کرتے۔" عزیزو! سرراہ گزر پھول کھلانے کی یہ وہ پہلی مثال ہے جو میرے دل میں اتر گئی ہے وہ جو اکثر میں تم لوگوں سے کہا کرتا ہوں کہ جو چین سے ہے اسے بے چین نہ کرو۔ اور جو بے چین ہے کوشش کرو کہ اس کی بے چینی ختم ہو جائے۔ یا کم از کم کم ہو جائے لیکن خدا کے لیے کسی کی بے چینی کو، تکلیف کو، بڑھاؤ مت۔ یہ جملہ اسی تجربے کی بازگشت ہے اور سنو، جب میں ایف اے میں تھا تو میری والدہ کا انتقال ہوا۔ اس سانحہ کے بعد والد کے معمول میں یہ تبدیلی آئی کہ وہ بجائے کمپنی یا کمیٹی کے باغ میں سیر کو جانے کے صبح سویرے قبرستان امی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جانے لگے۔ ہمارے گھر کے آنگن میں موتیا کے چار پانچ پودے اور دو چنبیلی کی بیلیں تھیں۔ یہ کبھی والدہ نے لگائی تھیں۔ وہی ان کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد یہ کام والد نے اپنے ذمے لے لیا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ ان پودوں کو پانی دے کر اکثر ان کے پاس

کھڑے رہتے تھے جیسے ان سے باتیں کر رہے ہوں۔

عزیزو! کسی کے دکھ کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے خواہ وہ باپ ہی کیوں نہ ہو اور یہ ضروری نہیں کہ ہر دکھی آنسو ہی بہلائے جب انسان کھل کر دکھ کا اظہار بھی نہ کر سکے تو وہ دکھ بہت بھاری ہوتا ہے۔ میرے عزیزو! کبھی کبھی اپنے والدین کے دلوں میں بھی جھانک لیا کرو! ہاں تو میں۔ میں گھر کے صحن میں موتیا اور چنبیلی کے پھولوں کی بات کر رہا تھا جن کو والد، والدہ کے انتقال کے بعد چاؤ سے پانی دیا کرتے تھے۔ جمعرات کی صبح کبھی کبھی وہ مجھے بھی اپنے ساتھ قبر پر لے جاتے تھے۔ ایک روز انہوں نے چنبیلی کے پھول چنے، کچھ موتیا کے پھول لیے اور قبرستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ اتفاق کی بات کہ ابھی ہم قبرستان کے اندر داخل ہوئے ہی تھے اور والدہ کی قبر کی طرف کی پگڈنڈی کی طرف مڑ رہے تھے کہ سامنے سے ایک صاحب آتے ہوئے نظر آئے ان کے ساتھ ایک پانچ چھ برس کا بچہ بھی تھا۔ والد نے یکایک اپنے ہاتھ کے پھول ان کی طرف بڑھا دیئے اور خالی ہاتھ آگے بڑھ گئے۔ میں چونکہ ان کے ایک قدم پیچھے تھا۔ میں نے ان صاحب کو اپنے بچے سے کہتے سنا "لے یہ پھول بے جی کی قبر پر ڈال آ" فاتحہ سے واپسی پر جب انہوں نے میری آنکھوں میں سوال دیکھا تو بولے "سعید! اب یہ پھول کبھی نہ کمہلائیں گے اور ان کی خوشبو تمہاری امی کو پہنچتی رہیگی۔ وہ کیسے" بے خیالی میں میرے منہ سے نکل گیا۔ وہ اس طرح بیٹے! میں نے محسوس کیا کہ ان کی آواز میں ارتعاش تھا۔ اور جب میں نے ان کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں میں نمی پائی) "برائی ہی نہیں نیکی بھی پھیلتی ہے روشنی کی کرنیں بھی تاریکی کو چیرتی ہوئی بہت دور دور تک جا پہنچتی ہیں۔ یہ شخص میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ میرے اس طرح پھول دے دینے سے یقیناً اسے خوشگوار تعجب ہوا ہوگا۔ احسان کوئی کرے دل میں اتر جاتا ہے لیکن جب کوئی اجنبی بغیر

کسی غرض یا تعلق کے آپ پر از خود کرم کرے تو دل میں چراغ جل جاتا ہے۔ تم سوچو وہ شخص کبھی اس چھوٹے سے واقعہ کو فراموش کر سکے گا؟ اور جو روشنی اس کے دل میں پیدا ہوئی ہوگی وہ کہاں کہاں نہیں پہنچے گی۔ اس طرح چراغ سے چراغ جلتا رہے گا۔ کسی کو یاد کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اس کی سوچ اس کے مشن کو آگے بڑھایا جائے۔ تمہیں یاد ہے کہ تمہاری امی نے گھر کے پچھواڑے امرود، انار لوکاٹ اور خوبانی کا ایک ایک درخت تم تینوں بہن بھائیوں کے نام سے لگایا تھا تو ایک ایک درخت پردیسیوں کے، پھل اور پرندوں، چڑیوں کے لیے بھی لگایا تھا تمہیں یاد ہے کہ ہمارے آنگن کے آم کی کوئل تمہاری امی سے کتنی مانوس ہوگئی تھی پرندوں کے لیے پانی کے کونڈے کو وہ کبھی خالی نہیں ہونے دیتی تھیں۔ وہ شہد کی مکھیوں کے لیے تھوڑا سا ملکا کھلا چھوڑ دیتی تھیں۔ تمہیں یاد ہے ایک گلہری کا بچہ شہتوت کے پیڑ سے اتر کر ان کی گود میں آکر بیٹھ جاتا تھا۔ اور وہ اسے چلغوزے کی گری کھلاتی تھیں۔ بیٹے! محبت میں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔ محبت کی زبان کو پرندے اور جانور بھی سمجھتے ہیں۔ تو بیٹے تمہاری امی کی ساری عمر پھول کھلاتے گزری اپنے آنگن میں بھی اور سر راہ گزر بھی۔ اب تم سمجھ گئے ہوگے کہ وہ پھول میں نے اس آدمی کے ہاتھ میں کیوں دے دیئے تھے۔"

تو میرے عزیزو، یہ وہ پہلے پھول تھے۔ جو میں نے اپنی زندگی میں سر راہ گزر کھلتے دیکھے۔ اور جو خود میرے لیے چراغ راہ بن گئے ہیں۔

سر، یہ بڑوں کی باتیں ہیں۔ آپ بھی استاد ہیں۔ آپ کے والد بھی استاد تھے۔ آپ کی والدہ بھی بڑی عظیم تھیں۔ اس پرانے دور میں اور ان لوگوں کے لیے یہ پھول کھلانا آسان ہوں گے۔ کیا آج کل بھی سر راہ گزر پھول کھلانا ممکن ہے؟

کیوں نہیں؟ ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ میں اپنے بیٹے سے ملنے انجینئرنگ یونیورسٹی

لاہور گیا۔ یونیورسٹی کا علاقہ دور دور پھیلا ہوا ہے بہت دیر تک ادھر ادھر گھومتا رہا۔ کچھ پتہ نہ چلے میں یوں ہی سوالیہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ ایک نیشن ایبل لڑکے نے جھٹکے سے اپنی ہونڈا بائیک روکی "یس سر، آپ کو کہاں جانا ہے"؟ میں نے کہا ڈی ہال۔ اس نے کہا۔ ڈی ہال ادھر کہاں۔ آیئے میں آپ کو چھوڑ آؤں یہ نوجوان فورتھ ایئر کا طالب علم تھا۔ خدا اس کا بھلا کرے یہ بھی پھول کھلانے کی ایک مثال ہے اور یہ واقعہ تو کل ہی کا ہے۔ میں گھر سے اسکول آرہا تھا کہ میرے پاس سے ایک سائیکل سوار گزرا اس کی سائیکل کے کیریئر پر ایک پلاسٹک کا تھیلا رکھا تھا وہ نیچے گر گیا اسے پتہ نہ چلا ایک اور آدمی نے دیکھا تو اسے آواز دی اور بھاگ کر تھیلا اس کے حوالے کیا۔ یہ بھی پھول کھلانا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس دن گاؤں کی گلیوں میں کوئی چھوٹا بچہ کھڑا رو رہا ہوگا تو وہ اپنا کام چھوڑ کر اسے اس کے گھر تک پہنچا کے آیا ہوگا۔ چراغ سے چراغ اسی کو کہتے ہیں۔ آج صبح ہی کی بات ہے کہ میں اسکول کے دفتر میں بیٹھا کچھ کاغذات دیکھ رہا تھا کہ ایک صاحب ملنے آئے۔ آتے ہی کہا: ہیڈ ماسٹر صاحب آپ کا سکول بڑا اچھا ہے۔ میں نے کہا کیا ہوا۔ بولے میں اسکول کے بیرونی گیٹ پر کھڑا تھا کہ کسی سے پوچھوں کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا دفتر کدھر ہے کہ ایک چھوٹا لڑکا میرے پاس آیا اور ادب سے پوچھا جناب آپ کو کس سے ملنا ہے میں نے کہا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب سے۔ تو وہ بچہ بجائے اس کے کہ اشارے سے بتاتا کہ یوں جاؤ اور پھر یوں جاؤ۔ ادھر مڑو۔ ادھر مڑو۔ ادھر مڑو وہ میرے ساتھ دفتر تک آیا پھر اپنی کلاس کی طرف بھاگا۔ وہ صاحب اس لڑکے کے اس رویے سے بہت خوش ہوئے کہنے لگے پیڑ اپنے پتوں سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ صاحب آئے تو تھے اپنے بھانجے کا سرٹیفکیٹ لینے لیکن اسکول کی لائبریری کے لیے ایک اچھا خاصا عطیہ دے کر گئے چونکہ انہوں نے چیک کاٹ کر دیا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ پہلے

سے عطیہ دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ایک ذرا سی شائستگی ان صاحب کے دل میں اتر گئی۔ ابھی یہاں میٹنگ میں آنے سے پہلے وقفے میں ایک لڑکا میرے پاس دوڑتا ہوا آیا اور کہا " جناب ارفیق کی نکسیر پھوٹ گئی ہے۔ میں ادھر گیا تو ایک اور لڑکا اسے پہلے ہی نلکے کی طرف لے جا چکا تھا۔ واضح رہے کہ یہ لڑکا پانچویں جماعت کا تھا اور کلاس کا مانیٹر بھی نہیں تھا۔ وقفے کی وجہ سے ادھر میدان میں کوئی استاد بھی نہیں تھا۔ گویا یہ اقدام اس کے فرائض میں شامل نہیں تھا

عزیز طالباء

بات لمبی ہوتی جاتی ہے لیکن آخری مثال دیتا ہوں۔ پچھلے سال میٹرک کے امتحان میں ہمارے چند لڑکوں نے نقل کرنے کی کوشش بھی کی تھی چند ایک نے جاتے جاتے سکول کو بھی نقصان پہنچایا۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اسکول کو تحفے کے طور پر ڈیسک کرسی کا ایک ایک سیٹ، دیا ایک نے قائداعظم رح کی اور ایک نے اقبال کی بڑی خوبصورت تصویر لائبریری کو دی۔ دو نے اپنی یاد میں پودے لگائے لیکن مجھے وہ لڑکا زیادہ پسند آیا جس نے امتحان میں اپنے ساتھیوں سے نقل کرنے میں تعاون نہیں کیا تھا اس کا کھلایا ہوا یہ پھول سب سے قیمتی تحفہ تھا۔ جو پچھلے سال اس اسکول کو ملا۔ سبحان اللہ

عزیزو!

یوں ہی چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ قوم اسی طرح بنتی ہے اور سکھ پاتی ہے انسان کی اس سے بڑھ کر خوش بختی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ پھول کھلائے اور وہ بھی سرراہ گزر، ایسا کرنا صرف کار خیر ہی نہیں اگر غور کیا جائے تو ایک سماجی ضرورت بھی ہے اور مزید غور کیا جائے تو عقلمندی کا تقاضا ہے۔

جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

میزبان : حضرات!

آج ہم ایک نہایت خیال انگیز موضوع پر بحث کر رہے ہیں جس کی عملی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے۔ بحث کا عنوان ہے۔

جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

سب سے پہلے میں سلمان صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ گفتگو کا آغاز کریں۔

سلمان : زیر بحث موضوع غالب کا ایک مصرعہ ہے۔ پورا شعر یوں ہے ۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

اس شعر میں یہ فقرہ "جی خوش ہوا ہے" پورے شعر کی جان ہے۔ راہ کو پُرخار یعنی کانٹوں سے بھرا دیکھ کر نہ صرف نہ گھبرانا بلکہ اوپر سے خوش ہونا زندگی کے ایک خاص رویے یا ایک خاص فلسفہ حیات کی غمازی کرتا ہے۔

میزبان کون سا خاص رویہ یا فلسفہ زندگی؟

سلمان اس کی وضاحت میں گلاس اور پانی کی معروف مثال کے حوالے سے کروں گا اگر ایک گلاس میں آدھا پانی بھرا ہو تو ایک شخص کہتا ہے کہ آدھا خالی ہے۔ دوسرا کہتا ہے یہ آدھا بھرا ہوا ہے ایک آدمی ایک چیز کا تاریک پہلو دیکھتا ہے۔ دوسرا اسی چیز کا روشن۔ ایک کو روشنی میں بھی سیاہ دھبے نظر آ جاتے ہیں دوسرا

اندھیرے میں روشن لکیریں ڈھونڈھ لیتا ہے۔

میزبان عرفان صاحب! آپ کا کیا خیال ہے۔

عرفان میں سمجھتا ہوں کہ راستے کو کانٹوں سے بھرا دیکھ کر خوش ہونا نہ کہ گھبرانے سے بہت آگے کی منزل ہے۔ قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ شاعر کانٹوں کا خیر مقدم کرتا ہے۔

میزبان : آخر کیوں؟

عرفان : سوچ اور کردار کی وجہ سے۔ ایک تو پاؤں میں آبلے پڑے ہوئے ہیں اوپر سے جو راہ ہے وہ پُرخار ہے۔ گویا مزید تکلیف یا مزید آزمائش کا سامان ہے اس موقع پر مایوسی یا بددلی کا ردِعمل بھی ہو سکتا ہے۔ بلکہ وہ زیادہ نیچرل ہے اب یہ شاعر کی سوچ ہے کہ وہ اس بظاہر بدترین صورتحال کے بھی روشن پہلو کو دیکھتا ہے کہ راستہ کانٹوں سے بھرا ہوا ہے تو کیا کم از کم پاؤں کے چھالوں سے تو نجات ملے گی گویا مشکل ترین صورتحال سے دوچار ہو کر بھی وہ پریشان نہیں ہوتا بلکہ مردانہ وار اس کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ آگے بڑھتا ہے۔ راہ کے کانٹوں کو چاروناچار برداشت کرنا ایک بات ہے اور ان کو دیکھ کر خوش ہونا اور بات ہے اور بڑی عظیم بات ہے۔

میزبان اب میں سلیم صاحب سے عرض کروں گا کہ وہ اپنے خیالات سے مستفید فرمائیں۔

سلیم میرا خیال ہے کہ موضوع زیرِ بحث غالب کے ایک شعر سے ماخوذ ضرور ہے لیکن اسے اس شعر کے پہلے مصرعے کے ساتھ الجھانے کی ضرورت نہیں۔ یہ اپنی جگہ مکمل ہے اور پورے شعر کے مقابلہ میں زیادہ معنی خیز ہے۔ یہ زندگی کے ایک بہت ہی مثبت رویے کا بہت بلیغ اظہار ہے۔ جس کو اپنے زورِ بازو پر اپنی قوتِ برداشت پر اپنے عزمِ سفر پہ، اعتماد ہو اور بھرپور اعتماد ہو، صرف وہی کہہ سکتا ہے کہ

جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

مشکل پسندی، چیلنج کو قبول کرنا، ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ایک اچھا کھلاڑی ہی اچھے مدمقابل کو ڈھونڈتا ہے، جس طالب علم کی تیاری اچھی ہو صرف اسی کی خواہش ہوتی ہے کہ پرچہ ذرا مشکل آئے۔ شیر کے شکار پر وہی شکاری نکلتا ہے۔ جس کا نشانہ بے خطا اور جرأت بے حساب ہو۔ زندگی اپنے انعامات، صرف ان جرأت مندوں کو پیش کرتی ہے جو تندی باد مخالف سے ٹکرانا جانتے ہوں بلکہ ٹکرانا چاہتے ہوں۔ کوئی راستہ بھی کانٹوں سے خالی نہیں ہوتا جس کو سفر کرنا ہے۔ اس کو کانٹوں سے مفر نہیں۔ جس کو آگے بڑھنا ہے اسے انہی کانٹوں کے اوپر سے گزر کر آگے بڑھنا ہے تو وہ مردانہ وار کیوں نہ کہے ؎

جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

جو نہ صرف زیادہ جرأت، مندانہ رویہ ہے بلکہ سچ پوچھیے تو فراست کا تقاضا بھی یہی ہے۔ جب ایک کام کرنا ہی ہے تو کیوں نہ حوصلے سے باوقار طریقے سے کیا جائے۔ جب انجکشن لگنا ہی ہے اور آپریشن ہونا ہے اور ہونا ضروری بھی ہے تو پریشان ہونے، رونے اور شور کرنے سے کیا حاصل، جتنی تکلیف ہونا ہے وہ تو ہوگی ہی اس کے ساتھ اپنی سبکی کرانا کون سی عقلمندی ہے۔ تکلیف تو ختم ہو جاتی ہے لیکن بات رہ جاتی ہے۔

میزبان اب میں اس مجلس کے مہمان خصوصی محترم پرنسپل صاحب سے گزارش کروں گا کہ وہ طلبا کے حوالے سے اس موضوع پر کچھ روشنی ڈالیں۔

پرنسپل میں بھی یہی عرض کروں گا کہ زندگی کی راہ کا کوئی کانٹا، ڈرنے سے، بچنے سے پریشان ہونے سے اپنی جگہ سے نہیں ہٹے گا اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ کانٹا کسی شکل میں بھی سامنے آسکتا ہے۔ وہ کوئی ہینڈی کیپ Handicap بھی

ہو سکتا ہے۔ اس کی ایک صورت، وسائل کی کمی، ماں باپ کی شفقت سے محرومی بھی ہو سکتی ہے۔ حاسدوں کا حسد اور دشمنوں کی دشمنی بھی کانٹے کی ایک شکل ہے۔ تعلیمی سہولتوں کا فقدان بھی کانٹا ہی ہے۔ غرض کانٹوں کی ہزار شکلیں ہیں۔ ہر شخص کی راہ کے کانٹے علیحدہ ہوتے ہیں۔ لیکن سب کا نتیجہ یکساں ہوتا ہے، یعنی رکاوٹ، آزمائش، امتحان، جسمانی یا ذہنی اذیت۔ ایسے تمام موقعوں پر اور ایسی تمام صورتوں میں صحیح رویہ یہی ہوتا ہے کہ صورتحال کا جرأت اور دانشمندی سے، صبر و تحمل سے۔ مقابلہ کیا جائے بلکہ اس پر غالب آنے کی کوشش کی جائے۔

مشہور امریکی مصنف ایمرسن نے اپنے نظریہ تلافی میں اس نکتہ کی وضاحت کی ہے کہ قدرت جب کچھ چھینتی ہے تو کچھ دیتی بھی ہے۔ کوئی کانٹا راستہ میں ڈالتی ہے تو کوئی اور اٹھاتی بھی ہے۔ کوئی ہینڈی کیپ ہوتا ہے تو قدرت، کوئی اور قوت یا صلاحیت وافر مقدار میں دے کر اس کی تلافی بھی کرتی ہے اگر راہ پر خار ہوتی ہے تو کہیں چھاؤں بھی ہوتی ہے۔

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے

اور اگر چھاؤں نہیں ہے تو نہ سہی، آخر تپتی دھوپ، میں بھی تو لوگوں نے بڑے بڑے لمبے سفر کیے ہیں۔ لہٰذا کسی ہینڈی کیپ کو ہینڈی کیپ معذوری کو معذوری، مجبوری کو مجبوری، رکاوٹ کو رکاوٹ نہیں بننے دینا چاہیئے کہ دلیروں اور جرأت مندوں کا شیوہ یہی ہے۔

طلبہ کو خاص طور پر مشکل پسندی کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ مجھے شیخ سعدی کا ایک قول یاد آیا۔

"اگر سلامتی کے خواہاں ہو تو وہ پھر ساحل پر ہے لیکن اگر موتیوں کی

تلاش سے تو ذرہ تعر دریا میں بلیز ہ گے۔"

میزبان : آپ سب حضرات کا بے حد شکریہ۔ میں خاص طور پر پرنسپل صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس مجلس کو اپنی شرکت سے نوازا۔

زندگی

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
زندگی کی حقیقت کو کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو

(اقبالؒ)

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں

میزبان : اقبال کی ایک مشہور نظم ہے "بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو" اس کا تیسرا شعر ہے

غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاج سر دارا

شاعر کہتا ہے کہ ایک درویش جو غیرت مند ہے۔ بے نیاز ہے کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتا۔ تو یہ بے نیازی، یہ غیرت مندی اسے بادشاہوں کے بادشاہ دارائے اعظم کے رتبہ پر پہنچا دیتی ہے۔

"خوئے سوال" انسان کی انا کو مجروح کر دیتی ہے۔ اقبال نے ایک اور جگہ کہا ہے۔ سوال سے خودی ضعیف کس طرح ہوتی ہے۔ میں اکرم سے درخواست کروں گا کہ وہ اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں۔

اکرم : پہلے سوال کا جواب تو صاف ہے کہ صرف چیزوں اور پیسے کے مانگنے کو ہی سوال نہیں کہتے۔ اپنی صلاحیتوں کو ترقی نہ دینا، اپنے ذہن سے کام نہ لینا، اپنے وسائل سے استفادہ نہ کرنا اور دوسروں کی طرف دیکھنا کہ کوئی رحم کھا کر یا کسی مصلحت سے ہماری جھولی میں بھی کچھ ڈال دے۔ خوئے سوال ہی کی ایک صورت ہے۔ اس رویے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ فرد کی اپنی صلاحیتیں ٹھٹھر کے رہ جاتی ہیں۔ قوم کے اپنے وسائل ترقی نہیں کر پاتے۔ ایک فرد کی آزادی ہو یا قومی آزادی آہستہ آہستہ خوئے سوال کی نذر ہو جاتی ہے۔

میزبان اب میں احسان سے درخواست کروں گا کہ غیرت اور خوئے سوال پر اسکول کی زندگی کے پس منظر میں اظہار خیال کریں اور اپنے نقطۂ نظر کو مثالوں سے واضح کریں۔

احسان اسکول میں معمولی چیزوں کا لین دین تو ہوتا رہتا ہے۔ کبھی کسی سے کوئی چھوٹی موٹی چیز لی اور کبھی دی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن کوئی لڑکا پنسل، ربڑ یا قلم بھی مانگتا ہی رہتا ہے تو اس سے اس کی عزت نفس پر یقیناً اثر پڑے گا۔ دوسری مثال جوابات نقل کرنے کی ہے۔ جو لڑکے خود سوال حل نہیں کرتے، نوٹس کی کتابوں سے یا دوسرے لڑکوں کی کاپیوں سے نقل کرتے ہیں، یہ بھی ایک طرح سے اپنے ذہن کی توہین ہے اور اپنی صلاحیتوں کا گلا گھونٹنے کے مترادف

ہے۔

تیسری مثال یہ ہے کہ کسی سے کوئی نا جائز رعایت حاصل کرنا۔ اپنی بے عزتی کو دعوت دینا ہے۔ جو نا جائز فائدہ پہنچائے گا وہ یقیناً نا جائز فائدہ اٹھائے گا بھی جس کا آدمی کھاتا ہے اس کا گانا بھی پڑتا ہے۔ بُرے آدمیوں کی یہ خاص تکنیک ہوتی ہے کہ وہ پہلے بہت ہمدرد بن کر نا جائز فائدے پہنچاتے ہیں۔ نا جائز رعائتیں دیتے ہیں۔ اور جب بندہ ان کی عنایتوں اور مہربانیوں کے جال میں پھنس جاتا ہے اور اس کو بُری عادتیں پڑ جاتی ہیں تو وہ آہستہ آہستہ اپنے جال کا پھندا تنگ کرنے لگتے ہیں۔ پھر آدمی مجبور ہو کر وہ کام کرنے لگتا ہے جو وہ نہیں کرنا چاہتا۔

اس لیے اسکول کے طلبا کو ایسے جعلی مہربانوں سے ہوشیار رہنا چاہیئے جو ہمدرد بن کر تباہی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ جب بھی کوئی ضرورت سے زیادہ ہمدردی جتائے، کوئی رعایت دے اور چھپا کر دے یا کسی غلطی کو نظر انداز کرے، نظم و ضبط کی کسی پابندی کو توڑنے دے اور اس پر باز پرس نہ کرے۔ ایک سمجھ دار طالب علم کو سمجھ جانا چاہیئے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ جو آپ کا صحیح ہمدرد ہے۔ اس کا رویہ کبھی کبھی سخت بھی ہوگا، وہ کبھی بے جا رعایت نہ دے گا، وہ والدین کی طرح کھلائے بلینک سونے کا نوالہ لیکن شیر کی نظر رکھے گا۔

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں

بخش دو گر خطا کرے کوئی

میزبان : حضرات

درگزر کرنے اور بخش دینے کے تین پہلو ہیں۔ اس کی فضیلت، اس کی ضرورت

اور اس کی افادیت۔ فضیلت اخلاقی اعتبار سے، ضرورت سماجی لحاظ سے اور افادیت نفسیاتی نقطۂ نظر سے۔ عفو و درگزر کی فضیلت میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ اس پر تو قرآن و حدیث کی شہادت موجود ہے۔ اسلام میں بدلہ لینے کی اجازت ہے لیکن عفو و درگزر کو افضل کہا گیا ہے۔ صبر کرنے والوں اور احسان کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی کی نوید دی گئی ہے۔

ان اللّٰہ یحب المحسنین اور واللّٰہ یحب الصابرین وغیرہ بہت واضح آیات ہیں۔ احادیث میں تو عفو و درگزر کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول رحمت کہا گیا ہے چنانچہ

معزز سامعین!

تدبر اور تفکر کی اس مجلس میں ہم صرف عفو و درگزر کی ضرورت اور افادیت کے پہلو پر گفتگو کریں گے۔ میں سب سے پہلے سعید صاحب کو اظہار خیال کی دعوت دیتا ہوں۔

سعید : زیر بحث موضوع غالب کے ایک شعر کا دوسرا مصرعہ ہے۔ پورا شعر یوں ہے۔

ٹوک دو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

پورے شعر کو ایک ساتھ پڑھنے سے سماجی زندگی کا ایک بنیادی اصول اور رویّہ سامنے آتا ہے کہ اگر کوئی غلطی کرتا ہے، کسی زیادتی کا مرتکب ہوتا ہے تو ہمیں اسے اس کے حال پر نہیں چھوڑ دینا چاہیئے کہ اگر کوئی بُرا ہے تو ہوا کرے اگر غلطی کرتا ہے تو کیا کرے ہمیں اس سے کیا۔ یہ رویہ لاتعلقی کا ہے۔ یہ نہی عن المنکر کے حکم کی نفی ہے اور ایک غلط سماجی رویّہ بھی ہے۔ آپ غلطی سے اگم راہی سے لاتعلق نہیں رہ سکتے۔ گم راہ کو روکنا ہے۔ غلط کار کو ٹوکنا ہے۔ لیکن اس کے بعد کا رویّہ

کیا ہو؟ اگر کوئی غلطی کر بیٹھتا ہے۔ غلط قدم اٹھا لیتا ہے۔ خطا کا مرتکب ہو جاتا ہے یا آپ کے ساتھ زیادتی کر ڈالتا ہے۔ تو کیا کیا جائے۔ اس وقت آپ کا ردِ عمل کیا ہو؟ اس کا جواب، ایک صوفی اور فلسفی کی طرح غالب یہ دیتے ہیں کہ:

بخشش دو گر خطا کرے کوئی

اس کو معاف کر دو بخش دو۔

میزبان : کیوں بخش دو، معاف کیا جائے تو کیوں؟ اس میں کیا مصلحت ہے کیا حکمت ہے۔ اس میں نفسیاتی نکتہ کیا ہے۔ مختصر یہ کہ بخش دینے اور معاف کر دینے کا فلسفہ کیا ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لیے میں عارف صاحب کو زحمت دوں گا۔

عارف : پہلے تو میں اس امر کی وضاحت کروں گا کہ خطا کو گناہ یا جرم سے مکس اپ یا الجھایا نہ جائے۔ غالب نے خطا کی طرف رویے کی نشاندہی کی ہے غلطی کو بخش دینے کی تلقین کی ہے۔ گناہ، جرم، ان ڈسپلن، ظلم یا بددیانتی کو نظر انداز کرنے یا معاف کرنے کو نہیں کہا۔ وہ تو مسئلہ ہی اور ہے۔

میزبان : پھر آپ کی رائے میں خطا کی تعریف کیا ہوگی؟

عارف : میرا خیال ہے کہ خطا کے زمرہ میں وہ تمام فروگذاشتیں، غلطیاں، یا چھوٹی موٹی زیادتیاں آتی ہیں جن کا تعلق باہمی تعلقات و معاملات سے ہے۔

میزبان : شکریہ۔ عارف! آپ نے اچھا نکتہ پیدا کیا کہ خطا کے مفہوم اور دائرہ کار کی وضاحت کر دی۔ لیکن ہمارا بنیادی سوال اب بھی وہیں ہے کہ زیادتی کو کیوں نظر انداز کیا جائے۔

بخشش دو گر خطا کرے کوئی

آخر کیوں؟ سماجی اعتبار سے ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس اہم سوال کے جواب کے لیے میں انور صاحب کو تکلیف دوں گا۔

انور : شکریہ۔میں عرض کرتا ہوں۔خوشگوار اور ترقی پذیر سماجی زندگی کی پہلی اور بنیادی شرط انصاف ہے کہ کوئی کسی کے ساتھ زیادتی نہ کرے، ہر ایک کو اس کا حق ملے۔دوسری شرط تحمل و برداشت، صبر و ضبط اور درگزر کا رویہ ہے جتنا چھوٹا سماجی گروپ ہو، جتنا قریبی تعلق ہو، جتنا زیادہ مل جل کر رہنا ہو اس رویہ کی اتنی زیادہ ضرورت ہوگی۔اس رویے کے بغیر گھر ہو، کلاس ہو یا اسکول کہیں پرسکون زندگی ممکن نہیں۔اصل میں عفو و درگزر کا رویہ محبت و عصبیت سے پیدا ہوتا ہے اور پھر خود محبت و عصبیت کو مزید مضبوط کرتا ہے۔اس رویے کی کمی اس بات کی علامت ہے کہ آپس میں تعلق "اعتماد" اور مفاہمت کم ہے مختصر یہ کہ گھریلو، اسکولی غرض ہر قسم کی سماجی زندگی کو مستحکم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ "بخش دو گر خطا کرے کوئی" کے رویہ کو اپنایا

اس تصور کو مشہور انگریزی شاعر پوپ نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

To err is human, to forgive divine.

یعنی غلطی کرنا انسان کی فطرت میں ہے، معاف کر دینا خدائی وصف ہے اسی طرح اس موضوع پر ایک فرانسیسی کہاوت بھی قابل غور ہے۔

میزبان : ارشاد۔

انور To understand all is, to forgive all. سب کچھ سمجھنا سب کچھ معاف کر دینا ہے۔

میزبان بڑی گہری بات ہے۔یہ بجائے خود ایک مذاکرہ کا موضوع ہو سکتی ہے سبحان اللہ اب میں اپنے فاضل استاد رشید صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ

بخش دو گر خطا کرے کوئی

کے نفسیاتی پہلو پر کچھ روشنی ڈالیں۔

رشید : درگزر کرنا اور بخش دینا نفسیاتی اعتبار سے بہت ہی مثبت Positive رویہ ہے۔ اس رویہ کے واضح طور پر چار فائدے ہیں۔ پہلا یہ کہ جو بخش دینے کا رویہ اختیار کرتا ہے وہ کسی اعصابی کھینچا ؤ یا Tension کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ Relaxed ہوتا ہے وہ Confront نہیں کر رہا وہ غصے میں نہیں، وہ نفرت کی آگ میں نہیں جل رہا۔ اس کا ذہن Tense نہیں ہوگا۔ وہ تلخی اور بدمزاجی کا شکار نہیں ہوگا۔ اس کا لائف اسٹائل کھانا پینا اور کام کرنا متاثر نہیں ہوگا وہ چین کی نیند سوئے گا۔ اس کے برعکس جن لوگوں کا رویہ گرنت کا، پکڑنے، بدلہ لینے، حساب چکانے۔ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت کا ہوتا ہے۔ وہ TENSE رہتے ہیں۔ نہ صرف وہ خود ایک ذہنی اذیت کا شکار ہو جاتے ہیں بلکہ ان کی وجہ سے ان کے ساتھی دوست، اقرباء سب سکون اور زندگی کی ہماہمی سے محروم ہو جاتے ہیں۔

عفو و درگزر، تحمل اور صبر کا دوسرا نفسیاتی فائدہ یہ ہے کہ جو انسان بھی یہ رویّہ اختیار کرتا ہے اس کی خودی مضبوط ہوتی ہے۔ اسے اپنی اخلاقی قوت کا شعوری ولاشعوری احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنی نگاہوں میں بھی بلند ہو جاتا ہے اور دوسروں کی نگاہوں میں بھی۔

بخش دو گر خطا کرے کوئی

کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ درگزر کرنے اور معاف کر دینے سے تعلقات کے مزید بگڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تعلقات کے بہتر ہونے کی صورت نکل سکتی ہے اور خطا کار کی اصلاح کا امکان بہت بڑھ جاتا ہے اور غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں اور آخر میں روٹھے گلے لگ جاتے ہیں۔

اس رویے کا چوتھا اور بہت اہم فائدہ یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں نہ

اُلجھنے۔ چھوٹی چھوٹی زیادتیوں کو نظر انداز کر دینے سے آدمی کی نظر بلند یوں پر، زندگی کے اہم اور بلند تر مقاصد پر رہتی ہیں اور وہ زندگی کے تعمیری کاموں میں لگا رہتا ہے اس کی توانائی ضائع نہیں ہوتی، اس کا وقت ضائع نہیں ہوتا اس کی سماجی پوزیشن ہی مستحکم نہیں ہوتی اس کی کامیابی بھی زیادہ یقینی ہوجاتی ہے۔

میزبان : شکریہ۔ رشید صاحب آپ نے تو علم و حکمت کے چراغ جلادیئے۔

خدمت وہ بھی کرتے ہیں جو کھڑے انتظار کرتے رہتے ہیں

میزبان : جنوری ۱۹۳۹ء کا ایک واقعہ ہے کہ بمبئی میں قائداعظم کی ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ کی کوٹھی پر ایک مسلم لیگی سید عارف شاہ گیلانی حاضر ہوئے اور کہا:

سر، میں چاہتا ہوں کہ ملازمت کا جوا اتار کر میں مسلم لیگ میں شامل ہو جاؤں اور ملک کے کونے کونے میں مسلم لیگ کے لیے تقریریں کرتا پھروں۔

یہ سن کر قائداعظم نے یہ جواب دیا۔

اچھا جذبہ ہے۔ میں خوش ہوں کہ ہمارے نوجوانوں میں اتنا قومی جذبہ، اتنا قومی احساس ہے۔ لیکن تم نے ملٹن کی وہ نظم ضرور پڑھی ہوگی جو اس نے اپنی آنکھوں کی بینائی ضائع ہوجانے کے بعد لکھی تھی۔ جی ہاں۔ "آن ہز بلائنڈنس" عارف شاہ کو قائداعظم نے دریافت فرمایا۔ پھر تمہیں اس کا آخری مصرعہ بھی یاد ہوگا۔ عارف شاہ نے وہ مصرعہ بھی دوہرایا۔

They also serve who only stand and wait

قائداعظمؒ یہ حوالہ سن کر بہت خوش ہوئے اور کہا تو پھر اس مصرعہ کو یاد رکھو محکمہ تعلیم میں اپنے کام پر ڈٹے رہو۔ یہ خدمت بھی مسلم لیگ کی خدمت ہے میں تمہارے جذبہ کی قدر کرتا ہوں۔ ماشاءاللہ

تو حضرات، قائداعظمؒ کے تبصرہ کے حوالے سے ملٹن کا یہ مصرعہ
They also serve who only stand and wait آج کے مذاکرہ کا موضوع ہے،
سب سے پہلے میں رشید صاحب کو اظہار خیال کی دعوت دیتا ہوں۔

رشید : ملٹن کے اس انگریزی مصرعہ کا ترجمہ یوں کیا جا سکتا ہے۔
خدمت، وہ بھی کرتے ہیں، جو کھڑے انتظار کرتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ ترجمہ بہت بھونڈا لفظی ترجمہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملٹن کا یہ مصرعہ اتنا بلیغ ہے۔ اس میں معانی کی اتنی تہیں ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا اردو کیا۔ کسی زبان میں نہیں ہو سکتا۔

میزبان : آخر کیوں؟

رشید : اس لیے کہ الفاظ اپنی جگہ علیحدہ علیحدہ بہت سادہ ہیں ان کی ترتیب بھی صاف ہے لیکن اس مصرعے کا مفہوم بہت بلیغ ہے۔ ہر لفظ احساسات اور تصورات کی ایک دنیا ہے۔ جو شخص زندگی کا جتنا تجربہ اور شعور رکھتا ہے اس کے لیے اس میں معانی کی اتنی ہی گہرائیاں ہوں گی۔

میزبان : شکریہ رشید صاحب۔ اب ہم ماجد صاحب سے رجوع کرتے ہیں۔ ماجد صاحب آپ اس مصرعہ کی معنویت پر کچھ روشنی ڈالیں۔

ماجد : میرے ذہن میں یکایک یہ خیال آیا ہے کہ ویٹ کرنے کے انگریزی میں بہت سے معنی ہیں۔ ویٹ انتظار کرنے کے معنی میں تو استعمال ہوتا ہی ہے کسی پر ویٹ کرنا کسی کا حکم بجا لانے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح اس مصرعہ کے ایک معنی یہ ہوں گے کہ جو شخص گو براہِ راست کسی عظیم مقصد کے لیے مصروف تگ و تاز نہیں لیکن اس جہاد کے شرکا کے لیے کچھ نہ کچھ کر رہا ہے۔ تو بالواسطہ طور پر وہ بھی شریک کارزار ہی ہے۔ چونکہ اصل میں اصل

مسئلہ اس عظیم مقصد کو آگے بڑھانے کا ہے کون کس جگہ کام کر رہا ہے کون سامنے ہے۔ کون پیچھے یہ اہم نہیں گویا اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ پس منظر میں رہ کر کام کرنا بھی کم اہم کام نہیں۔

سلیم : میں کچھ عرض کر سکتا ہوں؟

میزبان : ضرور۔

سلیم : ماجد صاحب نے اچھا نکتہ پیدا کیا ہے ایک اچھے شعر میں معنی کی بہت سی تہیں اور اشارے ہوتے ہیں چنانچہ اس مصرعہ میں بھی اشاریت ہے۔ لیکن اس کا جو سامنے کا مطلب ہے وہ بھی کم خوبصورت اور معنی خیز نہیں۔

میزبان : وہ کیا ہے؟

سلیم : یہی کہ اصل چیز یہ نہیں کہ کس نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا۔ اصل چیز شوق اور سپردگی ہے۔ وفاداری اور خلوص ہے۔ آقا کی نظر بھی غلام کے دل پر ہوتی ہے اللہ تعالیٰ تو بڑا علیم و خبیر ہے اسے خوب معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کس بندے کو کتنی طاقت، کتنی صلاحیت دی ہے اور کس کس چیز سے محروم کر رکھا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی بارگاہ میں تو اسی کی قیمت ہو گی کہ کون اپنی حدوں میں خدمت اور محبت کرنے کا کتنا شوق رکھتا ہے۔

میزبان : اب میں جمیل صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اس مذاکرہ پر اختتامی تبصرہ کریں۔

جمیل صاحب : میں سمجھتا ہوں کہ ملٹن کے اس لافانی فقرے پر بڑی خیال انگیز بحث ہوئی ہے۔ سرو (Serve) کرنے کا ایک نیا تصور سامنے آیا ہے۔ سرو کا لفظ میں نے یوں استعمال کیا کہ خدمت کرنا اس کا بہت محدود ترجمہ ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ رشید احمد صدیقی نے کہیں لکھا ہے کہ جب خدا کے حضور اس کے

بندے پیش ہوں گے ہمیں یہ دیکھ کر شاید حیرت ہو کہ اس کی بارگاہ میں بعض ایسے انسانوں کا مقام بہت اونچا ہے جو دنیا میں بہت معمولی معمولی گمنام اور بے حیثیت جگہوں پر کام کرتے تھے۔

.... مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب "چند ہم عصر" میں نام دیو مالی اور نور خان چوکیدار کی عظمت کو اسی نقطہ نظر سے ابھارا ہے۔ آج پاکستان میں ایسے عالی ظرف اور بلند نگاہ لوگوں کی ضرورت بہت زیادہ ہے جو گمنامی میں رہ کر پس منظر میں رہ کر، شہرت کی ہوس سے بے نیاز رہ کر پاکستان کے لیے کچھ کر سکیں۔ گو یہ کام ہے بہت مشکل۔ خود ملٹن ہی نے ایک جگہ کہا ہے

Fame-that last infirmity of noble mind

یعنی شہرت کی خواہش ایک شریف آدمی کی بھی آخری کمزوری ہوتی ہے۔ بہرحال یہ کام اگر مشکل ہے تو بھی کرنے کا ہے اور عظیم وہی ہے جو ایسا کر پائے میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ایک سیدھا سادہ مطلب یہ بھی ہے کہ وہ بھی جو کچھ کر نہیں پاتے۔ لیکن حسرت تعمیر لیے بے چین رہتے ہیں کہ کسی امتحان سے گزریں کہیں خون نہیں تو پسینہ ہی گرائیں کچھ کریں تو سہی محبت کا کوئی امتحان تو ہو۔

میزبان : یہاں یہ مذاکرہ ختم ہوتا ہے۔ میں تمام شرکاء کا ممنون ہوں۔

کامیاب کون اور ناکام کون ؟

صدر : حضرات! آج کے مذاکرے کا موضوع ہے۔ زندگی میں کامیاب کون اور ناکام کون ہوتا ہے۔ میں اشرف سے درخواست کروں گا کہ وہ بحث کا آغاز کریں۔

اشرف : میرا خیال ہے کہ پیسہ کامیابی کی پہلی شرط ہے۔ جن والدین کے پاس پیسہ ہوتا

ہے وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ سکولوں میں بھیجتے ہیں ان کو اعلیٰ تعلیم ملتی ہے۔ وہ زندگی میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیتے ہیں۔

انور : میں اشرف سے اختلاف کروں گا۔ اگر ایسا ہوتا تو تمام امیروں کے لڑکے سب سے زیادہ لائق ہوتے اور جو جتنا مالدار ہوتا اس کے اتنے زیادہ مارکس ہوا کرتے چونکہ ایسا نہیں۔ اس لیے یہ نتیجہ نکالنا مشکل ہے۔ تعلیمی کامیابی کے لیے پیسہ بنیادی چیز نہیں۔ ابھی کچھ دن ہوئے پنجاب یونیورسٹی میں بی ایس سی کے امتحان میں گاؤں کا ایک غریب لڑکا فرسٹ آیا تھا۔ اکثر غریب لڑکے امتحانات میں اعلیٰ کامیابیاں حاصل کرتے رہتے ہیں۔

صدر : اکرم، آپ کی رائے کیا ہے؟

اکرم : میرے خیال میں ذہانت اہم چیز ہے۔ اصل فرق ذہانت سے پڑتا ہے۔

اختر : میں کچھ عرض کروں؟

صدر : فرمائیے۔

اختر : مجھے اشرف اور اکرم دونوں سے اختلاف ہے۔ میرا خیال ہے کہ نہ پیسے سے اتنا فرق پڑتا ہے نہ ذہانت سے۔

اشرف : کیوں نہیں۔

اختر : دیکھئے! اگر محض ذہانت سے فرق پڑا کرتا تو ہر لڑکا اپنی ذہانت کے مطابق کامیاب ہوا کرتا۔ ماہرینِ نفسیات کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ اکثر بی اور سی گریڈ کے لڑکے اے گریڈ کے لڑکوں سے زیادہ نمایاں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ ہمارا اپنا تجربہ بھی یہی ہے کہ بہت سے ذہین لڑکے شرارتیں ہی کرتے رہتے ہیں اور ان سے کم ذہین لڑکے اور عام اسکولوں میں پڑھے لڑکے ان سے بازی لے جاتے ہیں۔

صدر : آخر کیوں؟

عارف : اس کا جواب میں دیتا ہوں۔ ذہانت کا تھوڑا بہت فرق محنت اور لگن سے پورا ہو جاتا ہے اور وسائل کی کمی کی تلافی بھی محنت اور شوق سے ہو جاتی ہے قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ نے اپنی ابتدائی تعلیم بہت نامساعد حالات میں شروع کی۔ علامہ اقبالؒ کا بچپن بہت غریبی میں گزرا۔ قائداعظمؒ نے ایک بار کہا تھا کہ میں اسٹریٹ لائٹ میں پڑھا ہوں۔ بہت سے سپاہیوں این سی اوز اور جے سی اوز کے بچے جرنیل بنے ہیں۔ اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے کہ علم و ترقی کسی کی میراث نہیں۔ جو محنت کرے گا اسے پائے گا۔

صدر : آخر میں بشیر سے کہوں گا کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

بشیر : میرے خیال میں اصل چیز یہ ہے کہ آدمی کی سوچ ٹھیک ہو اور سوچ کا ٹھیک ہونا بغیر علم و تجربے کے ممکن نہیں اس لیے کامیاب وہ ہو گا، جس کا رویہ ٹھیک ہے، جس کی سوچ ٹھیک ہے، جس کا شعور زیادہ ہے۔

قوموں کا عروج و زوال

میزبان صدرِ مجلس، حاضرینِ گرامی!

آج کے مذاکرے کا عنوان ہے "قوموں کا عروج و زوال"! انسانی تہذیب کی داستان ہزاروں سالوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ مصری، سندھی، یونانی، رومی اور اسلامی تہذیبیں ابھریں اور ڈوبیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عروج و زوال کے اسباب کیا ہیں؟ ایک قوم ایک تہذیب ابھرتی ہے تو کیوں ابھرتی ہے اور جب اس کے اقبال کا آفتاب غروب ہوتا ہے تو کیوں ہوتا ہے۔

میں اشرف سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

اشرف : قوموں کے عروج وزوال کے مسئلہ پر سب سے پہلے تیرھویں صدی میں ایک مسلمان مورخ ابن خلدون نے روشنی ڈالی۔ بعد کے مفکروں نے بھی اس اہم مسئلہ پر غور کیا ہے بیشتر کا خیال یہ ہے کہ قوموں کے عروج وزوال کا تعلق اخلاق وکردار سے ہے جب کوئی قوم آگے بڑھتی ہے تو اس کے اندر عزم ہوتا ہے، جوش وولولہ ہوتا ہے۔ قومی عصبیت ہوتی ہے قومی مفاد کے لیے قربانی دینے اور ایثار کرنے کا جذبہ ہوتا ہے۔ اقبالؒ کا شعر ہے ؎

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

صدر مجلس : انور آپ کا کیا خیال ہے ؟

انور : میں سمجھتا ہوں کہ مادی وسائل کی بڑی اہمیت ہے بغیر مادی وسائل کے کوئی قوم آگے نہیں بڑھ سکتی اور ترقی کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام نہیں دے سکتی۔

اکرم : میں انور سے اختلاف کروں گا۔ وسائل کی دولت کی اہمیت تو ہے لیکن بنیادی اہمیت نہیں۔ اس کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے وسائل بہت کم ہیں اور وہاں ایک اونس لوہا بھی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن انہوں نے گھڑی کی صنعت میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ یہی حال جاپان کا ہے۔ جاپان کے وسائل بہت تھوڑے ہیں۔ لیکن پوری قوم محنتی اور جفاکش ہے انہوں نے تھوڑے وسائل ہی سے کام لیا ہے۔ بلکہ دوسرے ملکوں کے وسائل سے بھی کام لیا ہے۔ عربوں کے پاس، لاطینی امریکہ اور افریقہ کے بعض ملکوں کے پاس وسائل کی کمی نہیں کسی اور چیز کی کمی ہے۔

صدر مجلس : وہ کیا چیز ہے ؟

اختر : میں عرض کرتا ہوں کہ وہ چیز علم ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی ہے۔ محنت اور مشقت بھی اس وقت ہی کام آتی ہے جب اس کے پیچھے علم اور ٹیکنالوجی کی

کی طاقت ہو خود مسلمانوں کی تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ مسلم تہذیب کے عروج کا دور یعنی دسویں اور گیارہویں صدی ان کے علوم و فنون میں کمال کا دور بھی ہے۔

صدر: میں آخر میں عارف سے درخواست کروں گا کہ وہ بحث پر اختتامی تبصرہ کریں۔

عارف: میں سمجھتا ہوں کہ سب مقرروں نے حقیقت کے ایک ایک پہلو سے پردہ اٹھایا ہے میں یہ کہوں گا کہ قوموں کے عروج و زوال میں قومی کردار اہم رول ادا کرتا ہے۔ محنت مشقت، جفاکشی، عزم اور حوصلے سے ٹیکنالوجی بھی حاصل ہوتی ہے اور قومی تعمیر بھی ہوتی ہے۔ دوسری جنگ میں جاپان اور جرمنی مکمل طور پر تباہ ہو گئے تھے یہ ان قوموں کا حوصلہ، جفاکشی اور ایثار کا جذبہ ہے۔ معاملات اور تعلقات میں دیانت اور تعاون کا رویہ ہے کہ ان قوموں نے دوبارہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر لیا ہے۔ یہی چیز چین کی عظیم ترقی کی بنیاد ہے۔

اخلاق کی دو قسمیں ہیں، ایک بنیادی، تہذیبی، اخلاق دوسرا اسلامی اخلاق، بنیادی اخلاق یعنی دیانت، جفاکشی، انصاف پسندی اور رواداری، قومی مفاد کے لیے ایثار ہر قوم کی تہذیبی ترقی کی بنیادی شرط ہے۔ خواہ وہ مسلم یا غیر مسلم۔ اسلامی اخلاق بنیادی اخلاق سے آگے کی چیز ہے۔ اسلامی اخلاق اپنی قوم کے لیے ہی نہیں ساری اقوام کے لیے، ساری دنیا کے انسانوں کے لیے عدل، احسان، ایثار، خدمت اور محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ اسلامی اخلاق تو کجا ہم بنیادی اخلاق سے بھی من حیث القوم بڑی حد تک محروم ہیں۔ اور یہی ہمارے زوال کا سبب ہے، ہمیں ایمان کی روشنی، علم کی قوت اور کردار کی توانائی کی ضرورت ہے اور یہی اسلام کا تقاضا ہے۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

احترام استاد

صدر : حضرات! اس مذاکرے کا موضوع ہے، احترام استاد، یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ استاد کی عزت کرنی چاہیئے - آج ہمیں اس امر پر غور کرنا ہے کہ اساتذہ کی عزت کیوں کرنی چاہیئے- ان کی عزت کرنے اور نہ کرنے کے فوائد اور نقصانات کیا ہیں؟ سب سے پہلے میں اکرم سے درخواست کروں گا کہ وہ اس موضوع پر گفتگو کا آغاز کریں۔

اکرم معزز سامعین! احترام استاد کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ بڑوں بڑوں نے اپنے استادوں کا احترام کیا ہے اور اس طرح کیا ہے کہ اس کی مثال قائم کر دی ہے۔ مشہور یونانی فلسفی ارسطو سکندر اعظم کا استاد تھا۔ سکندر اپنے استاد ارسطو کی کتنی قدر و منزلت کرتا تھا- اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک جشن فتح کے موقع پر اس کے استاد ارسطو کو دربار میں آنا تھا- جب ارسطو کے آنے کی اطلاع سکندر کو ہوئی تو وہ خود ننگے پاؤں دربار سے بہت دور اس کے استقبال کے لیے گیا اور اس کو عزت و احترام سے دربار میں لایا - اس طرح کہ ارسطو آگے آگے تھا اور سکندر اس سے ایک قدم پیچھے، ادب سے سر جھکائے چل رہا تھا- دربار میں بھی اس نے ارسطو کو مسند پر بٹھایا اور خود اس کے قدموں میں بیٹھا- دربار کے بعد مصاحبوں نے سکندر سے پوچھا کہ حضور اتنی عزت تو آپ اپنے باپ فیلقوس کی بھی نہیں کرتے تھے- ایک بوڑھے فلسفی کو یہ مرتبہ دینے کا سبب کیا ہے۔ یہ سن کر سکندر نے کہا- میرے باپ نے مجھے فانی جسم دیا۔ جو میرے مرنے کے ساتھ فنا ہو جائے گا- لیکن میرے استاد نے مجھے وہ ذہن دیا وہ کردار دیا- جو کبھی فنا نہیں ہو گا اور رہتی دنیا تک میرے نام کو زندہ رکھے گا۔

انور موجودہ زمانے کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔

صدر فرمائیے۔

انور : یہ واقعہ علامہ اقبالؒ سے متعلق ہے۔ علامہ اپنے استاد مولوی میر حسن سے بے انتہا عقیدت رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ سیالکوٹ میں رحیما عطار کی دکان پر کھڑے حقہ پی رہے تھے کہ یکایک مولوی صاحب ادھر آ نکلے اقبال نے حقے کو وہیں چھوڑا اور بھاگ کر ان کے پیچھے ہو لیے۔ اس وقت وہ زرد وزی کے کام کی سلیم شاہی جوتی پہنے ہوئے تھے، بھاگ دوڑ میں ایک جوتی پاؤں سے نکل گئی۔ علامہ نے اس کی پرواہ نہیں کی اور اسی طرح بڑے ادب سے سر جھکائے مولوی صاحب کو ان کے گھر کے دروازے تک چھوڑ کر واپس آئے اقبال اس زمانے میں ایم اے کے طالب علم تھے اور بہت ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے۔ رحیمے عطار کو یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا۔ اس نے پوچھا تو کہا۔ رحیمے تجھے کیا معلوم کہ شاہ صاحب کا مرتبہ کیا ہے۔

مولوی صاحب سے علامہ کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۲۳ء میں جب علامہ کو سر کا خطاب ملنے لگا تو گورنر پنجاب نے علامہ سے شمس العلماء کے خطاب کے لیے کوئی نام مانگا۔ علامہ نے فوراً مولوی صاحب کا نام پیش کر دیا۔ گورنر نے پوچھا مولوی صاحب کی کوئی تصنیف بھی ہے۔ علامہ اقبال نے بے ساختہ جواب دیا۔ "ان کی سب سے بڑی تصنیف میں خود ہوں، جسے گھر بلا کر سر کا خطاب دیا جا رہا ہے احترام استاد کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

اشرف : اس میں کوئی شک نہیں کہ مولوی میر حسن بڑے پائے کے استاد تھے۔ اقبالؒ ہی کی طرح ان کے ایک دوسرے شاگرد رکن الدین بھی جو سیشن جج تھے ان کی اتنی عزت کرتے تھے کہ جب ملاقات سے فارغ ہو کر جاتے تو الٹے پاؤں

چل کر جاتے تا کہ مولوی صاحب کی طرف پیٹھ نہ ہو۔ ان کا ایک سکھ شاگرد نہال سنگھ سیالکوٹ کا ڈپٹی کمشنر ہو گیا تھا جب کبھی وہ گاڑی میں جا رہا ہوتا اور مولوی صاحب پر نظر پڑتی تو فوراً گاڑی رکوا کر نیچے اتر آتا اور ادب سے ان کے پیچھے چلتا۔ مولوی صاحب کے سامنے وہ کبھی گاڑی میں سوار نہ ہوتا۔

صدر : سبحان اللہ، کس پائے کے استاد تھے اور کیسے سعادت مند شاگرد تھے۔ یہ مثالیں احترام استاد کی تھیں۔ اب ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ احترام استاد کیوں ضروری ہے۔ عرفان آپ کچھ روشنی ڈالیں۔

عرفان : احترام استاد کیوں ضروری ہے۔ اس کا جواب وہی ہے جو سکندر نے دیا تھا استاد ہمیں دنیا کی سب سے قیمتی چیز دیتا ہے۔ ہمیں آدمی سے انسان بناتا ہے استاد ہماری تربیت کرتا ہے۔ یہ بہت بڑا احسان ہے، کرم ہے، اس لیے شکر گزاری کے طور پر اساتذہ کی عزت کرنی چاہیئے۔

صدر : اختر، آپ کا کیا خیال ہے؟

اختر : میں سمجھتا ہوں کہ بات اس سے بھی آگے ہے۔ استاد علم کی سمبل یا علامت ہے استاد کی عزت اصل میں علم کی عزت اور منزلت ہے جو استاد کی عزت نہیں کرتا اصل میں وہ علم اور روشنی کو مسترد کرتا ہے اسی لیے کہا گیا ہے جو طالب علم استاد کی عزت نہیں کرتا وہ کبھی علم حاصل نہیں کر سکتا۔ با ادب بانصیب، بے ادب بے نصیب۔

صدر : ہمیں کھوج تو اس بات کا لگانا ہے کہ استاد کی عزت کرنے سے علم کیوں بڑھتا ہے اور عزت نہ کرنے سے علم کیوں گھٹتا ہے۔

عارف : میں عرض کرتا ہوں۔

صدر : فرمائیے۔

عارف : اس کا نفسیاتی نکتہ ہے کہ جو طالب علم استاد کی عزت کرتا ہے اس کو صحیح معنوں

میں علم کی طلب ہوتی ہے اور جب کوئی طالب علم اپنے استاد کی سچے دل سے عزت کرتا ہے تو اس کا دل خوش ہوتا ہے اور وہ اسے شوق اور محبت سے پڑھاتا ہے۔ اس طرح طالب علم مزید فائدہ اٹھاتا ہے، اس لیے عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جو طالب علم جتنا زیادہ اساتذہ کا احترام کرتا ہے اتنا زیادہ وہ اچھا طالب علم ہوتا ہے اور زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ گویا اساتذہ کی عزت کرنے کا سب سے زیادہ فائدہ طلباء کو پہنچتا ہے۔ اگر کسی استاد کی صحیح طور پر عزت نہ کی جائے تو اس کا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ اس کا رویہ سخت ہو جاتا ہے۔ کلاس کی فضا میں کھچاؤ آ جاتا ہے اور پھر نہ استاد اچھی طرح پڑھا سکتا ہے اور نہ پڑھنے والے اچھی طرح پڑھ سکتے ہیں۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ بعض کم سمجھ، بدنصیب طالب علم اساتذہ کی خاطر خواہ عزت نہ کر کے نہ صرف اپنا اور دوسروں کا تعلیمی نقصان کرتے ہیں بلکہ ایک گناہ کے مرتکب بھی ہوتے ہیں۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جو ماں کا نافرمان ہو اور اساتذہ کی عزت نہ کرے وہ دنیا میں کبھی پنپ نہیں سکتا۔

صدر : عارف صاحب نے بڑے اچھے نکتے پیدا کیے اور بڑی خوبصورتی سے احترام استاد کی نفسیاتی توجیہہ کی ہے۔ میں اس میں صرف اتنا اضافہ کر دوں گا کہ استاد کی تعظیم و تکریم اظہار شکر گزاری کا ایک طریقہ بھی ہے اور ایک بہت بڑی سعادت ہے۔

میں اس سے متفق ہوں۔ استاد تو [illegible]

سقراط کی موت

میزبان تفکر اور تدبر کو تعلیم کے عمل میں بنیادی اہمیت حاصل ہے اور تفکر و تدبر کی تاریخ میں پہلا بڑا نام یونان کے عظیم فلسفی سقراط کا ہے۔ اسی عظیم فلسفی اور عظیم تر انسان۔ سقراط پر ایک فیچر پیش کیا جاتا ہے۔ جا رہا

اس فیچر کے دو حصے ہیں۔ پہلے سقراط کے بارے میں ضروری معلومات ایک مکالمے کی صورت میں پیش کی جائیں گی۔ پھر سقراط کی موت کا منظر اسٹیج کیا جائیگا۔

تو حضرات پیش خدمت ہے سقراط کے بارے میں ایک معلوماتی مکالمہ۔

س : سقراط کب اور کہاں پیدا ہوا؟

ج : سقراط ۴۶۹ قبل مسیح میں یعنی اب سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے یونان کے شہر ایتھنز میں پیدا ہوا۔

س : اس کے خاندان اور ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتلایئے۔

ج : سقراط کا باپ سنگ تراش تھا۔ گویا اس کا تعلق ایتھنز کے اونچے طبقے سے نہ تھا سقراط نے بھی کچھ عرصے سنگ تراشی کی۔ اس کی رسمی تعلیم زیادہ نہ تھی۔ اس نے اپنے ذوق و شوق سے فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔

س : سقراط کے بارے میں کوئی اور اہم بات؟

ج : یہ کہ اتنے عظیم ذہن اور اتنی حسین روح کا حامل یہ غیر معمولی انسان جسمانی وجاہت

سے قطعاً عاری تھا۔ گہرا سانولا رنگ دوہرا جسم، پستہ قد، چہرے کے خدوخال بھدے اور چال بیڈھنگی۔ یہ ظاہری حالت تھی اس شخص کی جو فلسفیوں کا فلسفی تھا۔ اس کی ازدواجی زندگی بھی ایک امتحان تھی جس پر وہ پورا اترا۔

س : وہ کیسے؟

ج : وہ اس طرح کہ اس کی بیوی زنوبے بہت ہی بدمزاج اور پھوہڑ عورت تھی اس نے اس کے ساتھ بڑے صبر و تحمل سے گزارا کیا۔ جب کسی نے اس سے زنوبے کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔ اس نیک بخت نے مجھے بالواسطہ طور پر ضبط و صبر کرنا سکھایا۔

س : کیا علم و دانش کے علاوہ بھی اسے کوئی امتیاز حاصل تھا؟

ج : جی ہاں۔ وہ ایک آزمودہ کار اور بہادر سپاہی بھی تھا۔ اس نے ایتھنز کی طرف سے ۴۲۴ قبل مسیح میں ڈیلیئم کی لڑائی میں داد شجاعت دی۔ پھر ۴۲۲ قبل مسیح میں وہ ایفی پولیس کے مقام پر لڑا۔ اس کے بعد اس نے اپنی ساری توانائی اور توجہ روشنی کی تلاش پر مرکوز کر دی۔ لیکن وہ ایک عملی دانشور تھا اس نے عملی طور پر بھی اخلاقی اصولوں کی برتری کے لیے جدوجہد کی۔

س : وہ کیسے۔ اس کی کوئی مثال؟

ج : ۴۰۶ قبل مسیح کی ایک بحری جنگ میں ایتھنز کی فوجوں کو شکست ہوئی۔ ایتھنز کے شہری اپنے شکست خوردہ دس جرنیلوں کو سزائے موت دینا چاہتے تھے۔ چونکہ وہ ان کے خیال میں جنگ کے مقتولوں کو مناسب طریقے سے دفن کرنے میں ناکام رہے تھے۔ سقراط نے اصولی طور پر اس اقدام کی مخالفت کی اور اس طرح ایتھنز کی حکومت کی ناراضگی مول لی اس کے بعد جب تیس جابروں کا ٹولہ برسر اقتدار آیا تو سقراط ان آمروں سے بھی ٹکرایا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے موت کے گھاٹ

آثار تے وہ خود معزول کردیئے گئے۔

س : سقراط کے فلسفہ کا لب ولباب کیا ہے ؟

ج : سقراط نے کوئی تحریر کوئی کتاب نہیں چھوڑی۔ اس کے افکار و خیالات اس کے نامور شاگرد اور فلسفی افلاطون کی تحریروں اور کتابوں خاص طور سے مکالمات میں ملتے ہیں۔ اپنے آپ کو پہچانو Know Thyself اس کے فلسفے کا بنیادی نکتہ ہے۔ اس کا خیال تھا کہ نیکی Virtue کی بنیاد علم Knowledge ہے اور بدی کی جڑ جہالت Ignorance وہ کہا کرتا تھا دراصل کوئی بھی آدمی بنیادی طور پر برا نہیں ہوتا۔

اس لیے وہ حصول علم کو روشنی کی تلاش کو وہ افضل ترین عمل کہتا ہے۔

س : اس کا طریق تعلیم کیا تھا؟

ج : وہ ایتھنز کی راہوں اور شاہراہوں پر گھومتا رہتا اور زیادہ نوجوانوں سے روح اور اخلاق پر گفتگو کرتا۔ وہ انجان بن کر ان پر سوال پہ سوال کرتا اور اس طرح کسی اخلاقی مسئلہ کو واضح کرتا۔ یہ طریقہ اب Socratic Method سقراطی طریقے کے نام سے مشہور ہے۔

س : اسے زہر کا پیالہ کیوں پینا پڑا؟

ج : وہ تلاش حق، سچائی، اخلاقی اصولوں کی برتری کی تعلیم دیتا تھا۔ جو بالواسطہ طور پر ایتھنز کی کرپٹ Corrupt حکومت اور برسراقتدار طبقہ کے لیے ایک چیلنج اور خطرہ بنتی جا رہی تھی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ ایتھنز کے نوجوان اس سے بہت متاثر تھے۔ اس طرح یہ بوڑھا فلسفی جو ٹھہر ٹھہر کر پُرسکون لہجہ میں بات کرتا تھا ارباب اقتدار کی نگاہ میں ایک باغی اور انقلابی کے طور پر کھٹکنے لگا تھا۔

س : اس کشمکش کا انجام کیا ہوا؟

ج : ایتھنز کی حکومت نے اس پر مقدمہ چلایا اور اسے موت کی سزا دی۔

س : اس پر خاص الزام کیا تھا؟

ج : یہ کہ وہ دیوتاؤں کا باغی ہے اور نوجوانوں کو گمراہ کرتا ہے۔

س : اس کی موت کس طرح واقع ہوئی۔

ج : ایتھنز میں دستور تھا کہ جس کو موت کی سزا دی جاتی اسے ہیملاک نامی ایک بوٹی کا رس ایک پیالہ میں بھر کر سورج غروب ہونے کے بعد پینے کو دیا جاتا۔ ہیملاک کا زہر آہستہ آہستہ اثر کرتا۔ پہلے پیر بھاری ہوتے، پھر دھڑ، آخر کار قلب متاثر ہوتا اور قیدی کی موت واقع ہوجاتی۔ سقراط کو بھی اسی زہر کا پیالہ پینا پڑا تھا۔

موت کا منظر

میزبان : حضرات، تصور کیجیے کہ یہ جگہ ۳۹۹ قبل مسیح میں ایتھنز کی ایک کھلی جیل کا ایک گوشہ ہے۔ اور شام کا وقت کچھ دیر میں سورج ڈوبنے کے بعد سقراط کو ہیملاک کے زہر کا پیالہ پیش کیا جائیگا۔ سقراط کے بہت سے مداح نوجوان اسکو آخری سلام کرنے کیلئے جمع ہیں جن میں ان کے چہیتے خادم زینوفن کے علاوہ اسکا دوست اور نیاز مند کریٹو بھی شامل ہے

ایک نوجوان : اگر آپ چاہتے تو از روئے قانون آپ اپنے لیے خود سر جلاوطنی کی سزا تجویز کر سکتے تھے۔ جسے عدالت فوراً قبول کرلیتی۔ آپ کا حریف خاص میلیٹس .. بھی چاہتا ہے۔

سقراط : میرے نوجوان ہمدرد، مجھے معلوم ہے کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ میری تعلیم کو اپنے اقتدار کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ ہر قیمت پر مجھے اپنے راستہ سے ہٹانا چاہتے ہیں اس لیے میں نے خود اپنی وکالت کرنا ضروری سمجھا۔ عدالت میں میرا بیان تم نے سنا ہوگا میں مر جاؤں گا لیکن یہ آواز اخلاق زندہ رہے گی۔ صدیوں، صدیوں بعد بھی۔

کریٹو : اے عظیم دانشور ہم آپ کو کھونا نہیں چاہتے۔ ابھی ہمیں آپ کی ضرورت ہے ایتھنز کو آپ کی ضرورت ہے شہریوں کی مجلس کے ظلم سے نجات دلانے کا راستہ میں نے اور میرے دوستوں نے نکال لیا ہے۔

فیڈو : وہ کیا؟

کریٹو : ساحل پر خفیہ کشتیاں تیار کھڑی ہیں۔ ہمارے گرم خون کے لیے یہاں سے اپنے باپ کو نکال لے جانا کیا مشکل ہے۔

زینوفن : ہاں۔ میرے آقا یہ اچھی ترکیب ہے۔

سقراط : میرے دوستو! ریاست کے قانون کا احترام بہر طور لازم ہے یاد رکھو سچائی کیلئے جان دینا۔ سچائی کے لیے بھاگ جانے سے بہتر ہے۔

جیل کا داروغہ : اے بوڑھے فلسفی، سورج غروب ہو رہا ہے میں نے ہلاک تیار کر لیا ہے آپ تیار ہو جائیں جس کسی سے کچھ کہنا سننا ہو کہہ لیں۔

مجھے افسوس ہے! مجھے افسوس ہے!!

سقراط : تمہیں افسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم صرف اپنے فرائض کو بجا لا رہے ہو۔ تم ایک اچھے شہری ہو۔

زینوفن : میرے آقا (روتے ہوئے) اب کیا ہو گا۔

سقراط : حوصلہ رکھو، میرے بچے

داروغہ : یہ لیجئے (پیالہ دیتا ہے)

سقراط : سورج چھپتے ہی تم پیالہ لے آئے۔ تم نے اچھا کیا۔ تم فرض شناس ہو اچھے شہری بہت اچھے شہری۔ (آہستہ آہستہ پیتا ہے)

زینوفن : جی میرے آقا۔

سقراط : مجھے یاد پڑتا ہے کہ بہت دن ہوئے میں نے دیوتاؤں کی ایک منت مانی تھی

تم ایک جانور قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دینا۔ (کئی نوجوان سسکیاں بھرتے ہیں۔ سقراط بھاری قدموں سے چل رہا ہے)

دوستو،

(حاضرین کو مخاطب کر کے) میری آخری بات سنو، اپنے آپ کو پہچانو سچائی کو تلاش کرتے رہو۔ روشنی کا سفر جاری رکھو۔ (پردہ گرتا ہے)

پس منظری آوازیں

سقراط مر گیا۔

سقراط زندہ ہے۔

سعادت، سیادت، عبادت ہے علم
حکومت ہے دولت ہے، عافیت ہے علم
یہ پوچھو کسی مرد محنتار سے
قلم تیز چلتا ہے تلوار سے
نہ پھولوں کی سیجوں سے آتا ہے علم
نہ ورثے میں انسان پاتا ہے علم

سقراط سکول میں

میزبان: سوچنا سکھانا یا تفکر کی صلاحیت کو پروان چڑھانا بھی تعلیم کے مقاصد میں سے ایک بنیادی مقصد ہے۔ خود قرآن حکیم میں "افلا تدبرون" کے سے فقرے بار بار آتے ہیں۔ بغیر تدبر و تفکر کے ذہن کی تخلیقی قوتیں بیدار نہیں ہو سکتیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ طلبا میں تفکر و تدبر کا ذوق پیدا کیا جائے اس مقصد کے حصول

کے لیے آج ہم ایک خصوصی مذاکرہ کا اہتمام کر رہے ہیں۔ جس کا عنوان ہے سقراط سکول میں ـــ سب سے پہلے میں اپنے استاد عبدالحکیم صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ مذاکرہ کے عنوان کی معنویت پر اظہارِ خیال کریں۔

عبدالحکیم : عنوان میں سقراط کا حوالہ ہے۔ سقراط چوتھی صدی قبل مسیح کا مشہور یونانی فلسفی تھا۔ جسے فلسفہ کا بانی مبانی کہا جاتا ہے وہ کہا کرتا تھا کہ میں سچائی کا متلاشی ہوں سچائی کی تعلیم دینے کے لیے اس نے ایک انوکھا طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ انجان بن کر لوگوں سے سوال کیا کرتا تھا اور سوال در سوال کے طریقے سے لوگوں کو اچھائی برائی کا احساس دلاتا تھا۔ اس طرزِ تعلیم کو سقراطی طریقہ تعلیم کہتے ہیں۔ سقراط کی روشنی پھیلانے کی ان سرگرمیوں کو ایتھنز کی حکومت نے پسند نہیں کیا۔ چنانچہ ۳۲۹ قبل مسیح میں اسے زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ مشہور یونانی فلسفی افلاطون سقراط ہی کا نامور شاگرد تھا۔ افلاطون کا شاگرد ارسطو بھی بڑا مفکر اور سائنس دان تھا۔

میزبان : ہر طالب علم چھوٹا سا سقراط یا تلاشِ حق کا مسافر ہوتا ہے۔ اس مذاکرے میں سقراطی طریقے سے تفکر و تدبر کی چند مشقیں پیش کی جائیں گی۔

اس مذاکرے میں سقراط کا کردار فہیم ادا کر رہے ہیں اور نعیم افلاطون بنے ہیں۔

فہیم : مختار مسعود کی کتاب آوازِ دوست میں ایک فقرہ میری نظر سے گزرا تھا۔ نئی بنیادیں وہی لوگ بھر سکتے ہیں جو اس راز سے واقف ہوں کہ پرانی کیوں بیٹھ گئیں۔ آپ کا اس فقرے کے بارے میں کیا خیال ہے؟

نعیم : بڑا خیال انگیز اور خوب صورت فقرہ ہے۔

فہیم : کس طرح؟

نعیم : بات بھی گہری ہے اور کہنے کا انداز بھی اچھا ہے۔

فہیم : گہری بات کس طرح ہے؟

نعیم : اس طرح کہ اس میں ہر صورت حال کا تجزیہ کرنے کو کہا گیا ہے۔ خصوصاً ناکامی کی صورت میں۔ اگر پچھلی ناکامی کا تجزیہ نہ کیا جائے۔ اس کے اسباب پر غور نہ کیا جائے تو آئندہ حالات کو بہتر بنانے کی جو کوشش بھی کی جائے گی خواہ وہ کتنی مخلصانہ ہی کیوں نہ ہو وہ بارور نہیں ہوگی۔ بار آور

فہیم : اس کی آپ کوئی مثال دے سکتے ہیں۔

نعیم : اس کی دو مثالیں میرے ذہن میں آ رہی ہیں۔
پہلی تو یہ، کہ اگر کوئی طالب علم کسی امتحان میں فیل ہو جائے تو اسے ٹھنڈے دل اور کھلے ذہن سے اپنی ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کرنا چاہیے۔ اسی طرح خواہ ڈسپلن کا کوئی مسئلہ ہو یا معاشرہ کی خرابی ہو، اس کی جڑ تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

میزبان : شکریہ۔ آپ دونوں حضرات کا شکریہ۔ اب دوسری ٹیم کی باری ہے رفیع اور رفیق اس مشق میں حصہ لیں گے۔

رفیع : ایک کتاب ہے مشہور بڑی جنگیں، اس میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ایران کی مہم میں ایک موقعہ پر سکندر کے چیف آف اسٹاف نے اسے دشمن پر شبخون مارنے کا مشورہ دیا۔ جو نوجوان سکندر نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ میں فتح کو چرانا نہیں چاہتا۔ رفیق آپ مجھے بتائیں کہ سکندر نے یہ کیوں کہا۔ رَد

رفیق : جب اس نے کہا کہ میں فتح کو چرانا نہیں چاہتا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ دشمن کا سامنے آ کر مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔

رفیع : کیوں؟ اولوالعزم

رفیق : اس لیے کہ وہ بڑا اولوالعزم تھا۔ جرأت مند تھا اور غالباً جنگ کے فن کے لحاظ سے بھی اس کا خیال تھا کہ دشمن کا آمنے سامنے مقابلہ کر کے اس کو زیادہ

نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔

میزبان : آخر میں میں جمال اور کمال سے کہوں گا کہ وہ اقبالؒ کے اس فقرہ کو موضوع گفتگو بنائیں کہ:

سوال سے خودی ضعیف ہوتی ہے

جمال : خودی کے ضعیف ہونے کا کیا مطلب ہے؟

کمال : یہ فقرہ علامہ کی فارسی مثنوی اسرار خودی سے لیا گیا ہے اس سے اقبالؒ کے فلسفہ خودی کی ترجمانی ہوتی ہے۔

جمال : وہ کیسے؟

کمال : کسی سے کچھ مانگنا خودداری کے منافی ہے۔ اس سے اس طرح خودی مجروح ہوتی ہے۔

جمال : کیوں؟

کمال : خودی کا مطلب ہے اپنے اوپر اعتماد، اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ اپنی قوتوں کو فروغ دینے کی کوشش۔ سوال کرنے یا مانگنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ آدمی کو اپنی ذات، اپنی صلاحیت، اپنی اہلیّت پر اعتماد نہیں اور اسے اپنی عزت نفس کا احساس نہیں۔ اسی خیال کو اقبال نے ارمغانِ حجاز کی نظم ، بڈھے بلوچ ، کی نصیحت میں بھی بیان کیا ہے۔

جمال : وہ شعر کیا ہے۔

کمال : غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاج سر دارا

میزبان اس شعر پر تدبّر و تفکّر کی یہ محفل ختم ہوتی ہے۔

سائنس کی محفل

میزبان : مسدس حالی میں، حالی نے مسلمانوں کے دور عروج کے بارے میں لکھا ہے۔

ہر اک میکدہ سے بھرا جا کے ساغر ہر اک گھاٹ سے آئے سیراب ہو کر
گرے مثل پروانہ ہر روشنی پر گرہ میں لیا باندھ حکم پیغمبر
کہ حکمت کو گم شدہ مال سمجھو جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو

حکمت، سائنس اور فلسفہ کا مطالعہ مسلمانوں پر فرض ہے۔ بغیر سائنس اور حکمت کے مسلمان کی تعلیم مکمل نہیں ہوتی۔ اس لیے سائنسی مطالعے کو ہمارے اسکول میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔

اس سمت میں پہلا قدم یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہو کہ سائنس کے میدان میں مسلمان سائنسدانوں اور موجدوں نے کیا کیا کارنامے انجام دیئے ہیں۔ چنانچہ سائنس کی اس محفل میں چند مشہور سائنس دانوں اور موجدوں کا تذکرہ کیا جائے گا۔

اکرم : سائنس کی بنیاد مشاہدے اور تجربے پر ہے۔ سوشل سائنسز میں پہلا مشہور نام نویں صدی عیسوی کے یعقوبی کا ہے، احمد بن ابی یعقوب اسلامی دنیا کا پہلا جغرافیہ نویس ہے۔ جس کی کتاب اسماء البلدان ان اٹھارویں صدی عیسوی تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں جغرافیے کے نصاب کی حیثیت سے پڑھائی جاتی رہی۔

انور : دسویں صدی کا ابن مسکویہ وہ نامور مسلمان سائنسدان ہے جس کی کتاب تہذیب الاخلاق نظریہ ارتقاء Theory of Evolution پر بنیادی کام کی حیثیت رکھتی ہے۔ ابن مسکویہ کی دوسری دریافت سمندر کے مدوجزر کے متعلق تھی۔

اشرف : ابن الہیثم دسویں صدی کا یہ مسلم سائنسدان یوروپ میں بھی علم المناظر کا امام تصور کیا جاتا ہے۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے شیشوں، آئینوں اور پانی سے گزرنے وقت روشنی کے انعطاف پر تجربے کیے۔

اشعر — جابر ابن حیان (زمانہ ۷۲۱ تا ۸۰۲) یورپ میں بابائے کیمیا کے لقب سے مشہور ہوا۔ جابر پہلا کیمیا دان ہے جس نے کیمسٹری کو جوہری نظریئے سے قریب کیا۔

اجمل — الخوارزمی۔ نویں صدی کا محمد ابن موسیٰ خوارزمی ریاضی اور ہیئت کے علوم کا امام ہے۔ کیپلر اور کوپرنیکس نے خوارزمی کے ہی کام سے فائدہ اٹھایا۔

اکبر — الکندی۔ یعقوب بن اسحاق بن حسام کندی۔ یونانی اور ہندی زبان اور فلسفے کا عالم تھا اس کا زمانہ نویں صدی ہے۔ کندی ارسطو کے فلسفے کا فاضل تھا اس نے علم طبعیات میں روشنی کی عددی شاخ پر بہت کام کیا۔

احمر — الطبری، نویں صدی کا ابو موسیٰ علی بن طبری، طب، فلسفہ، ہیئت کا ماہر تھا۔ اس کی کتاب فردوس الحکمۃ، اسلامی طب پر سب سے قدیم اور مستند کتاب ہے۔

اصغر — رازی دسویں صدی کا (۹۲۵-۸۶۴ء) ابوبکر محمد ابن الزکریا الرازی دنیا کے پہلے طبی۔ انسائیکلوپیڈیا الحاوی کا مصنف اپنے دور کا سب سے بڑا طبیب تھا۔ علم کیمیا اور فلسفے میں بھی اسے دخل تھا۔

ابرار — الفارابی (زمانہ ۹۵۰۔۸۷۰ء) ابونصر محمد بن محمد الفارابی بے نظیر حکیم اور طبیب ہونے کے علاوہ موسیقی کا ماہر بھی تھا۔

اسلم — الزہراوی (زمانہ ۱۰۰۴-۹۳۶) ابوالقاسم بن ابن العباس الزہراوی اسلامی دنیا ہی کا نہیں بلکہ پوری دنیا کا پہلا نامور سرجن ہے جس نے انسانی اعضا کی تحقیق کے لیے پوسٹ مارٹم کی ضرورت پر زور دیا اور سرجری کی پہلی کتاب لکھی۔

اسد — البیرونی (زمانہ ۱۰۴۸-۹۷۳ء) کتاب الہند کا مشہور مصنف ابوالریحان محمد ابن احمد البیرونی علم ہیئت کا عالم تھا۔

ارشد — بوعلی سینا (۱۰۳۷-۹۸۰ء) تھرمامیٹر کا موجد اور القانون کا مصنف بوعلی الحسین ابن عبداللہ طب اور فلسفے کا امام تھا۔

انعام — عمر خیام (۱۱۲۳-۱۰۳۸) ابوالحسن عمر بن ابراہیم الخیام فلسفے اور ہیئت میں اونچا مقام رکھتا تھا۔

قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے

میزبان : احادیث پاک ہمارے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہیں ان کی عقلی توجیہہ کرنا لازمی نہیں ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔ لیکن اگر احادیث کی حکمتوں کو سمجھنے کی بھی کوشش کی جائے تو انہیں زندگی کی گوناگوں صورتوں پر منطبق کرنے میں آسانی ہوگی اور اس طرح حدیثوں سے روشنی حاصل کرنے کا دائرہ بہت وسیع ہو جائے گا۔

اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے مذاکروں کا یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔

آج جس حدیث کو مطالعہ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ وہ صحیح بخاری و مسلم کی وہ مشہور حدیث ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ انسان اس وقت تک مومن نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی اسی چیز کو پسند نہ کرے جسے وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

اس پر تدبر و تفکر کے لیے میں سب سے پہلے شفیع صاحب کو دعوت دیتا ہوں۔

شفیع : پہلی بات تو یہ ہے کہ جس قسمیہ انداز سے یہ حدیث شروع ہوتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے اس حدیث پر بہت زور دینا مقصود ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں کردار کو ایمان کا حوالہ بنایا گیا ہے یعنی اصل میں مومن وہ ہے جس کا سماجی رویہ احسان اور ایثار کا ہو۔ جو دوسرے مسلمانوں کے مفاد کو اپنے مفاد کی طرح ملحوظ رکھے۔

میزبان آخر کیوں؟ اس کی بھی وضاحت کیجئے؟

شفیع دیکھئے اس مسئلہ کے تین پہلو ہیں۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کا بھلا کیوں چاہے۔ اگر چاہے تو اس میں اس کا بھلا کیا ہے۔ اگر نہ چاہے تو اس

کا نقصان کیا ہو گا۔

میزبان طامس ہابس وغیرہ مغربی فلسفیوں کا تو خیال ہے کہ انسان فطری طور پر خود غرض ہے۔ وہ سب سے پہلے اپنے فائدے کے بارے میں سوچتا ہے۔ اس کی تگ ودو اپنے مفاد کے تابع ہوتی ہے۔

شفیع یہ محض ایک مفروضہ ہے جس کو بنیاد بنا کر ایڈم اسمتھ وغیرہ نے مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام اور نوآبادیاتی مہم جوئی کو فلسفیانہ جواز مہیا کیا۔ یہاں اس بحث میں الجھنے کا موقع نہیں۔ ہم مسلمان انسانی فطرت کے اس تصور کو صحیح نہیں مانتے۔ ہاں یہ درست ہے کہ انسان میں خیر وشر دونوں کی صلاحیت موجود ہے اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے میں پہلے اس سوال کا جواب دوں گا کہ دوسرے مسلمان بھائی کا بھلا چاہنا کیوں ضروری ہے۔ اس لیے کہ ایسا کرنا توحید پر ایمان کا تقاضا ہے۔ جب خالق ایک ہے تو اس کے سارے بندے حیاتیاتی طور پر اور اخلاقی طور پہ اخوت کے رشتے میں بندھ جاتے ہیں۔ بنی آدم اعضائے یک دیگر اند۔ انسان آپس میں ایک ہی جسم کے اعضا کی طرح ہیں۔ اس حوالے سے دوسرے انسانوں کا بھلا چاہنا اخلاقی فرض ہی نہیں عقلی اور منطقی تقاضا بھی ہے اب میں دوسرے سوال کی طرف آتا ہوں کہ دوسرے کے مفاد کو ملحوظ رکھنے میں فائدہ کیا ہے؟ اس کا جواب تو واضح ہے کہ ایسا کرنا ایک سماجی ضرورت ہی نہیں ہر شخص کے اپنے دوررس مفاد میں بھی ہے۔ جو دوسرے کے مفاد کو ملحوظ رکھے گا۔ وہ اس کے مفاد کا خیال رکھے گا۔ اس طرح باہمی اعتماد اور مروت کی فضا پیدا ہوگی۔ جس سے آخر کار سب کو فائدہ ہو گا۔ یہاں فائدے سے مراد مادی فائدہ ہی نہیں ذہنی اطمینان اور نفسیاتی طور پر تحفظ کا احساس ہے دوسرے سے بھلائی کر کے خودی قوی ہوتی ہے۔ ہر صحیح کام کر کے خصوصاً

احسان و ایثار کر کے انسان کی خودی کو تقویت پہنچتی ہے جو بھلا کرتا ہے ہمدردی اور دردمندی کا رویّہ اختیار کرتا ہے وہ دوسرے انسانوں سے محنت کے رشتے میں جڑ جاتا ہے۔ اسے کبھی نفسیاتی تنہائی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

میزبان دوسرے کا بھلا نہ چاہنے میں نقصان کیا ہے؟

شفیع ایک خودغرضی دوسری خودغرضی کو جنم دیتی ہے جو شخص دوسروں کے مفادات کا لحاظ نہیں کرتا دوسرے اس کے مفاد کو پس پشت ڈال دینے میں دیر نہیں کرتے۔ اس لیے انصاف کرنا ایک سماجی اور سیاسی ضرورت تو ہے ہی لیکن احسان اور ایثار کے رویے کی بھی عملی ضرورت بھی کم نہیں۔ جس معاشرہ میں یا سماجی گروپ میں باہمی مروت کا برتاؤ زیادہ ہوتا ہے اس کے افراد اپنے آپ کو زیادہ محفوظ محسوس کرتے ہیں۔ نتیجتاً ایک دوسرے سے اور زیادہ تعاون کرتے ہیں۔ دنیا کے دوسرے معاشرے انصاف کو بنیاد بنانے کا دم بھرتے رہیں۔ اسلام انصاف سے بہت آگے جاکر احسان اور ایثار کو تعلقات کی بنیاد بناتا ہے۔

میزبان : اب میں عقیل صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اسکول کی زندگی کے حوالے سے مثالوں کے ذریعے واضح فرمائیں کہ اس حدیث کو ہم طلبہ کہاں کہاں یاد رکھیں۔

عقیل : یہ آپ نے بہت اہم سوال پوچھا ہے۔ احادیث نبوی اور آیات الٰہی کو صرف جاننا ہی کافی نہیں ان کا مفہوم اور منشا سمجھ کر ان کو روزانہ کی زندگی میں منطبق کرنے ہی سے ان سے پورا استفادہ کیا جا سکتا ہے مثلاً اس حدیث کو اسکول اور کالج کی زندگی میں سامنے رکھا جائے تو اس سے طلبہ کی زندگی بہت خوشگوار ہو سکتی ہے۔

میزبان : مثلاً۔

عقیل : مثلاً میں بہت چھوٹی چھوٹی باتوں کی مثال دیتا ہوں۔ کلاس میں ہر لڑکے کی

خواہش ہوتی ہے وہ آگے بیٹھے اور اچھی جگہ بیٹھے۔

میزبان : اچھی جگہ سے کیا مراد ہے؟

عقیل صاحب : اچھی جگہ سے مراد وہ جگہ ہے جو آرام دہ ہو، ڈیسک کرسی بہتر ہو موسم کے لحاظ سے بہتر ہوا۔ یعنی گرمیوں میں جہاں ہوا زیادہ آئے اور جاڑوں میں جہاں ہوا کم اور دھوپ زیادہ آتی ہو۔ اب اگر اس چھوٹی سی بات میں لڑکے ایک دوسرے کا خیال رکھیں اور جگہ بدل بدل کر بیٹھیں یا کم از کم باری باری ہر ایک کو اچھی جگہ بیٹھنے کا موقع دیں۔ تو گویا یہ حدیث کی تعمیل ہوگی۔ یہی اصول ہوسٹل کے کمروں ڈائننگ ہال۔ کھیل کے میدان غرض ہر جگہ اپنایا جا سکتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں جب ہمارا اسکول پکنک پر گیا تھا تو میں نے دیکھا کہ بعض لڑکوں نے کوشش کی کہ وہ بس میں آتے جاتے کھڑکی کی طرف بیٹھیں۔ ظاہر ہے کہ ادھر سے ٹھنڈی ہوا بھی آرہی تھی اور باہر کے نظارے بھی نظر آرہے تھے۔ اس موقع پر اس حدیث کا اطلاق اس طرح ہوتا کہ جو لڑکا ایک بار اچھی جگہ بیٹھ گیا تھا وہ دوسری بار خود وہ جگہ کسی دوسرے لڑکے کو دیتا۔ اسکول کی زندگی میں قدم قدم پر اس طرح کی صورت حال ہوتی ہے کہ اس حدیث سے روشنی حاصل کی جا سکتی ہے پھر مجھے ایک چھوٹی سی مثال یاد آئی۔ کلاس میں بعض لڑکوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لائبریری سے ضروری اور اہم کتابیں نکلوا کر غائب کر دیتے ہیں۔ اپنے اور دوسروں کے اچھے نوٹس کی دوسروں کو ہوا تک نہیں دیتے۔ یہ سب حرکتیں اس حدیث پاک کی نفی ہیں۔ یہ حدیث ایک ایسا نسخہ کیمیا ہے۔ جس سے ہماری معاشرتی زندگی میں ایک انقلاب آ سکتا ہے۔

خواہ ظالم ہو یا مظلوم

میزبان : حاضرین گرامی! آج کے مذاکرہ میں مطالعہ کا موضوع یہ حدیث ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ ایک شخص نے عرض کیا اے رسول اللہ مظلوم کی تو میں مدد کرتا ہوں مگر ظالم کی مدد کیسے کروں؟ آپ نے فرمایا۔ اسے ظلم سے باز رکھ یہی تیرا اس کی مدد کرنا ہے۔ اب میں صدر مجلس قبلہ حافظ عبداللہ صاحب سے درخواست ہے کہ وہ مذاکرہ کا آغاز فرمائیں۔

حافظ : یہ وہ مشہور حدیث ہے جو بخاری اور مسلم حدیث کی دونوں مستند کتابوں میں ہے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص حضرت انس نے روایت کیا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ حدیث سورۂ مائدہ کی ان دو آیتوں کی تفسیر ہے۔

وتعاونو علی البرو التقوی - ولا تعاونو علی الاثم والعدوان۔

یعنی نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار ہو جاؤ لیکن زیادتی اور برائی کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار نہ بنو۔

میزبان : اب میں نعمان صاحب سے عرض کروں گا کہ اس حدیث مبارکہ کی کچھ وضاحت فرمائیں۔

نعمان : یہ حدیث اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے۔

اسلام سے پہلے عربوں کے ہاں تعاون و عدم تعاون کی بنیاد قبائلی عصبیت پر تھی۔ حق و صداقت اس کا پیمانہ نہ تھا۔ وہ اپنے قبیلہ کا ساتھ دیتے تھے۔ خواہ وہ صحیح ہو یا غلط۔ اسی کا نام جاہلیت ہے۔ اسلام نے حق و صداقت کو معیار بنایا اس طرح معاشرہ میں تعاون اور عدم تعاون کا ایک ایسا عالمگیر معیار پیش کیا جس کی بنیاد حق و انصاف پر ہے۔

میزبان رحمان صاحب آپ کا کیا خیال ہے؟

رحمان میں اس پر یہ اضافہ کروں گا کہ یہ جاہلیت صرف قبل اسلام کے عربوں تک محدود نہیں۔ آجکل بھی دنیا میں قومی نسلی، لسانی اور مذہبی عصبیتیں عام ہیں اس نوع کی قوم پرستی یا نیشنلزم کے خلاف اقبال نے اتنا کچھ لکھا کہا۔ لیکن آج بھی دنیا کا اصول یہی ہے۔ مائی کنٹری رائٹ آر رانگ۔ یعنی وہی پرانی جاہلیت۔

میزبان : آخر میں محمود صاحب سے گزارش کروں گا کہ وہ طلبہ کی زندگی کے حوالے سے اس حدیث پاک پر روشنی ڈالیں۔

محمود : طلبہ میں گروپ اسپرٹ خاص طور سے بہت قوی ہوتی ہے۔ عموماً وہ اپنی ٹیم، اپنے ہاؤس، اپنے اسکول کو ہر قیمت پر جیتتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی پسند و نا پسند بھی اسی گروپ اسپرٹ کے تابع ہوتی ہے۔ زمانہ طالب علمی کے رویے بعد کو زندگی کے رویے بن جاتے ہیں۔ اس لیے تعلیمی اداروں میں حق و انصاف کے رویہ کی تربیت کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے۔ مقابلے کے کھیلوں میں اگر کسی نے فاؤل کیا ہے تو اس کے اپنے ٹیم کیپٹن کو اس کا نوٹس لینا چاہیئے۔ اسی طرح اگر دوست کوئی غلطی کرتا ہے یا کسی غلطی پر اصرار کرتا ہے تو دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو ٹوکا جائے اور اگر ضرورت پڑے اس کے خلاف گواہی بھی دی جائے۔ اسی طرح اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض طلبہ حریف ٹیم کے اچھے کھیل کی بالکل تعریف نہیں کرتے۔ ریفری اگر ان کی ٹیم کے خلاف فیصلہ دے تو اس کو برا بھلا کہتے ہیں اور اگر مخالف ٹیم کو سزا دے تو کہتے ہیں واہ واہ۔

عقیل مجھے کچھ عرض کرنے کی اجازت ہے۔

میزبان بسر و چشم

عقیل میں صرف یہ کہوں گا حق و ناحق کے رویے کی تربیت اسکول سے بھی پہلے شعوری طور

پر گھر سے شروع ہونی چاہیئے۔ جب بھی بچہ کھیل میں، پڑھنے میں لڑائی جھگڑے میں غلط رویے کا مظاہرہ کرے اس کی گرفت کی جائے اور انصاف و عدل کے رویے کی شعوری طور پر نشوونما کی جائے۔

میزبان : آپ سب حضرات کا بے حد شکریہ۔ یہ مذاکرہ یہاں ختم ہوتا ہے۔

کسی پاس دولت یہ رہتی نہیں
سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں
سدا عیشِ دوراں دکھاتا نہیں۔
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

(میر حسن)

باب سوئم

قائدِ اعظمیات

نظریۂ پاکستان منزل بہ منزل

مارچ ۱۹۴۴ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے کہا تھا۔

"پاکستان اسی روز وجود میں آگیا تھا جس دن ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا" قائدِ اعظمؒ کے اس قول میں دو قومی نظریہ کی بنیادی توجیہہ ہے۔ یہاں اس نظریہ کی ارتقائی تاریخ مختصر طور پر پیش کی جاتی ہے۔

برصغیر ہندو پاک میں مسلمانوں کی سیاسی تاریخ ۷۱۲ عیسوی میں محمد بن قاسم کے جہاد سے شروع ہوتی ہے۔ مسلمان فاتحین یہاں رہے، بسے بھی، اسے انہوں نے وطن بھی بنایا۔ ۱۸۵۷ء میں سقوطِ دہلی تک تقریباً ہزار سال انہوں نے یہاں حکومت بھی کی۔ لیکن مہاجر مسلمان اور مقامی مسلمان جو ہندو سے مسلمان ہوئے تھے۔ سماجی اور معاشرتی اعتبار سے ہمیشہ ہندوؤں سے علیٰحدہ ہی رہے وہ ہندو قومیت اور تہذیب میں کبھی جذب نہیں ہوئے۔ دو قومیتوں کے دھارے مذہبی اور تہذیبی سطح پر تیل اور پانی کی روؤں کی طرح ساتھ ساتھ تو چلتے رہے لیکن ملے کبھی نہیں۔ جب تک مسلمانوں کی سیاسی اور معاشی طاقت مضبوط رہی یہ معاشرتی اور تہذیبی علیٰحدگی کوئی مسئلہ بن کر سامنے نہیں آئی لیکن ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیبؒ کی وفات کے بعد مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا شیرازہ بکھرتے ہی ہندوؤں نے مرہٹوں کی قیادت میں قومی بنیاد پر مسلمانوں کی حکومت کے خلاف پرانی سیاسی دشمنی کو ایک منصوبے کے تحت منظم کرنا شروع کیا۔ ہندو قومیت کی اس جارحانہ تحریک کا نشانہ براہِ راست مسلمان بنتے رہے۔

ہندو مسلم قومیتوں کے ٹکراؤ کے اثرات کو سب سے پہلے غالباً شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے محسوس کیا۔ وہ پہلے مفکر تھے جنہوں نے برصغیر میں مسلم قومیت کی ملّی بنیادوں پر تنظیم کی ضرورت محسوس کی اور مسلمانوں کو اصل اسلام کی طرف لوٹنے کی دعوت دی اور اسلام کے معاشرتی اور معاشی اصولوں کی زمانے کے حالات کے مطابق وضاحت کی اور اسلام

کو ایک متحرک قوت اور دین کے طور پر پیش کیا۔ انہوں نے یہ عملی سیاسی قدم بھی اٹھایا کہ ذاتی خطوط لکھ کر احمد شاہ ابدالی کو مرہٹوں کی تاخت و تاراج اور مسلمانوں کی حالتِ زار سے آگاہ کیا۔ اور اسلام کے نام پر مدد کی درخواست کی۔ چنانچہ ۱۷۶۱ء اور بعد کے معرکوں میں ابدالی نے مرہٹوں کو عبرتناک شکستیں بھی دیں۔ مرہٹے اور ہندو میدانِ جنگ میں تو ہار گئے لیکن ہندو اور مسلم قومیتوں کی جو جنگ کھل کر شروع ہو چکی تھی وہ ختم نہیں ہوئی بلکہ جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہی چلی گئی۔

اٹھارہویں صدی کے وسط میں شاہ ولی اللہ کی فکری تحریک ہندوستان میں مسلمانوں کے علیحدہ قومی وجود کا پہلا اہم اشارہ تھی۔ پھر انیسویں صدی کے شروع میں سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد اور بنگال میں تیتو میر اور حاجی شریعت اللہؒ کی تحریکیں مسلمانوں کے علیحدہ قومی وجود کی لہریں تھیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کے میر کارواں سر سید احمد تھے۔ وہ مسلمانوں کے قومی مفاد کے لیے تگ و دو کر رہے تھے۔ لیکن ہندو مسلم اتحاد کے خلاف بھی نہیں تھے۔ لیکن بہت جلد انہیں اندازہ ہو گیا کہ ہندو مسلمان ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ حالی نے حیاتِ جاوید میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ جب ۱۸۶۷ء میں بنارس کے ہندوؤں نے اردو ہندی جھگڑا کھڑا کیا اور سخت متعصبانہ رویہ اختیار کیا تو سر سید نے بنارس کے کمشنر مسٹر شیکسپیر سے صاف کہہ دیا کہ ہندو مسلمان متحد نہیں رہ سکتے۔ سر سید کے الفاظ یہ تھے۔

"اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہے گا دیکھے گا۔"[1]

قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ سر سید نے دو قوموں کا لفظ استعمال کیا ہے اور ہندو مسلمانوں

[1] بحوالہ کتاب آخری مضامین صد ۴۹ پاکستان کی نظریاتی بنیادیں صد ۱۰۱

میں مزید اختلافات کی پیش گوئی کی ہے۔ جو حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ سرسید نے ہندو ذہن کو اچھی طرح پرکھ لیا تھا۔ چنانچہ اسی وجہ سے انہوں نے مسلمانوں کو ۱۸۸۵ء میں قائم کی گئی ہندوؤں کی انڈین نیشنل کانگریس میں شرکت سے باز رکھا تھا۔

سرسید احمد خان نے اپنی زندگی کے آخری دور میں مغربی طرز کی جمہوریت کو مسلمانوں کے لیے مہلک قرار دیا اور ہندوستان کو برصغیر قرار دیتے ہوئے مختلف قوموں کا وطن قرار دیا، بلکہ سرسید کی ایک تقریر تو ایسی بھی ہے کہ جس میں پاکستان کی نظریاتی ہیئت تشکیل پاتی نظر آتی ہے

۱۸۹۴ء میں جالندھر میں تقریر کرتے ہوئے سرسید نے کہا، ہماری تعلیم پوری اس وقت ہوگی جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے۔ بغیر یونیورسٹی کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں تعلیم پھیلائیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر، آخری جملے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید مسلمانوں کے لیے ایک ایسی مملکت کا خواب دیکھ رہے تھے جس کی بنیاد مذہب پر ہوگی۔ اس تفصیل سے یہ واضح ہوگیا کہ نظریۂ پاکستان کے پہلے معمار سرسید تھے۔ ان ہی کے مبارک ہاتھوں سے ہندوستان میں مسلمانوں کی نئی ذہنی اور سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ انہی نے ہی علی گڑھ تحریک کی بنیاد ڈالی جو پاکستان کی اساس تھی۔

۱۸۸۲ء میں ہندوستان میں البرٹ بل نافذ ہوا۔ اس کے بعد سے ہندو مسلمانوں کے تعلقات کشیدہ رہنے لگے اور ایک دوسرے کی رسوم اور تہواروں پر جھگڑے ہونے لگے، اس صورتحال پر عبدالحلیم شرر نے رسالہ تہذیب، ۲۳ راگست ۱۸۹۰ء کے شمارے میں لکھا" ہمارے خیال میں اگر ایسا ہی وقت آگیا ہے کہ کسی فرقے کی مذہبی رسوم بغیر دوسرے کی توہین و دل شکنی کے پوری نہیں ہوسکتیں اور نہ اتنا صبر و تحمل ہے کہ دوسرا فریق ان باتوں کی طرف توجہ نہ دے تو بہتر ہے کہ ہندوستان کے اضلاع ہندو مسلمان باہم تقسیم کرلیں اور اپنی آبادی علیحدہ کرلیں"

مولانا عبدالحلیم شرر کا یہ آخری جملہ کہ ہندوستان کے اضلاع ہندو مسلمان آپس میں تقسیم کر لیں۔ پاکستان کی منزل کی طرف واضح نشان دہی کرتا ہے۔

۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے بعد ہندوؤں نے جو مخالفانہ رویّہ اختیار کیا اس سے مسلمان لیڈروں کو پہلی بار احساس ہوا کہ ان کا بھی علیحدہ سیاسی پلیٹ فارم ہونا چاہیئے پھر منٹو مارلے اصلاحات بھی آنے والی تھیں۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں آغاخان کی سربراہی میں ایک وفد وائسرائے سے ملا اور جُداگانہ حقِ انتخاب کا مطالبہ پیش کیا۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں نواب سلیم اللہ خان کے گھر مسلم لیگ قائم ہوئی۔ ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات نے مسلمانوں کا جداگانہ انتخاب کا حق مان لیا۔ اور دوسرے تحفظات بھی دیئے۔ یہ پاکستان کی طرف پہلا آئینی قدم تھا۔ لیکن آزادی کا خیال ابھی کوسوں دور تھا۔ ۱۹۱۴ء کے اوائل میں لندن کے اخبار ڈیلی ایکسپریس میں ایک نقشہ شائع ہوا جس میں قسطنطنیہ سے سہارنپور تک شمالی ہند کا علاقہ ایک تیر سے ملایا ہوا تھا۔ جس کو مسلم کاریڈور کا نام دیا گیا تھا۔ اس کا مصنف ٹائمز آف انڈیا کا سابق ایڈیٹر لوول فریزر تھا یہ بھی مسلمانوں کے ہندوستان سے علیحدہ امکانی وطن کی طرف اشارہ تھا۔ ۱۹۱۵ء میں بزمِ شبلی سے خطاب کرتے ہوئے چودھری رحمت علی نے کہا تھا کہ ہندوستان کا شمال مغربی حصہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ اسے مسلم ریاست میں بدلا جائے۔ ۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنؤ ہوا۔ یہ مسٹر جناح کی کوششوں سے ہندو اور مسلمانوں کے سیاسی اتحاد کی پہلی اور آخری ٹھوس کوشش تھی۔ اس میں جداگانہ انتخاب کا اصول کانگریس نے بھی مان لیا تھا۔ لیکن بعض سیاسی مفکر اس وقت بھی اسی خیال پر مصر تھے، کہ ہندوستان کو ہندو مسلم ریاستوں میں تقسیم کرنا ہی ہند کے سیاسی مسئلہ کا بہترین حل ہے۔

۱۹۱۷ء میں سوشلسٹ انٹرنیشنل کانفرنس اسٹاک ہوم کے موقع پر علی گڑھ کے خیری برادران نے تقسیم ہند کا خیال پیش کیا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں بدایون (یوپی) کے اخبار ذوالقرنین میں محمد عبدالقادر بلگرامی نے گاندھی کے نام ایک کھلا خط شائع کرایا۔ جس میں تقسیم ہند کی تجویز پیش

کی گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس میں اضلاع کی فہرست بھی دی گئی تھی ۱۹۲۱ء میں مولانا حسرت موہانی کے بیانات سے اور ۱۹۲۲ء میں نادر علی ناگپوری کے کتابچے سے تقسیم ہند کی تائید ہوتی ہے۔

۱۹۲۳ء میں ڈیرہ اسماعیل خاں کے سردار محمد گل خاں نے فرنٹیئر انکوائری کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے تقسیم ہند کی تجویز پیش کی۔ کہ پشاور سے آگرے تک کا علاقہ مسلمانوں کو دیا جائے۔

۱۴ دسمبر ۱۹۲۴ء کے اخبار ٹربیون میں خود کانگرسی رہنما لاجپت رائے نے تقسیم ہند کے حق میں لکھا۔

۲۲ مئی ۱۹۲۵ء کے کامریڈ میں مولانا محمد علی جوہر نے صوبہ سرحد میں اصلاحات کی حمایت کرتے ہوئے لوول فریزر کے مسلم کاریڈور کا حوالہ بھی دیا۔ جس پر ہندوؤں نے بڑی لے دے کی ۱۹۲۶ء میں مولانا عبید اللہ سندھی نے تقسیم ہند کے خیال کا اعادہ کیا۔ اکتوبر ۱۹۲۸ء میں مولانا عبید اللہ لندن کے اخبار ٹائمز میں لکھا۔ پھر دسمبر ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کنونشن کلکتہ میں ہر صوبے کے لیے آزادی کی تجویز پیش کی۔ یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں آغا خاں نے پھر اسی تجویز کو دہرایا۔

لیکن اب تک یعنی دہلی میں آل پارٹیز کانفرنس ۱۹۲۹ء تک تقسیم ہند کے جو خیالات سامنے آئے وہ بیشتر غیر سیاسی مفکروں کے ذاتی تاثرات کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی بہت زیادہ سیاسی اہمیت نہیں تھی۔ مارچ ۱۹۲۸ء میں ہندوستان کا آئندہ آئینی ڈھانچہ تیار کرنے کے لیے سائمن کمیشن آیا۔ جس کے مقابلے میں نہرو رپورٹ تیار ہوئی۔ جناح اس وقت تک بھی کانگرس سے مفاہمت کرنے کو تیار تھے۔ نہرو رپورٹ نے مسلمانوں کو سخت مایوس کیا۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء کے آغاز اور ۱۹۲۹ء کے وسط میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں پھر مسلمانوں کے لیے آئینی تحفظات کی پختہ بنیاد تلاش کرنے کی کوشش شروع ہوئی۔ اپریل ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم کانفرنس نے انڈین کنفیڈریشن کے اندر رہتے ہوئے صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کیا تھا۔

۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو الہ آباد میں علامہ اقبال کی صدارت میں مسلم لیگ کا جو جلسہ ہوا۔ اس

کے خطبہ میں اقبال نے پہلے تو وہی کہا جو مسلم لیگ کا سرکاری موقف تھا۔ ان کے یہ الفاظ تھے
مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ہندوستان کے وفاق کے اندر ان کو حکومت خود اختیاری دے دی
جائے بالکل جائز ہے۔"

اقبالؒ کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے صرف لیگ کے نقطۂ نظر کو بیان کرنے پر ہی بس
نہیں کیا بلکہ اپنی ذاتی رائے کو بھی بڑے مدلّل انداز میں ہندوستان کے آئینی مسئلہ کے واحد
حل کے طور پر پیش کیا۔ اسی لیے انہیں تصور پاکستان کا خالق کہا جاتا ہے۔

اقبال کے اپنے الفاظ یہ تھے۔

"میری ذاتی رائے یہ ہے کہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک واحد
آزاد مسلم ریاست تشکیل کی جائے خواہ سلطنت برطانیہ سے اس کا تعلق ہو یا نہ ہو
ایسی شمال مغربی ریاست کی تخلیق ہندوستانی مسلمانوں یا کم از کم شمال مغربی ہند
کے مسلمانوں کے لیے مقدر ہو چکی ہے۔"

۱۹۳۰ء میں ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک مکمل آزاد مسلم ریاست کے قیام
کی تجویز اقبالؒ کی ذاتی تجویز تھی۔ اس کو مسلم لیگ کی سرکاری سرپرستی حاصل نہیں تھی ۳۲-۱۹۳۱ء
کی گول میز کانفرنس میں یک جہتی نہیں تھی۔ عام رجحان فیڈریشن یا کنفیڈریشن کی طرف تھا۔ خود
اقبالؒ نے تیسری گول میز کانفرنس نومبر ۱۹۳۲ء میں کہا تھا۔

"علیحدہ مرکز کی ضرورت نہیں صوبے خود مختار اور آزاد ہوں۔"

اقبالؒ نے جس آزاد شمال مغربی ریاست کا تصور پیش کیا تھا اس کا کوئی نام تجویز نہیں
کیا گیا تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ ایک خیال تھا۔ مطالبہ نہ تھا۔ جب بعض انگریزوں
اور ہندوؤں نے ان کی تجویز کو تقسیم کے معنی پہنائے تو ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء کے ٹائمز لندن میں اقبالؒ
نے وضاحت کی کہ یہ محض تجویز تھی مطالبہ نہ تھا۔

لیکن ۱۵ دسمبر ۱۹۳۲ء کو نیشنل لیگ لندن کے جلسے میں اقبالؒ نے ایک بار پھر

مدلل انداز میں علیحدہ ریاست کے قیام کو بہترین امکانی عمل بتایا۔ گول میز کانفرنس میں ہندوؤں کے متعصبانہ رویے سے مایوس ہوکر دسمبر ۱۹۳۲ء تک اقبالؒ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ "اب الگ مطالبہ ملک کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا"

جنوری ۱۹۳۳ء میں کیمبرج کے چودھری رحمت علی اور ان کے تین ساتھیوں نے ایک کتابچہ شائع کیا "اب یا کبھی نہیں" جس میں متحدہ ہندوستانی قومیت کو واضح طور پر مسترد کیا گیا تھا۔ گول میز کانفرنس میں زیر غور وفاقی آئین کی شدید مخالفت کی گئی تھی اور کشمیر پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان پر مشتمل ایک آزاد مسلم مملکت کی تشکیل پر زور دیا گیا تھا۔ اس کتابچہ میں لفظ پاکستان بھی وضع کیا گیا تھا۔ بقول رحمت علی لفظ پاکستان فارسی لفظ بھی ہے اور اُردو بھی۔

اس میں پے۔ پنجاب، الف۔ افغانیہ (سرحد) سے۔ کاف، کشمیر سے، سین، سندھ سے اور تان بلوچستان سے لیا گیا ہے پاکستان کے لفظی معنی ہیں "پاک لوگوں کا وطن"

گول میز کانفرنس کے دوران چودھری رحمت علی نے انگلستان میں اقبالؒ سے ملاقات بھی کی تھی۔ اس سے بہت پہلے ایک گمنام طالب علم کی حیثیت سے انھوں نے ۱۹۱۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور کی بزم شبلیؒ کی افتتاحی تقریر کے موقعہ پر بھی آزاد مسلم ریاست کا تذکرہ کیا تھا۔

۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ آیا۔ جس میں صوبوں کی محدود خود مختاری اور مرکزی وفاق کا اہتمام تھا۔ جو یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے جزوی طور پر نافذ بھی ہوا۔ اس کے تحت صوبائی حکومتوں کے انتخابات ہوئے۔ کانگرس اور لیگ دونوں نے الیکشن لڑے۔ جناح ۱۹۳۷ء میں ایک بار پھر اور آخری بار مصالحت کے لیے تیار ہوئے لیکن ہندوؤں نے مفاہمت کرنے سے انکار کر دیا۔ کانگریس نے سات صوبوں میں وزارت بنائی۔ اور جولائی ۱۹۳۷ء سے اکتوبر ۱۹۳۹ء تک حکومت کی۔ اس عرصے میں مسلم اقلیتوں پر وہ ظلم ڈھائے گئے کہ دنیا چیخ اٹھی ہندو کانگرس کے عملی رویے سے ہندوستان بھر کے مسلمان اور ان کے لیڈر اس نتیجے پر پہنچے

کہ ہندوؤں کے ساتھ کسی قسم کی سیاسی مفاہمت ممکن نہیں۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنے قومی مفادات کے تحفظ کے لیے واضح راہِ عمل کی تلاش شروع کر دی۔ ۱۹۳۸ء میں حیدر آباد کے سید لطیف نے چار منطقوں پر مشتمل وفاق کی تجویز پیش کی۔ ڈاکٹر لطیف کی کتاب کے دیباچے میں سر عبداللہ ہارون نے دو وفاقوں کی تجویز پیش کی۔ ۱۹۳۹ء میں پنجابی کے نام سے پانچ ملکوں کی کنفیڈریسی کی تجویز پیش کی گئی۔ متحدہ ہندوستان کے تحت جولائی ۱۹۳۹ء میں سکندر حیات نے اپنی تجویز پیش کی۔ یہ سات حصوں کے وفاق کی سکیم تھی۔

۱۹۳۹ء میں علی گڑھ کے دو پروفیسروں نے تین آزاد ریاستوں کی تجویز پیش کی، پاکستان بنگال اور ہندوستان جو معاہدوں میں آپس میں اور برطانیہ سے منسلک ہوں، ہندوستان کی سیاسی فضا میں کسی نہ کسی شکل میں علیحدگی کے یہ خیالات اُڑ رہے تھے۔ کہ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں کراچی صوبائی مسلم لیگ نے اپنے جلسے میں ایک قرارداد کے ذریعے قرارداد پاکستان کی بنیاد ڈالی۔ اس قرارداد میں مکمل حق خود ارادی کا عزم کیا گیا تھا اور پہلی بار قوم کا لفظ استعمال ہوا تھا۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے آئینی تجویزوں کی چھان بین کے لیے کمیٹی مقرر کر دی۔ ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء تک قرارداد کے مسودے پر غور ہوتا رہا۔ ۲۳ مارچ کو یہ قرارداد اقبال پارک لاہور کے ایک جلسے میں بنگال کے وزیر اعظم اے کے فضل الحق نے پیش کی۔

چودھری خلیق الزماں کی تائید کے بعد دوسرے صوبوں کے مندوبین نے تقریریں کیں اس موقع پر بہترین تقریر قائداعظمؒ کی تھی۔ جس میں قرارداد پاکستان کے پس منظر اور دو قومی نظریہ پر بڑی مدلل بحث تھی۔ اس قرارداد کو قرارداد لاہور کا نام دیا گیا۔ اس میں ہند کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں دو آزاد مملکتوں کے قیام کی تجویز رکھی گئی تھی اپریل ۱۹۴۱ء میں مدراس میں اس قرار کو مسلم لیگ کا باقاعدہ نصب العین بنا دیا گیا۔ ابھی تک اس میں ریاستوں کا لفظ موجود تھا۔ اپریل ۱۹۴۶ء میں دہلی میں ہندوستان بھر کے لیگی ممبروں کا کنونشن ہوا۔ جس میں حسین شہید سہروردی کی قرارداد پر ریاستوں کے بجائے ریاست کا لفظ کر دیا گیا۔ گویا ایک

متحدہ پاکستان کا عہد نامہ بن گیا۔ اس قرارداد پاکستان کے مطابق ۳؍جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا اعلان کر دیا گیا۔ اور پاکستان ایک آزاد خود مختار اسلامی مملکت کی حیثیت سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آگیا۔ ہمیشہ قائم رہنے کے لیے۔ انشاءاللہ

قائداعظم اور نظریۂ پاکستان

نظریۂ پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ ہے، خوش قسمتی سے اس موضوع پر خود قائداعظمؒ نے مختلف موقعوں پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے ان بیانات اور تقریروں کے منتخب ٹکڑے پیش کیے جاتے ہیں۔

مسلم قومیت کی بنیاد:

پاکستان اسی دن وجود میں آگیا تھا۔ جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمہ توحید ہے، وطن نہیں اور نہ ہی نسل۔ ہندوستان کا جب پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں رہا وہ ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا۔ ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آگئی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء سے خطاب ۸ مارچ ۱۹۴۴ء) اسی تقریر میں آگے چل کر آپ نے فرمایا:

آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبے کا محرک جذبہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چال یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا۔

اس تقریر سے اس گمراہ کن خیال کی بھی تردید ہوتی ہے کہ پاکستان کے مطالبے کو ہندوؤں کی تنگ دلی نے جنم دیا۔ یا یہ محض معاشی خوشحالی حاصل کرنے کا ذریعہ تھا یا صرف سیاسی اقتدار کے حصول کا وسیلہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اقتدار کا حصول بھی ضروری

تھا۔ معاشی اور اقتصادی خوشحالی بھی مدنظر تھی، لیکن اس سے بھی اہم تر مسئلہ اور اصل مسئلہ مسلمانوں کے قومی وجود مسلمانوں کے بحیثیت مسلمان زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا مسئلہ تھا۔ جو بغیر پاکستان کے حصول کے ممکن نہیں تھا۔

نظریہ پاکستان اور قومی نظریے کی وضاحت قائداعظمؒ نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد پاکستان پر تقریر کرتے ہوئے ان الفاظ میں کی۔

مسلمان ایک اقلیت نہیں ہیں مسلمان ایک قوم ہیں، قومیت کی تعریف جس طرح کی جائے مسلمان اس تعریف کی رو سے ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ ان کی اپنی الگ مملکت اور اپنی جداگانہ خودمختار ریاست ہو۔ ہم مسلمان چاہتے ہیں کہ برصغیر کے اندر ہم ایک آزاد قوم بن کر اپنے ہمسایوں کے ساتھ ہم آہنگی اور امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ ہماری تمنا ہے کہ ہماری قوم اپنی روحانی، اخلاقی، تمدنی، اقتصادی معاشرتی اور سیاسی زندگی کو کامل ترین نشوونما اور اس مقصد کے لیے وہ طریق عمل اختیار کر سکے جو اس کے نزدیک بہترین ہو۔ اور ہمارے نظریات اور نصب العین سے ہم آہنگ ہو۔ آپ نے مزید فرمایا:

اسلام اور ہندو دھرم محض دو مذاہب نہیں ہیں بلکہ درحقیقت وہ دو مختلف معاشرتی نظام ہیں۔ ان کے پیرو آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے اور نہ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں، ان کا تعلق واضح طور پر دو مختلف تہذیبوں سے ہے اور ان تہذیبوں کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں بلکہ متصادم رہتے ہیں۔

انسانی زندگی کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیالات اور تصورات ایک دوسرے سے مختلف ہیں ان کے تاریخی وسائل اور ماخذ مختلف ہیں۔ ان کی رزمیہ نظمیں، ان کے قومی ہیرو اور قابل فخر تاریخی کارنامے سب مختلف اور الگ الگ ہیں۔ اکثر ایک قوم کا عظیم رہنما دوسری قوم کی بزرگ و برتر ہستیوں کا دشمن ثابت ہوتا ہے ایک قوم کی فتح دوسری کی

شکست ہوتی ہے پس دونوں ہر اعتبار سے علیحدہ قومیں ہیں۔

اتحاد، ایمان اور تنظیم

قائد اعظمؒ نے قوم کو جو ٹھوس نعرہ دیا وہ ہے: اتحاد، ایمان، تنظیم، یہ کوئی سیاسی نعرہ نہیں تھا جو کسی وقتی مصلحت کے تحت کسی محدود وقتی مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے بلند کیا گیا ہو۔ یہ قائد اعظم کی اپنی زندگی کے رہنما اصول تھے جن پر وہ تمام زندگی خود کاربند رہے اور کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ انہی بنیادی اصولوں کو انہوں نے اپنے ورثے کے طور پر قوم کے سپرد کیا۔ آج قائد اعظمؒ خود دنیا میں موجود نہیں۔ لیکن ان کے دیئے ہوئے اصول قوم کی رہنمائی کے لیے روشنی کے مینار کی طرح موجود ہیں۔ اتحاد، ایمان، تنظیم کا نعرہ ایک تکون ہے جس میں بنیادی اہمیت ایمان کو حاصل ہے اتحاد اور تنظیم، ایمان کے بغیر ممکن نہیں۔ قائد اعظمؒ نے قوم کو اتحاد، ایمان تنظیم کی بار بار تلقین کی۔

۲۷ جون ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کونسل بمبئی سے خطاب کرتے ہوئے قائد اعظمؒ نے فرمایا۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ اب مسلم لیگ کے لیے وہ وقت آ گیا ہے جب ہمارا نعرہ اتحاد ایمان اور تنظیم ہونا چاہیئے، اگر ہماری قوم میں کافی طاقت نہیں ہے تو ہمیں کافی طاقت پیدا کرنا ہوگی۔

۲۵ جون ۱۹۴۷ء کو آپ نے فرمایا۔

"مسلمانوں کی نجات ان کے اتحاد، ایمان اور تنظیم میں پنہاں ہے۔"

۷ جولائی ۱۹۴۷ء کو لندن مسلم لیگ کی دعوت کے جواب میں قائد اعظمؒ نے یہ تار دیا۔

پاکستان بن گیا اس کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا کہ آپ حصولِ پاکستان کی خوشی میں ایک ضیافت منعقد کر رہے ہیں۔ اور اس میں مجھے بھی مدعو کیا ہے۔ اب ہمارے سامنے پاکستان کی تعمیر و ترقی کا زیادہ بڑا اور مشکل کام ہے جو ہماری طاقت و توانائی کے ایک ایک

ذمے کا تقاضا کرتا ہے انشاء اللہ ہم اس نئی اور سب سے بڑی اسلامی مملکت کو مکمل اتحاد ایمان اور تنظیم سے دنیا کی ایک عظیم اور مثالی مملکت بنا دیں گے۔

پاکستان بننے کے چند مہینے بعد ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو قائداعظمؒ نے لاہور ریڈیو سے قوم کو یوں خطاب کیا۔

اگرچہ افق پر تاریکی کے بادل چھائے ہوئے ہیں لیکن میں آپ سے اپیل کرتا ہوں اور قوم کے نام پیغام دیتا ہوں کہ اپنے اندر جذبہ اور جوش وخروش پیدا کرو اور حوصلے اور امید کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ۔ انشاء اللہ کامیابی ہماری ہے، ان مشکل حالات میں کیا ہم مایوس ہو کر بیٹھ جائیں؟ ہرگز نہیں۔ اسلام کی تاریخ اولوالعزمی، حوصلے اور مستقل مزاجی کی بے شمار مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ پس مشکلوں، رکاوٹوں اور مصیبتوں کے باوجود آگے بڑھتے جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ سات کروڑ افراد کی ایسی متحد قوم جو عظیم ارادے کی مالک ہو۔ عظیم تہذیب رکھتی ہو، عظیم تاریخ کی وارث ہو اسے کسی قسم کا اندیشہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اب یہ آپ پر ہے کہ کام کریں۔ کام، کام، کام کامیابی ہمارا منشور ہے اور اپنا یہ نعرہ کبھی نہ بھولیئے ' اتحاد، ایمان تنظیم

۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے لوگوں کے نام نشریاتی پیغام میں قائداعظمؒ نے "ایمان" کی یوں وضاحت کی۔

ہماری وحدت اور ہم آہنگی کا راز ہے ایمان۔ اللہ پر ہمارا ایمان، اپنی ذات پر ہمارا ایمان، اپنی تقدیر پر ہمارا ایمان۔

۲۸ مارچ کو ڈھاکا کے جلسہ عام میں قائداعظمؒ نے فرمایا:

"پاکستان مسلمانوں کے اتحاد کا مظہر ہے اور اسے ایسا ہی رہنا چاہیئے سچے مسلمانوں کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ آپ دل وجان سے اس کی پاسبانی اور حفاظت کریں۔ اگر ہم یہ سمجھنے لگیں کہ ہم پہلے بنگالی، پنجابی، سندھی وغیرہ ہیں اور مسلمان اور پاکستانی محض اتفاقیہ تو جان لیجیے کہ پاکستان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

اتحاد کی ضرورت پر ۱۷ اپریل ۱۹۴۸ کو پشاور میں قبائلی سرداروں سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے کہا:

"ہمیشہ سے میری کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو جائے اور مجھے امید ہے کہ اس عظیم مملکت پاکستان کی تعمیر و ترقی کا جو کام اس وقت ہمارے سامنے ہے اسے دیکھتے ہوئے سب کو اس بات کا پورا احساس ہو گا کہ اس وقت اتحاد کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔"

قائداعظمؒ نے نہ صرف اتحاد کی تلقین کی بلکہ اتحاد کی بنیاد کی بھی نشاندہی کی۔ اس خطاب میں آپ نے فرمایا:

"ہم مسلمان ایک خدا، ایک رسولؐ، ایک کتاب پر یقین رکھتے ہیں۔ پس یہ لازمی اور ناگزیر ہے کہ ہم ملت کی حیثیت سے بھی ایک ہوں۔"

پاک فضائیہ کے حوالے سے تنظیم کی اہمیت اور ضرورت پر آپ نے فرمایا۔

"ہوائی جہازوں اور ان کے عملے کی تعداد سے کوئی فرق نہیں پڑتا اصل چیز فضائیہ میں جذبۂ شوق اور سخت نظم و ضبط ہے۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ صرف نظم و ضبط اور خود اعتمادی ہی پاکستان کی فضائیہ کو پاکستان کے شایان شان بن سکتی ہے۔" بنا

پاکستان بحریہ کے جہاز دلاور کے افتتاح پر قائداعظمؒ نے ایمان، تنظیم کی اہمیت پر ان الفاظ میں اظہار خیال کیا:

پاکستان کے دفاع کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں ہر ایک کو اپنی جگہ الگ الگ انتہائی اہم کردار ادا کرنا ہے اس کے لیے آپ کا نعرہ یہ ہونا چاہیے: ایمان، تنظیم۔ ایثار۔"

تعمیر پاکستان

اللہ تعالیٰ کے بے پایاں فضل و کرم سے اور قائداعظمؒ کی رہنمائی میں برصغیر کے مسلمانوں کی مسلسل بے مثال جدوجہد اور بے دریغ قربانی و ایثار سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو پاکستان

بہت مشکل حالات میں وجود میں آگیا لیکن تعمیر پاکستان کا مشکل تر مرحلہ باقی تھا
۱۷ اگست ۱۹۴۷ء کو جمعۃ الوداع تھا۔ قائداعظمؒ نے اپنے پیغام میں کہا:
مسلمانانِ ہند نے دنیا کو دکھادیا ہے کہ وہ ایک متحد قوم ہیں۔ ان کا نصب العین
صحیح اور انصاف پر مبنی ہے۔ آیئے اس نعمت پر ہم عاجزی وانکسار سے خدا کا
شکر بجالائیں اور دعا کریں کہ وہ ہمیں اس نعمت کے لائق بنادے، آج کے دن قومی تاریخ
کا ایک صبر آزما دور ختم ہورہا ہے اور ایک نئے اور قابل قدر دور کا آغاز ہورہا ہے۔
پاکستان کی سرزمین میں زبردست خزانے چھپے ہوئے ہیں۔ مگر اس کو ایک ایسا
ملک بنانے کے لیے جو مسلمان قوم کے رہنے کے قابل ہو۔ ہمیں اپنی قوت اور محنت کے
ذخیرے کا ایک ایک ذرہ صرف کرنا پڑے گا۔ مجھے امید ہے کہ تمام پاکستانی پاکستان کی تعمیر
میں دل وجان سے حصہ لیں گے۔

دوسرے دن ۱۸ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی پہلی عید تھی۔ اپنے یوم عید کے پیغام
میں قائداعظم نے پھر پاکستانیوں کو یاد دلایا:
"اس میں شک نہیں کہ ہم نے پاکستان حاصل کر لیا ہے لیکن یہ تو محض آغاز ہے
اب بڑی بڑی ذمہ داریاں ہمارے کندھوں پر آپڑی ہیں اور جتنی بڑی ذمہ داریاں ہیں
اتنا ہی بڑا ارادہ۔ اتنی ہی عظیم جدوجہد کا جذبہ ہم میں پیدا ہونا چاہیئے۔ پاکستان حاصل
کرنے کے لیے جو قربانیاں دی گئی ہیں اور جو کوششیں کی گئی ہیں پاکستان کی تشکیل وتعمیر
کے لیے بھی کم از کم اتنی ہی قربانیوں اور کوششوں کی ضرورت پڑے گی۔ حقیقی معنوں میں
ٹھوس کام کا وقت آپہنچا ہے اور مجھے پورا پورا یقین ہے کہ مسلمانوں کی ذہانت اور فراست
اس بارِ عظیم کو حوصلے سے اٹھا سکے گی اور اس بظاہر پیچیدہ اور دشوار گزار راستے کی تمام
مشکلات کو آسانی سے طے کرے گی۔

۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو حکومت پاکستان کے افسروں سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظمؒ

نے تخلیق پاکستان کے نصب العین کی یوں وضاحت کی:

کسی نئی ریاست کو معرض وجود میں لانا مقصد بالذات نہیں ہو سکتا بلکہ کسی مقصد کے حصول کے ذریعہ کا درجہ رکھتا ہے۔ ہمارا نصب العین یہ تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت کی تخلیق کریں جہاں آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں جو ہماری تہذیب و تمدن کی روشنی میں پھلے اور پھولے اور جہاں معاشرتی انصاف کے اسلامی تصور کو پوری طرح پنپنے کا موقع ملے۔

اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے متواتر قربانی، ایثار کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو اپنے عیدالاضحیٰ کے پیغام میں قائداعظم نے پاکستانیوں کو پھر یاد دلایا۔

ہم جتنی زیادہ تکلیفیں سہنا اور قربانیاں دینا سیکھیں گے اتنا ہی زیادہ پاکیزہ، خالص اور مضبوط قوم کی حیثیت سے ہم ابھریں گے، جیسے سونا آگ میں تپ کر کندن ہو جاتا ہے۔

اگست ۱۹۴۷ء کے بعد کے مہینے پاکستانیوں کے لیے بہت صبر آزما تھے ان نہایت ہی مشکل حالات میں قائداعظمؒ اپنی منصبی مصروفیتوں کے باوجود قوم کی راہنمائی فرماتے رہے ۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو لاہور کے جلسہ عام میں قائداعظمؒ نے اعلان کیا۔

"اگر ہم ہر مرحلے میں راہنمائی قرآن مجید سے حاصل کریں تو مجھے یقین ہے کہ آخر کار کامیابی ہماری ہوگی"

اسی دن ایک نشری بیان میں قائداعظمؒ نے قوم کو یہ پیغام دیا:

"آیئے ہم اپنی عظیم قوم اور اپنی خود مختار مملکت پاکستان کی تشکیل و تعمیر کے لیے کچھ تدبیر کریں۔ یہ ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے سنہری موقع ہے اور اس کی خوش قسمتی بھی کہ وہ اپنے حصے کا بھرپور اور مکمل کردار ادا کرے اور بڑی سے بڑی ذاتی قربانیاں دے اور پاکستانی قوم اور ملک کو دنیا کی عظیم ترین قوم اور ملک بنانے کے لیے دن رات انتھک محنت کرے۔ اب پاکستان اس کی عزت اور ترقی آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ بلاشبہ ہم میں بے پناہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ پاک سرزمین زبردست وسائل و ذرائع اور امکانات ترقی کی حامل ہے۔

باری تعالیٰ نے ہمیں قدرتی دولت بڑی فراوانی کے ساتھ عطا کی ہے۔ اب یہ کام انسانی ہاتھوں کا ہے کہ وہ اس دولت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔

اس بار عظیم (تعمیر پاکستان) کی شدت اور سنگینی سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ تاریخ میں ایسی نئی اقوام کی کئی مثالیں موجود ہیں جنہوں نے محض قوت ارادی اور بلند کرداری سے خود کو بنایا اور عظیم کیا۔ آپ کا خمیر فولادی قوتوں سے اٹھا ہے اور ہمت کے معاملے میں آپ دنیا میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ پھر آخر آپ دوسروں کی طرح کامیاب کیوں نہیں ہو سکتے۔ خاص طور پر اپنے آباؤ اجداد کی طرح آپ کو اپنی ذات میں فقط مجاہدوں کی تاریخ حیرت انگیز طور پر بلند کردار، باحوصلہ، شجاع اور اولوالعزم ہستیوں سے بھری پڑی ہے۔ اپنی روایات کی رسی مضبوطی سے تھام لیجئے اور اپنی تاریخ میں شان وشوکت کے ایک اور باب کا اضافہ کیجئے:

تعمیر پاکستان میں افواج پاکستان کو جو کردار ادا کرنا تھا اس کی نشاندہی یوں کی۔

"ہم نے پاکستان کی آزادی کی جنگ تو جیت لی ہے لیکن اس آزادی کو برقرار رکھنے اور مستحکم اور مضبوط بنیاد پر تعمیر کرنے کی جنگ، سنگین تر جنگ، ابھی جاری ہے۔"

(افواج پاکستان سے خطاب ۲۱ر فروری ۴۸ء)

قائد اعظمؒ اور طلباء

بحیثیت قائد کے قائد اعظمؒ کو خوب معلوم تھا کہ قوم کے کس حصے سے کیا کام لینا ہے اور کیسے لینا ہے۔ ۱۹۴۶ء کے الیکشن کے جیتتے ہی مسلم لیگ کی سیاسی جدوجہد ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوئی۔ قائد اعظم نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ملک کے دوسرے حصوں کے مسلم طلباء کو تحریک پاکستان سے روشناس کیا اور انہیں پاکستان کے حصول کی جدوجہد کے لیے تیار کرنا شروع کیا۔ تحریک پاکستان کو دلولے، جوش، قربانی اور ایثار کے ساتھ نئے ذہن نئی فکر کی ضرورت بھی تھی تاکہ تحریک پاکستان کے مقاصد کی روشنی گھر گھر پہنچ جائے

نوجوان طلباء ہی اس کام کو بہتر طور پہ انجام دے سکتے تھے۔ چنانچہ قائدِاعظمؒ نے طلباء کو تحریکِ پاکستان کا ہراول دستہ بنایا۔

لیکن طلبا کی قوت کو کام میں لانا کوئی سستا سیاسی کرتب نہ تھا قائدِاعظمؒ سستی سیاست کے حربے استعمال کر ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ اعلیٰ مقاصد کو اعلیٰ طریقوں سے حاصل کرنے کے قائل تھے۔ انہوں نے طلباء کے جوش و خروش ولولے اور ایثار کے جذبے ہی سے کام نہیں لیا بلکہ ان کی ذہنی اور جذباتی تربیت بھی کی۔ انہیں ان کی تعلیمی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا۔ نظم و ضبط کا پابند ہونے کی تلقین بھی کی۔ انہیں نوجوان طلباء پر اتنا اعتماد تھا کہ انہوں نے فرمایا: "مجھے امید ہے کہ آپ ہی میں سے بہت سے جناح پیدا ہوں گے۔ مجھے مستقبل سے کوئی اندیشہ نہیں اگر یہ تمہارے ہاتھ میں ہو۔"

لیکن جناح بننا کوئی آسان کام نہیں تھا اس مشکل کام کو آسان کرنے کی راہیں بھی انہوں نے خود ہی بتائیں۔

مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے وفد سے آپؒ نے فرمایا:

آپ مستقبل کے معمار قوم ہیں، اس لیے جو مشکل کام آپؒ کے سر پر کھڑا ہے اس سے نمٹنے کے لیے اپنی شخصیت میں نظم و ضبط پیدا کیجئے۔ مناسب تعلیم اور مناسب تربیت حاصل کیجئے۔ آپ کو پورا پورا احساس ہونا چاہیئے کہ آپ کی ذمہ داریاں کتنی زیادہ اور کتنی شدید ہیں ان سے عہدہ برا ہونے کے لیے آپ کو ہر وقت تیار اور مستعد رہنا چاہیئے۔ عہدہ برآ

مصروفِ عمل ہونے کی تاکید:

بس آپ کو مصروفِ عمل ہونے کی تاکید کرتا ہوں۔ کام، کام اور بس کام، پرسکون طریقے سے، صبر و برداشت اور انکساری کے ساتھ اپنی قوم کی سچی خدمت کرتے جایئے۔

(آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس، (۱۵ نومبر ۱۹۴۲ء جالندھر)

اسی تقریر میں آپؒ نے مسلم طلباء کو روشن دماغ اور دانائے راز ہونے کی ضرورت سے

آگاہ بھی کیا۔ واضح رہے کہ یہ زمانہ آغاز تحریک پاکستان کا تھا۔ آپ نے فرمایا:

جب تک آپ طالب علم ہیں آپ اپنی کوششوں کو محض تیاری تک محدود رکھیں۔ اور عملی سیاست میں حصہ نہ لیں۔ آپ کو چاہیئے کہ آپ تمام ہندوستان کے مسلم طلباء کو منظم کریں اور مسلمانانِ ہند کی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی نشوونما اور ترقی کے لیے ایک لائحہ عمل بنائیں اور اسے عملی جامہ پہنائیں آپ کا یہ فرض بھی ہے کہ آپ اسلامی تہذیب کو فروغ دیں۔ میں نے ابھی کہا ہے آپ عملی سیاست میں حصہ نہ لیں۔ میں اس امر کی بھی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے میرا اصل مطلب کیا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے اندر وہ اوصاف پیدا کریں جن کے وسیلے سے آپ طالب علمی کی زندگی ختم کرنے کے بعد عملی سیاست کی جدوجہد میں کامیاب ہوں۔ آپ اس وقت اپنے آپ کو تیار کریں اور ضروری سازوسامان یعنی علم وآگہی اور توفیق عمل سے آراستہ کریں۔

آپ کی اوّلین اور اہم ترین ضرورت ہے مطالعہ! مطالعہ! مطالعہ! اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان طلبا اور عام طور پر مسلمانوں میں عظیم الشان بیداری پیدا ہوگئی ہے۔ ترقی کی ضرورت کا احساس موجود ہے، جوش وخروش ہے، ولولہ ہے، لیکن ساتھ ہی جذباتی نعرے بھی سنائی دیتے ہیں۔ آپ اسی صورت میں دوسروں کے خیالات بدل سکتے ہیں جبکہ پہلے آپ خود روشن ضمیر ہوں آج کل دانائے راز ہونے کی خصوصی ضرورت ہے کہ گمراہ کن باتیں زور شور سے کی جارہی ہیں۔

تعلیم، پہلا فرض:

آپ تعلیم پر پورا دھیان دیں۔ اپنے آپ کو عمل کے لیے تیار کریں۔ یہ آپ کا پہلا فریضہ ہے آپ کی تعلیم کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ آپ دورِ حاضر کی سیاست کا مطالعہ کریں۔ یہ دیکھیں کہ آپ کے گرد دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ (کراچی ۲۶ ستمبر ۱۹۴۷ء)

لیکن پاکستانی طلباء کے لیے صرف علم کافی نہیں تھا۔ کردار، عزم، حوصلے کی بھی ضرورت تھی۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو لاہور میں طلباء سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

"میں پاکستان کے ہر باشندے اور بالخصوص نوجوان طلبا کو یہ بات اچھی طرح بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ خدمت، ہمت اور برداشت کے سچے جذبے کا مظاہرہ کریں بلند کرداری کی ایسی مثالیں قائم کریں کہ آپ کے ہم عصر اور آنے والی نسلیں آپ کی تقلید کریں۔"

قائد اعظمؒ کی نظر میں طالب علم کا کام علم کی طلب و جستجو ہی نہیں بلکہ اپنے آپ کو جہاد کے لیے تیار کرنا بھی ہے۔ آپ نے اسی خطاب میں طلبا کو یہ تلقین بھی کی۔

"اپنے حوصلے کو ہر صورت میں بلند رکھیئے، موت سے نہ ڈریئے، ہمارا مذہب یہی سکھاتا ہے کہ ہمیں موت کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ اسلام اور پاکستان کی عزت بچانے کے لیے ہمیں موت کا مقابلہ بہادری سے کرنا چاہیئے مسلمان کے لیے اس سے بہتر اور کوئی وسیلہ نجات نہیں ہو سکتا کہ وہ صداقت کی خاطر شہید کی موت مر جائے۔

قائد اعظمؒ اور تعلیم

قائد اعظمؒ کی قیادت ہمہ گیر تھی، قومی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو ان کی رہنمائی کی روشنی سے روشن نہ ہو۔ تعلیم کے موضوع پر ان کے بیانات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

تعلیم زندگی اور موت کا مسئلہ:

ہماری قوم کے لیے تعلیم زندگی اور موت کا مسئلہ ہے، دنیا اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے کہ اگر آپ نے اپنے آپ کو تعلیم یافتہ نہ بنایا تو نہ صرف یہ کہ آپ پیچھے رہ جائیں گے بلکہ خدانخواستہ بالکل ختم ہو جائیں گے۔

تعلیم کی اشاعت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔ اس مقصد کی خاطر جتنی بھی مصیبتیں جھیلی جائیں کم ہیں۔" (کراچی ۲۶ ستمبر ۱۹۴۷ء)

تلوار سے بھی زیادہ طاقتور:

۳ جولائی ۱۹۴۳ء کو بلوچستان مسلم لیگ کے اجلاس کے موقعہ پر طلبا نے تلوار کردوائی

تحفے کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ قائداعظم رح نے اس کے جواب میں یہ معنی خیز فقرے کہے۔

"یہ تلوار جو آپ نے مجھے عنایت کی ہے، صرف حفاظت کے لیے اٹھے گی لیکن فی الحال جو سب سے ضروری امر ہے وہ تعلیم ہے۔ علم تلوار سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ جائیے اور علم حاصل کیجئے۔" لیکن وہ برطانوی دور کے پرانے طرز تعلیم کی خامیوں سے بھی خوب واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے کل پاکستان تعلیمی کانفرنس کراچی کو ۲۷ نومبر ۱۹۴۷ء کو یہ پیغام دیا۔

"ہمیں اپنی تعلیمی پالیسی، اور پروگرام کو ایسے خطوط پر چلانا ہے جو ہمارے لوگوں کے مزاج کے مطابق ہو جو ہماری تاریخ اور ثقافت سے ہم آہنگ ہو، جو دنیا میں ہونے والی وسیع ترقیوں اور جدید تقاضوں کے مطابق ہو۔

آپ نے زور دے کر کہا:

"پاکستان کی ترقی کا انحصار زیادہ تر طرز تعلیم پر ہے یعنی ہم کس طرح اپنے بچوں کو پاکستان کا سچا خدمت گار بناتے ہیں۔"

تعلیم کا مطلب محض کتابی تعلیم نہیں ہوتا اور ہمارے ہاں کتابی تعلیم بھی خیر سے بہت کمزور اور ناقص ہے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے لوگوں کی توانائیوں کو ایک راہ پر لگائیں اور آنے والی نسلوں کے کردار کی تعمیر ابھی سے کریں۔ اس امر کی فوری اور اشد ضرورت ہے کہ ہمارے جوانوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں تعلیم دی جائے کیونکہ اسی سے ہماری مستقبل کی معاشی زندگی کا معیار بلند ہو گا۔

تعلیم کے ساتھ کردار کی تربیت پر قائداعظم رح نے ہر موقعہ پر تاکید کی۔ انہوں نے فرمایا:

"بغیر کردار کے ڈگری کا حصول محض تضیع اوقات ہے۔"

تعلیم کے عمل میں ذہنی نشوونما کی تربیت کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت اور مضبوطی کی جو اہمیت ہے۔ اس کے بارے میں قائداعظم رح نے فرمایا:

"آپ کے لیے میرا پیغام یہ ہے کہ جسمانی قوت پیدا کیجئے۔ لڑائی جھگڑے زبردستی

ہو۔۔۔۔۔۔ کے لیے نہیں بلکہ سپاہیانہ قوت پیدا کرنے کے لیے تاکہ آپ عمر بھر قومی
زندگی کے ہر شعبے میں طاقت و توانائی کا سرچشمہ بنے رہیں۔"
(کل پاکستان اولمپک کھیل ۲۳ مارچ ۱۹۴۸ء)

بچوّں کا بابا

بڑے آدمیوں کی ایک نشانی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ بچوں پر غیر معمولی شفقت کرتے ہیں وہ قائد اعظمؒ جو رزم حق و باطل میں فولاد تھے۔ جن سے بڑے بڑے جابر خم کھاتے تھے۔ وہ بچوں کے لیے ریشم سے بھی زیادہ نرم تھے۔ ایک بار کوئٹہ میں لوگوں نے یہ منظر دیکھا کہ کھلونوں کی دکان کے سامنے ایک بڑی چم چم کرتی کار آکر رکی۔ ایک طویل القامت، خوش لباس وجیہہ اور شاندار شخص کار سے باہر آیا اور کھلونوں کی دکان میں داخل ہو گیا۔ بعض نے پہچان لیا اور قائد اعظمؒ زندہ باد کا نعرہ لگایا۔

وہ قائد اعظمؒ کی ایک جھلک دیکھنا چاہتے تھے وہ حیران تھے کہ کھلونوں کی دکان پر قائد اعظمؒ کیا کر رہے ہیں۔ حیرانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کا قائد اعظمؒ، بچوں بالوں کا بڑا بابا بھی تھا۔ وہ کوئٹہ میں جس خاندان کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے اس گھر کا ایک چھوٹا بچہ ان سے بہت مانوس ہو گیا تھا وہ انہیں دادا کہہ کر پکارتا اور اپنی ماں کے منع کرنے کے باوجود ان (دادا) کے کمرے میں اکثر دوڑ آتا۔ قائد اعظمؒ اس کو زانو پر بٹھا لیتے اور اس کی پیاری پیاری باتوں سے جی بہلاتے، وہ اس کے ساتھ بچوں کے کھیل کھیل لیتے اپنی بے پناہ مصروفیت سے وقت نکال کر وہ کھلونوں کی دکان میں اس بچے کے لیے کلدار گھوڑا خریدنے گئے تھے۔ بچوں سے ان کی دلچسپی محض اس لیے نہیں تھی کہ وہ اپنی پیاری پیاری باتوں اور معصوم شرارتوں سے ان کا جی بہلاتے تھے۔

بچوں سے بھی ان کی محبت اور شفقت ذاتی نہیں تھی۔ بچے ان کی نظر میں مستقبل

کے معمار تھے۔ قوم کی آئندہ امیدیں، اس لیے جب بھی جہاں بھی موقعہ ملتا وہ بچوں اور نوجوانوں پر نظر کرم فرماتے۔ ایک بار ان کا جلوس ایک شہر کے بازار سے گزر رہا تھا کسی چھت کے اوپر سے دو چھوٹے بہن بھائیوں نے انہیں پہچان لیا اور چیخ پڑے "قائداعظمؒ" قائداعظمؒ کی نظریں اوپر اٹھیں اور وہ انہیں دیکھ کر مسکرائے۔ بچوں کے پاس دو نارنگیاں تھیں۔ انہوں نے وہی انکی طرف اچھال دیں۔ نارنگیاں کھلی کاریں آکر گریں۔ قائداعظمؒ نے انہیں اٹھا لیا اور اپنے ننھے عقیدت مندوں کی نشانی کو دیر تک اپنے ہاتھوں میں رکھا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے ایک بار قائداعظمؒ نے ایک گاؤں سے گزرتے ہوئے کار رکوائی تو بہت سے دیہاتی جمع ہو گئے۔ اور بار بار قائداعظمؒ "زندہ باد" اور "پاکستان زندہ باد" کے نعرے بلند ہونے لگے۔ ہر طرف جوش پھیل گیا۔ قائداعظم نے دیکھا کہ ایک دس برس کا لڑکا بہت بڑھ بڑھ کر نعرے لگا رہا ہے اور بہت جوش میں ہے۔ قائداعظمؒ نے اسے پیار سے بلایا اور پوچھا میرے بچے پاکستان کا مطلب کیا ہے؟ اس نے کہا جناب زیادہ تو آپ جانتے ہوں گے۔ مجھے تو اتنا معلوم ہے جہاں مسلمان زیادہ ہیں۔ مسلمان حکومت کریں اور جہاں ہندو زیادہ ہیں وہاں ان کی حکومت ہو۔ قائداعظمؒ نے بچے کی پیٹھ تھپتھپائی اور بہت خوش ہوئے بعد کو وہ اکثر اس واقعہ کا ذکر کرتے تھے اور کہتے تھے۔ ہمارے پاس پروپیگنڈے کے ذرائع نہیں ہیں، لیکن پاکستان کی آواز گوشے گوشے میں پہنچ چکی ہے۔

ایک بار گیارہ برس کی ایک بچی نے انہیں رومال پر پاکستان کا نقشہ کاڑھ کر بھیجا قائداعظم اس تحفے سے بہت خوش ہوئے بعد کو یہ رومال انھوں نے وائسرائے کو دکھایا اور کہا پاکستان کو اب کون روک سکتا ہے۔ جب پاکستان کی تحریک نے زور پکڑا اور لیگ نے چندے کی اپیل کی تو ہزاروں لاکھوں بچوں نے اپنے جیب خرچ، اپنی عیدیاں اپنے سالگرہ کے انعام قائداعظمؒ کو منی آرڈر کیے۔ قائداعظمؒ اپنے ہاتھ سے "ایم اے جناح" ہر

رسید پر لکھتے تھے اور بچے یہ رسیدیں اپنی آنکھوں سے لگاتے اور جان سے زیادہ عزیز رکھتے۔

قائدِ اعظمؒ کی عظمت کا تجزیہ

قائد اعظمؒ کی غیر معمولی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ اندھی عقیدت یا اندھی وفاداری کو پسند نہیں کرتے تھے نہ انھوں نے خود کسی کو بت بنایا تھا نہ انہیں خود بت بننا منظور تھا۔ وہ تجزیاتی اور تجرباتی ذہن رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ پاکستانی عوام و خواص بھی یہی غیر جذباتی ذہنی رویّہ اختیار کریں تاکہ وہ موجودہ زمانے کے پیچیدہ سیاسی معاشی اور معاشرتی مسائل سے بہتر طور پر عہدہ برآ ہو سکیں۔

قائد اعظمؒ بلاشبہ اس دور کی عظیم شخصیت تھے ان کی عظمت کا اعتراف ان کے دوستوں ہی نے نہیں دشمنوں نے بھی کیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی عظمت کا راز کیا تھا؟ کس چیز نے قائد اعظمؒ کو قائد اعظم بنایا۔ وہ کون سی صفات تھیں جن کی وجہ سے وہ تخلیق پاکستان کی جنگ اتنے نامساعد حالات میں جیت سکے۔

اس سلسلے میں ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ عظمت ذاتی نہیں اجتماعی ہوتی ہے۔ ایک لیڈر کو حالات اور تاریخی عوامل کا دھارا عظیم بنا دیتا ہے۔ لیڈر کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ان تاریخی عوامل کے دھارے کو خاطر خواہ رخ دے سکے، اور اجتماعی طاقت سے اپنی فراست کے مطابق کام لے سکے۔ اس نقطہ نظر کا جواب یہ ہے کہ یہی تو عظمت ہے، تاریخی عوامل کی طاقت کو اپنے قومی مفاد کے مطابق زیر کر لینا ہی بڑائی ہے۔ حالات اور عوامل تو سب کے لیے یکساں ہوتے ہیں جو ان سے خاطر خواہ کام لے سکے اسی کو تو "میر کارواں" کہتے ہیں۔

شخصیت کی تکون کے تین ضلعے ہوتے ہیں: وراثت، ماحول اور کردار، قائد اعظمؒ کی عظمت کو ان ہی تین گوشوں میں تلاش کرنا چاہیئے۔ سب سے پہلے نسلی اور خاندانی خصوصیات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

"نقوش قائداعظمؒ" نامی کتاب میں اسد ملتانی کی روایت اور قائداعظمؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ قائداعظمؒ نسلاً پنجابی راجپوت تھے۔ پورا واقعہ یوں ہے کہ تحریک پاکستان کے زمانے میں جب قائداعظمؒ باغپت ضلع میرٹھ کے ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے تھے تو نواب باغپت نے قائداعظمؒ سے کہا آپ کا خاندان تو تجارت پیشہ ہے آپ میں یہ کڑک کہاں سے آئی۔ اس پر قائداعظمؒ نے مسکرا کر جواب دیا۔ نواب صاحب میں تو پنجابی راجپوت ہوں کئی پشتیں گزریں میرے ایک جد کاٹھیاواڑ چلے گئے تھے، وہاں انہوں نے ایک خوجہ لڑکی سے شادی کرلی اور انہی کے خاندان میں مل گئے۔ اس وقت سے ہم لوگ خوجوں میں شمار ہونے لگے۔ میرے جد جو کاٹھیاوار چلے گئے تھے ضلع منٹگمری (ساہیوال) کے رہنے والے تھے۔

اس روایت کی تصدیق کسی اور سوانح نگار نے نہیں کی ہے۔ کتاب قائداعظمؒ جناح کے معتبر مصنف جی الانہ نے جنہیں قائداعظمؒ سے مدتوں ذاتی شرف نیاز حاصل رہا تھا۔ صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ محمد علی جناحؒ کے آباؤ اجداد کاٹھیاواڑ کے راجواڑے گونڈل کے گاؤں پانیلی کے باشندے تھے۔ ان کے دادا پونجا میگھ جی کا کپڑا بننے کا چھوٹا سا کاروبار تھا اور ان کا شمار گاؤں کے شرفائیں ہوتا تھا۔ پونجا میگھ جی کے تین بیٹوں، والجی بھائی، نتھو بھائی، جناح بھائی میں سب سے چھوٹے جناح پونجا سب سے زیادہ باہمت، باحوصلہ تھے اور تجارتی ذہن رکھتے تھے۔ اپنی تجارتی تگ وتاز کے لیے گونڈل کا میدان تنگ پاکر جناح پونجا کراچی منتقل ہوگئے اور اپنی تجارتی فراست وذہانت اور محنت سے انہوں نے ایکسپورٹ امپورٹ اور بینکاری کے کاروبار کو خوب چمکایا۔

لیکن جناح پونجا محض کاروباری آدمی نہیں تھے وہ کراچی کے چرچ مشن نامی ایک انگریزی اسکول میں استاد بھی رہے تھے خود بھی انگریزی جانتے تھے۔ سرسید کی تعلیمی اور اصلاحی تحریک سے بھی واقف تھے انہوں نے کراچی کے باشعور مسلمانوں کے ساتھ ۱۸۸۵ء میں سندھ مدرسۃ الاسلام کی بنیاد رکھنے میں عملی مدد دی تھی۔ محمد علی جناح کے ننھیال کے بارے میں بھی کچھ

نئی معلومات منظر عام پہ آئی ہیں۔ جناح کی وراثت کے مطالعہ میں اہمیت رکھتی ہیں محمد علی کی والدہ شیریں بی جو سسرال میں اپنے حسن صورت و سیرت کی وجہ سے مٹھی بائی کے نام سے مشہور ہوئیں نسلاً ایرانی تھیں۔ وہ آغا خاں اوّل کے ایک وزیر موسیٰ جمعہ کی بیٹی تھیں ۱۸۷۴ء میں ان کی شادی جناح پونجا سے ہوئی تھی۔ شیریں بی کا خاندان اپنی نجابت شرافت اور علم و فضل میں یکتائے روزگار تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ شیریں بی فہم و فراست میں یگانہ ہونے کے ساتھ علم و فضل میں بھی کچھ نہ کچھ دخل تو ضرور رکھتی ہوں گی۔ فارسی عربی تو جانتی ہی ہوں گی۔ اسماعیلی عقیدہ تو خیر پونجا خاندان کا بھی تھا۔ اسماعیلی حاضر امام آغا خان سے اتنا قریبی تعلق رکھنے کی وجہ سے مذہبی قدروں سے ان کی وابستگی بھی زیادہ ہو گی۔ کہا جاتا ہے کہ محمد علی جناح کا نام "محمد علی" ان کے ماموں اسماعیلی امیر کبیر موسیٰ قاسم نے رکھا تھا۔ ان کی ماں پیار سے انہیں محمد کہتی تھیں۔ جناح پونجا کے گھرانے کے ماحول میں یقیناً یہ نئی چیز ہو گی۔ یہ تحقیق تو نئی ہے۔ اس سے پہلے بھی محمد علی جناح کی والدہ کے بارے میں جو معلومات تھیں۔ وہ پانیلی کے ایک اسماعیلی صوفی بزرگ حسن پیر سے عقیدت رکھتی تھیں۔ انہی کے اصرار پہ محمد علی کو عقیقے کے لیے حسن پیر کی درگاہ پانیلی لے جایا گیا تھا اور وہاں پورے روایتی انداز سے ان کے عقیقے کی رسوم ادا کی گئیں۔ ان حقائق سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ محمد علی جناح کے ماں باپ دونوں روشن دماغ اور روشن ضمیر تھے۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ باپ سے انہوں نے ہمت و حوصلے سے کام کرنا محنت کرنا اپنے اوپر اعتماد کرنا نئی راہیں نکالنا اور جزرسی سیکھی۔ ماں کی طرف سے شائستگی، نفاست اور مذہبی و اخلاقی قدروں سے وابستگی انہیں ورثے میں ملی۔

لیکن قائداعظمؒ کی عظمت کو محض وراثت اور خاندان کے اثرات کے حوالے سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان کے پائے کے عظیم انسان اپنی دنیا آپ پیدا کرتے ہیں اس کا ثبوت یہ ہے کہ لندن میں اپنی تجارتی فرم کی ناکامی پہ انہوں نے خود ہی قانون پڑھنے کا فیصلہ کیا۔

اس کے بعد سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ بھی ان کا اپنا تھا ان دو فیصلوں کی راہ میں جو رکاوٹیں تھیں وہ بھی انہوں نے خود اپنی فراست خود اعتمادی، قوت ارادی سے عبور کیں۔

۱۸۹۶ء میں جب وہ بیرسٹر بنکر کراچی واپس آئے تو ان کے والد کا کاروبار مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا۔ خاندان مالی بحران کا شکار تھا۔ بظاہر بہتر یہی نظر آتا تھا کہ وہ کسی قانونی فرم میں ملازم ہو جانے اور اپنی مالی حالت کو مستحکم کرتے۔ ایسی ملازمتوں کے امکانات بھی موجود تھے بلکہ کہا جاتا ہے کہ ایسی جگہیں انہیں پیش بھی کی گئیں۔ لیکن محمد علی نے اس جال میں پھنسنے سے انکار کر دیا اور صرف اپنے حوصلے اور عزم کو ساتھ لے کر وسیع امکانات کے شہر بمبئی میں اپنے لیے نئی منزلیں تلاش کرنے نکل کھڑے ہوئے۔

نہ صرف انہوں نے اپنے آبائی پیشے تجارت کو خیرباد کہا بلکہ عقیدے میں بھی اپنی فہم اور رائے کے مطابق ترمیم کی۔ ان کے خاندان کے سب لوگ اسماعیلی شیعہ عقیدے کے تھے۔ آغاخاں کو امام حاضر مانتے تھے۔ ابوالحسن اصفہانی کی روایت کے مطابق انہوں نے ۲۱ سال کی عمر میں آبائی عقیدے کو چھوڑ کر اپنے سارے خاندان سمیت اثنا عشری مسلک اختیار کر لیا۔ بلکہ خود آغاخاں کو بھی ترغیب دی کہ وہ اثنا عشری مسلک کی طرف رجوع کریں۔ یہ ان کی خودنگری کی بہت واضح مثال ہے۔ مختصر یہ کہ انہیں والدین سے بھی بہت کچھ ملا۔ ماحول سے بھی انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ تعلیم و تربیت نے بھی ان کے جوہر چمکائے۔ لیکن وہ صفات وہ قدریں، وہ رویے، وہ عادات، وہ اصول، وہ کردار اور وہ ذہن جس نے انہیں چمڑے کے ایک تاجر کے بیٹے سے ایک قوم کا قائداعظم اور ایک ملک کا خالق بنا دیا۔ وہ ان کے انفرادی کردار کا کارنامہ تھا۔ اس لیے ان کی عظمت کا سراغ ان کے کردار کے تجزیے سے مل سکتا ہے۔

اس لحاظ سے ان کی سوانح حیات کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے کردار کی دو خصوصیتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ ایک تو اپنے لیے خود سوچ سکنا۔ اپنے لیے خود فیصلہ کر سکنا اور

پھر اس خود اعتمادی سے کیئے ہوئے فیصلے کو بروئے کار لانے کے لیے ارادے کی غیر معمولی قوت۔

سب سے مشکل کام دوسروں کے مشورے اور حالات کے رخ کے خلاف اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ اس فیصلہ پر حوصلے سے عمل کرنے اور کرتے رہنے میں اپنے اوپر اعتماد کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اپنے مقصد پر اعتماد کی بھی اور محنت و جفاکشی کی عادت کی بھی۔ قائداعظم محمد علی جناح کے کردار میں یہ تینوں صفتیں قوت فیصلہ، قوت ارادی اور بے انتہا اور مسلسل محنت کی صلاحیت کمال کے درجے میں موجود تھیں سندھ مدرسے کی طالبعلمی کے زمانے میں وہ رات گئے تک پڑھتے تھے اور اس روز کا کام ختم کیے بغیر نہیں سوتے تھے۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار ایک رشتہ دار خاتون نے انہیں صحت کی خاطر دیر تک پڑھنے سے منع کیا تو انہوں نے کہا، بائی جی میں محنت نہیں کروں گا تو بڑا آدمی کیسے بنوں گا؟ انہوں نے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ خود کیا۔ وہیں لندن میں ۱۸ یا ۱۹ برس کی عمر میں انہوں نے سیاست میں دلچسپی لینا شروع کی اور خود فیصلہ کیا کہ وہ عملی سیاست میں حصہ لیں گے۔ اور ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کریں گے بلکہ ایک موقعہ پر انہوں نے دادا بھائی نوروجی کی طرح انگلستان میں رہ کر انگلستان کی پارلیمنٹ کا انتخاب لڑنے اور انگریز سیاستدانوں سے برابری کی سطح پر ٹکر لینے کے بارے میں بھی سوچا۔ سیاست میں حصہ لینے کا جو فیصلہ انہوں نے آغاز جوانی میں کیا تھا اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ کوئی ذاتی فائدہ نہ آ سکا۔ حصہ

جب انہوں نے ۱۹۰۰ء میں بمبئی میں پریذیڈنسی کی عارضی جگہ قبول کی تو یہ فیصلہ بہت سوچ کر کیا گیا تھا۔ جیسے ہی وکالت چمکنے کے امکانات ہوئے انہوں نے اس جگہ کو اس زمانے کے ۱۵۰۰ روپے ماہوار پر مستقل طور پر قبول کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اتنی رقم تو میں ہر روز کمانا چاہتا ہوں۔ انہیں اپنے اوپر اعتماد تھا ان کی نظر مستقبل پر تھی۔ ان کے ارادے میں اتنی قوت تھی کہ جو مشکل فیصلہ کریں۔ اس کو آخر تک نبھائیں بھی، خواہ وہ

بہن رحمت بائی کی برادری سے باہر شادی کا مسئلہ ہو یا چھوٹی بہن فاطمہ کو باندرہ کے کانونٹ اسکول میں پڑھانے کا مسئلہ یا خود اپنی شادی اور پھر علیحدگی کی بات، یا بیٹی دینا کو عاق کر دینے کا فیصلہ، یہ سب ان کے اپنے فیصلے تھے اور انہوں نے اپنی قوت ارادی اور فراست سے انہیں آخر وقت تک نبھایا۔ یہی مسئلہ سیاسی فیصلوں کا تھا۔ ۱۸۹۴ء میں انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے کا عہد کیا تھا۔ تمام عمر وہ اس پر قائم رہے اس زمانے میں وہ آزادی کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کے قائل تھے۔ اس معاملے میں وہ بیشتر کانگرسی ہندو لیڈروں سے زیادہ مخلص تھے۔ ۱۹۱۶ء کا لکھنو پیکٹ۔ ۱۹۲۹ء کے ۱۴ نکات، ۱۹۳۲ء کی گول میز کانفرنس، ۱۹۳۷ء کے انتخابات سے ۱۹۴۶ء کے کیبنٹ مشن تک انہوں نے "نہایت ایمانداری اور سچائی سے مسلمانوں کے جائز مفادات کے تحفظ کے ساتھ اتحاد کی کوشش کی۔ یہ وفاداری بشرط استواری کی بہترین مثال تھی۔ ۱۹۲۰ء میں گاندھی اور مولانا محمد علی جوہر کی تحریک عدم تعاون سے تعاون نہ کرنا ان کی قوت فیصلہ اور سیاسی فراست کا بہت سخت امتحان تھا۔ عوامی لیڈروں کے لیے عوام کے جذبات اور رجحان کے خلاف فیصلہ کرنا بہت دشوار ہوتا ہے لیکن محمد علی جناح اس سخت امتحان سے بھی کامران گزرے۔ اس سے پہلے وہ رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کے طور پر وائسرائے کی کونسل کی رکنیت سے استعفیٰ دے چکے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں انگلستان سے آکر انہوں نے مسلم لیگ کو ایک فعال اور منظم عوامی جماعت بنانے کا تاریخی فیصلہ کیا تو کم و بیش وہ تنہا تھے اس زمانے کے بڑے مسلمان لیڈر مسلم لیگ میں نہیں تھے۔ مسلم لیگ کو منظم کرنے کے سلسلے میں وہ اے کے فضل الحق سہروردی، سر سکندر ایسے بااثر لیڈروں سے نبٹتے رہے اور جب ۱۹۳۷ء میں کانگریس کے رویے سے ان کو یقین ہو گیا کہ ہندو مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق دینے پر کسی قیمت پر تیار نہیں تو انہوں نے پاکستان سے کم تر کسی چیز پر راضی ہونے سے انکار کر دیا اور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء سے قرارداد پاکستان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔ ۱۹۴۲ء کا

کرپس مشن ۱۹۴۵ء کی شملہ کانفرنس اور ۴۶ء کا کیبنٹ مشن سارے سیاسی مذاکروں میں ان کی جرأت فیصلہ اور قوت ارادی کے بڑے بڑے سخت امتحان آئے لیکن وہ پہاڑ کی طرح جمے رہے اور آخر کار ۳؍جون ۴۷ء کے اعلان سے پاکستان کا قیام ممکن ہوا۔

ان کی قوت ارادی کا امتحان جسمانی سطح پر بھی ہوا۔ ۴۱ء سے ان کی صحت متاثر ہونے لگی تھی۔ ۴۵-۴۶ اور ۴۷ء کے تین سالوں میں ان کی سینہ کی بیماری اثر کرنے لگی تھی لیکن صرف اپنی قوت ارادی اور جذبے سے انہوں نے اس بیماری کو اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیا۔ چنانچہ شدید علالت کے باوجود اگست ۱۹۴۸ء کے اواخر تک وہ فرائض منصبی انجام دیتے رہے یکم جولائی ۴۸ء کو اسٹیٹ بنک کے افتتاح کے لیے وہ بستر علالت سے اٹھ کے آئے تھے۔ ان کی جرأت کا ایک امتحان نو فروری ۴۳ء میں آیا تھا۔ جب رفیق صابر نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ ان کے حوصلے کے امتحان کا وہ وقت بھی کم نہیں تھا۔ جب ۵؍اگست ۴۷ء کو ایک نجی ملاقات میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے انہیں بتایا کہ سی آئی ڈی کی اطلاعات کے مطابق ۱۴؍اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی میں آزادی کی تقریبات کے دوران سکھوں کی طرف سے اُن پر قاتلانہ حملے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ یہ خفیہ اطلاع انہوں نے سکون سے سُنی اور پھر اعتماد سے کہا۔ آزادی کی تقریبات اپنے پروگرام کے مطابق منعقد ہوں گی۔ جی الانہ نے لکھا ہے کہ قتل کے اس منصوبے کی اطلاع ۷۰ برس سے زائد عمر میں بھی اُن کی قوت ارادی، حوصلے اور اعتماد کو متزلزل نہ کر سکی خوف وہ چیز تھی جس سے وہ واقف ہی نہیں تھے۔

صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کرنے کی فراست اور پھر اس فیصلہ پر پختہ عزم و حوصلے کے ساتھ قائم رہنے کی جرأت اور قوت، یہ قائداعظم کے کردار کی دو اہم خصوصیتیں تھیں۔ لیکن ایک تیسری خصوصیت بھی جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ کچھ کم اہم نہیں ہے یعنی ان کا غیر جذباتی انداز نظر! وہ جذباتی فیصلے نہیں کرتے تھے بلکہ کر ہی نہیں سکتے تھے وہ بہت سوچ سمجھ کر تمام مضمرات پر نظر کر کے ذاتی اور سیاسی فیصلے کرتے تھے وہ جذباتی تو تھے

حساس بھی بہت تھے لیکن جذباتیت کا شکار نہیں تھے ۱۹۱۷ء میں وہ سرڈنشا پٹیٹ کی اس تجویز پر راضی ہو گئے کہ وہ رتن بائی سے شادی کرنے کے ارادے کو ایک سال تک ملتوی کر دیں۔ اس سے ان کے دل کو ضرور تکلیف ہوئی ہو گی۔ لیکن جیسا کہ جی الانہ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ وہ رتن بائی کو سال بھر بعد آزادانہ فیصلہ کرنے کے حق سے محروم کرنا نہیں چاہتے تھے خواہ وہ فیصلہ ان کے خلاف ہی کیوں نہیں پڑتا۔ یہ تو ذاتی محبت کی بات تھی۔ ۱۹۲۰ء میں تحریک عدم تعاون سے اختلاف کرنے کا فیصلہ بالکل غیر جذباتی فیصلہ تھا اصفہانی نے اپنی کتاب میں مولانا بھاشانی کے سلسلے میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے:

"کہ بیکار جذباتی باتوں اور رقیق القلبی کے لیے سیاست میں کوئی جگہ نہیں۔ سیاست شطرنج کی بازی ہے اور برائیوں کا مداوا آنسوؤں سے نہیں بلکہ محنت و جرأت اور عزم سے ہی ہو سکتا ہے۔ شدید سیاسی بحران کے زمانے میں دماغ کو ٹھنڈا اور آنکھوں کو خشک رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ انسان صاف طور پر دیکھ سکے اور فیصلہ کر سکے"۔ برصغیر کی سیاست کا روایتی انداز اور لب و لہجہ جذباتیت کا رہا ہے۔ عوام کا مزاج بھی یہی ہے اس کے باوجود ان کی سیاست جذباتیت سے عاری تھی وہ عوام کے سامنے سیاسی تقریروں میں بھی جذباتی ہونے کے بجائے اپنے نقطۂ نظر کو مدلل، واضح اور پُرجوش طریقے سے پیش کرتے تھے عام لوگوں کو صرف خوش کرنے یا وقتی طور پر ہم خیال کرنے کے لیے جذباتی خطابت کے ہتھکنڈوں سے کام نہیں لیتے تھے۔ وکالت میں بھی ان کا انداز یہی تھا۔ جذباتیت سے بلند ہونا قائداعظم کی شخصیت کا ایک اہم عنصر تھا۔

قائداعظمؒ کے کردار کی چوتھی اور سب سے اہم خصوصیت جو انہیں برصغیر کے تمام سیاست دانوں میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے، وہ ان کی دیانت ہے، نفسیاتی بھی، ذاتی بھی اخلاقی بھی اور سیاسی بھی۔ ہر سطح پر ان کی دیانت بے نظیر و بے مثال تھی۔ ان کی عظمت کا یہ ایک عجیب رُخ تھا کہ وہ فراست ہی میں نہیں دیانت میں بھی جواب نہیں رکھتے تھے

وہ ایک باضمیر اور ایک باضمیر سیاستدان تھے۔ لوگ محبت، جنگ اور سیاست میں سب کچھ جائز سمجھتے ہیں۔ ان کے ہم عصر بھی ایسا ہی کرتے تھے لیکن وہ ان میدانوں میں بھی جائز کو جائز ہی سمجھتے تھے۔ ان کا واسطہ انگریز اور ہندو دو ایسی طاقتوں سے تھا جو کسی خانے بند نہیں نہیں لیکن قائداعظمؒ پھر بھی ان سے سیاسی جنگ میں کبھی معیار سے نہیں اترے جو سوچا وہ کہا جو صحیح سمجھا وہ کیا۔ جو وعدہ کیا پورا کیا۔ بمبئی میں ۱۸۹۶ء سے ۱۸۹۹ء تک ۳ سال تک کا عرصہ ان کے لیے بہت صبر آزما تھا۔ مقدمے تقریبًا نہیں ملتے تھے، اخراجات جاری تھے۔ خاندان کی کفالت بھی ان کے ذمہ تھی۔ روپے کی اشد ضرورت تھی اس زمانے میں بعض دلالوں نے کمیشن پر مقدمے دلانے کی پیش کش کی۔ لیکن انہوں نے ان تجویزوں کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اصفہانی نے اپنی کتاب میں ان کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ میں بھوکا مر جانے کو اس طرح کی تجاویز قبول کرنے پر ترجیح دوں گا۔"

تحریک عدم تعاون کا زور توڑنے کے لیے حکومت تحریک عدم تعاون کے رہنماؤں سے ان کے اختلافات سے فائدہ اٹھا کر انہیں اپنے ساتھ ملانا چاہتی تھی۔ وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے انہیں، جج، لا ممبری، سر کے خطاب غرض ہر قسم کے اعزاز کی پیش کش کی۔ انہوں نے ہر پیش کش کو مسترد کر دیا۔ ریمزے میکڈانلڈ نے گورنری کا جال بھی ڈالا تھا۔ اس سے بڑی بات یہ کہ تحریک عدم تعاون سے عدم تعاون کر کے بھی انہوں نے حکومت سے تعاون نہیں کیا ان کا اختلاف بھی اصولی ہوتا تھا۔ اور اتفاق بھی اصولی۔ جب وہ بمبئی کے مسلم حلقے سے انتخاب لڑ رہے تھے تو ان کے دو مخالفوں نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ ان سے اپنے حق میں بیٹھ جانے کے لیے کہیں، رسمًا ہی سہی لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور ووٹنگ جاری رہی۔ اصفہانی نے لکھا ہے کہ ۴۶ء کے انتخابات میں کلکتے کی ایک اہم سیٹ کے لیے مخالف امیدوار نے زرِ ضمانت لے کر بیٹھ جانے کی پیش کش کی، چند سو روپوں کی بات تھی عبدالرحمٰن صدیقی اور اصفہانی دونوں پیسے دینے پر راضی تھے۔ قائداعظمؒ نے سنا تو حکم دیا

انتخاب لڑا جائے اور مخالف امیدوار کی دستبرداری کو کسی قیمت پر نہ خریدا جائے۔ پیسوں کی نہیں اصول کی بات تھی۔ بعد کو انہوں نے اصفہانی سے کہا "بیٹا سیاست میں دیانتداری کی اہمیت نجی زندگی سے بھی زیادہ ہے کیونکہ اگر تم سیاسی زندگی میں کسی غلطی کے مرتکب ہو گے تو بے شمار ایسے لوگوں کو نقصان پہنچاؤ گے جو تم پر انحصار کرتے ہیں"۔ اسی طرح کا ایک واقعہ جی الانہ نے بھی اپنی کتاب قائداعظمؒ جناح میں لکھا ہے:

۱۹۴۶ء میں سندھ میں صوبائی اسمبلی کے انتخابات ہو رہے تھے۔ مسلم لیگ مسلمانوں کی ساری سیٹیں جیتنا چاہتی تھی اور یہ بہت اہم تھا۔ ایک سیٹ سے مسلم لیگ کے امیدوار قاضی اکبر کا مقابلہ جی ایم سید کر رہے تھے۔ قائداعظمؒ بہت فکرمند تھے۔ انہوں نے الانہ سے کہا بیٹے ایک بات یاد رکھیے، اگرچہ انتخابات اہم ہیں۔ تاہم انہیں جیتنے کے لیے نامناسب طریقے اختیار نہ کیے جائیں مثال کے طور پر آپ کو جی ایم سید کے حلقے میں مسلم لیگ کے نمائندے قاضی اکبر کو ہر قیمت پر کامیاب کرانا ہے لیکن ووٹروں کو کسی قسم کی رشوت نہیں دی جائے گی۔ یہ میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا کہ ووٹ خریدنے کے لیے کسی ووٹر کو ایک روپیہ بھی دیا جائے۔ یہ بددیانتی اور بے ایمانی ہے۔ میں اس بے ایمانی کے مقابلے میں ہار جانے کو ترجیح دوں گا۔"

اس بیان پر جی الانہ کا تبصرہ یہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ان کی عظمت کا ایک اہم عنصر تھا۔ انہیں یقین تھا کہ قیام پاکستان جیسے اعلیٰ مقصد کے حصول میں صرف اخلاقی طریقوں سے ہی کامیابی ہو سکتی ہے۔ سیاست میں بھی اخلاقی اصولوں کو برتنے کا ایک واقعہ قدرت اللہ شہاب نے لکھا ہے۔ شہاب صاحب بحیثیت آئی سی ایس، سی پی میں ایک کانگریسی وزیر کے سیکرٹری تھے، کانگریسی وزیران پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ ایک بار انہوں نے کانگریس ہائی کمان کا ایک انتہائی خفیہ مراسلہ جو مسلمانوں کے خلاف تھا ان کی تحویل میں دے دیا۔ شہاب صاحب کی قومی عصبیت نے انہیں مجبور کیا کہ دلی جا کر وہ دستاویز قائداعظمؒ کو دکھائیں۔ قائداعظمؒ نے کاغذات دیکھے، مسکرائے، شانہ تھپتھپایا اور پھر فرمایا:

"بحیثیت ایک مسلمان کے تم نے ایک ہندو کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر اچھا نہیں کیا"

یہ تھے قائداعظم رح جس شخص نے پاکستان بنایا اس کی قدریں یہ تھیں اور یہ کردار تھا ان کی ساری زندگی بڑائی کا ایک طویل دن تھی وہ زندگی کے ہر دور میں ہر مرحلے میں ہر منزل میں بڑے رہے اور یہ بڑائی بنیادی طور پر کردار کی بڑائی تھی وکالت میں۔ تحریر میں، تقریر میں خلوص میں، قربانی میں فرداً فرداً تو ضرور ان کے حریف موجود تھے۔ لیکن سیاسی فراست، فیصلہ کی قوت ارادے کے عزم اور سب سے بڑھ کر اخلاقی جرأت اور دیانت میں ان کا کوئی ہمسر نہیں تھا۔ ان کے اندر قیادت کی وہ صفات بعینہ موجود تھیں۔ جن کی مسلم قوم کو تاریخ کے اس موڑ پر ضرورت تھی۔ ایک بڑے آدمی کے بارے میں سب سے معتبر گواہی دوسرے بڑے آدمی کی گواہی ہوتی ہے۔ مئی ۱۹۳۷ء کے ایک خط میں اقبال رح نے قائداعظم رح کو لکھا:

"مسلمانوں کو آپ کی قیادت کی ضرورت ہے۔ آپ ہی ان کی کشتی کے پتوار سنبھالیں"

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب و کارآفریں کارکشا و کارساز

قائداعظم رح کی شخصیت کا مطالعہ

قائداعظم رح کی سیاسی زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہن میں سب سے پہلے یہ سوال ابھرتا ہے کہ قائداعظم رح کو ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے اپنا قائداعظم رح کیسے تسلیم کر لیا۔ ان پر اتنا مکمل اعتماد کیسے کر لیا جبکہ برصغیر کے رہنماؤں کی روایتی خصوصیات ان کے اندر نہیں تھیں مثلاً وہ روایتی معنوں میں مذہبی آدمی نہیں تھے۔ عقیدتاً اسماعیلی خوجے تھے جو مسلمانوں کی اکثریت کا عقیدہ نہیں۔ مسلمانوں کی خصوصی زبان اُردو، ان کی زبان نہیں تھی۔ رہنا سہنا ان کا عام مسلمانوں سے مختلف تھا۔ مزاج کے اعتبار سے جذباتی وہ نہیں تھے کم آمیز وہ تھے، پھر وہ اجتماعی امنگوں کا مرکز کیسے بنے؟

یہ سوال بہت اہمیت رکھتا ہے اس سے مسلمانوں کے معیار قیادت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ ایک کلیہ ہے کہ عام مسلمان خود لاکھ معیار سے کم تر ہوں لیکن دل سے وہ اسی راہنما کی قیادت کے قائل ہوں گے۔ جو اپنی زندگی میں کھرا ہو، جس کا کردار بے داغ ہو جو دولت کی ہوس سے اور نفس پرستی سے بلند ہو جو کچھ شان درویشی بھی رکھتا ہو یا امارت کی صورت میں جس کا دل غنی ہو۔ عامۃ المسلمین خلوص اور بے لوثی کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں قائداعظمؒ میں یہ بنیادی صفت موجود تھی۔ نہ انہیں خریدا جا سکتا تھا نہ جھکایا جا سکتا تھا مسلمانوں کو ان پر اعتماد ایک روز میں نہیں ہوا۔ ۱۸۹۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کی ان کی پچاس سال کی نجی اور سیاسی زندگی ان کے سامنے تھی۔ ان کی وفاداری اور استواری کو ہر اعتبار سے مسلم قوم نے پرکھا اور برتا تھا۔

قائداعظمؒ پر اعتماد کے معنی یہ تھے کہ مسلمان تمام فرقہ وارانہ، علاقائی نسلی اور لسانی عصبیتوں کے تنگ دائرہ سے بلند ہو کر صرف اصولی اور نظریاتی سطح پر سوچنا چاہتے ہیں۔ قائداعظمؒ کی ذات میں مسلمانوں نے ایسی قیادت کو قبول کیا جو تمام تعصبات، ذاتی خواہشات، علاقائی و صوبائی یا فرقہ وارانہ ذہنیت سے بالا تھی اور یہ کوئی حیرت کی بات بھی نہیں تھی۔ کیونکہ توحید پر ایمان رکھنے سے مسلمانوں کا لاشعوری رجحان تمام حد بندیوں سے اوپر اٹھنے کی طرف ہوتا ہے پھر قائداعظمؒ میں ایک اور ایسی صفت بھی تھی جو مسلمانوں کی تاریخ کے اس دور میں بے حد اہم ہو گئی تھی۔ یعنی ان کا تدبر اور سیاسی شعور، مشکل فیصلے کرنے کی صلاحیت اور ان کو بروئے کار لانے کا حوصلہ اور ہمت، ان کا غیر جذباتی مزاج بھی اس مرحلے پر کام آیا، ان کا مقابلہ دو چالاک، شاطر لیکن تنگ نظر اور تنگ دل اور تعصب سے لبریز دشمنوں سے تھا، وہ ان دونوں کے لیے دو دھاری تلوار بن گئے تھے اور اقبالؒ سمیت برصغیر کے مسلمانوں کو یقین ہو گیا تھا کہ اس منجدھار میں وہ مسلمانوں کی کشتی کے پتوار سنبھال سکتے ہیں۔ یہ الفاظ بھی اقبال ہی کے ہیں جو انہوں نے مئی ۱۹۳۷ء

کے خط میں قائداعظمؒ کو لکھے تھے۔ قیادت کے لیے صرف خلوص اور ایثار ہی کافی نہیں ہوتا۔ اخلاق کے ساتھ کردار اور کردار کے ساتھ ذہن کی جودت و درّاکی کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ قائداعظمؒ ان صفات سے بھی متصف تھے۔

ہیکٹر بولیتھو کی لکھی ہوئی قائداعظمؒ کی سوانح عمری نے ایک غلط فہمی یہ پھیلائی ہے کہ قائداعظمؒ سرد اور سخت گیر تھے اور ان میں انکسار کی کمی تھی۔ ایک کرائے کا مصنف ایک قوم کے ہیرو کے ساتھ کیسے انصاف کر سکتا تھا۔ ہیکٹر بولیتھو ان سے متاثر تو کیا ہوتا وہ تو ان سے براہ راست واقف بھی نہیں تھا۔ بہرحال اس نے اپنی کتاب سے جو تاثر دیا وہ وہی ہے جو قائداعظمؒ اور پاکستان کے مخالف ہندو اور برطانوی حلقے دیتے رہے ہیں۔

حقیقت حال یہ ہے کہ قائداعظمؒ بحیثیت مجموعی سنجیدہ دل و دماغ کے حامل تھے۔ کم آمیز اور دیر آمیز، حساس لیکن غیر جذباتی، ان کے دل پر، ان کے دماغ کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ جذباتیت ان کے اندر بالکل نہیں تھی۔ بظاہر وہ سرد ضرور نظر آتے تھے لیکن یہ سرد مہری بھی بامقصد اور قوم کی خاطر تھی۔ اصفہانی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ لیگ کونسل کے اجلاس کے دوران جب خواجہ ناظم الدین یکایک بیمار پڑ گئے تو وہ ان کو دیکھنے ہسپتال نہیں گئے، استفسار پر کہا اگر میں ایک رکن کو دیکھنے گیا تو ہر رکن کو دیکھنے جاؤں گا تو پھر قوم کا کام کب کروں گا۔" حقیقت میں عیادت کے لیے نہ جانا بھی اصول کی بات تھی اور قوم کی خدمت کی بھی، ویسے اس موقع پر بھی ان کی فراست کام آئی۔ خواجہ صاحب کو دل کا دورہ نہیں پڑا تھا۔ صرف بدہضمی کی شکایت ہو گئی تھی۔ دوسرے روز وہ بھلے چنگے تھے جو لوگ انہیں دیکھنے گئے تھے انہوں نے بھی وقت ہی ضائع کیا تھا اب اس طرح کے واقعات سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ بے حس یا ہمدردی کے جذبات سے عاری تھے۔ غلط ہو گا۔ بڑے آدمیوں کو کو عام جذبات کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ سچی محبت شرک کو پسند نہیں کرتی۔ قوم کی محبت اور اصولوں کی محبت کے راستے میں ان کی اپنی بیوی اور بیٹی کی محبت بھی حائل نہ ہو سکی۔

تحریک پاکستان کے زمانے سے پاکستان دشمن عناصر بانی پاکستان کے خلاف جو پروپیگنڈہ کرتے رہے ہیں ان میں سے ایک اعتراض یہ ہے کہ ان میں انانیت بہت تھی عام لوگوں سے دور رہتے تھے اور شعائر اسلامی سے بھی ان کی دلچسپی کم تھی۔

ان تینوں اعتراضوں کا جواب اس واقعہ میں ہے جو قائداعظمؒ کے ایک معتمد کارکن اور نیشنل بنک آف پاکستان کے مینجنگ ڈائریکٹر اور ممتاز دانشور ممتاز حسن نے دسمبر ۱۹۵۴ء کے ماہ نو میں بیان کیا وہ کہتے ہیں عام غریب مسلمان جناحؒ کو کیا سمجھتے تھے مجھے اس کا اندازہ ۱۹۴۶ء میں ہوا۔ جب جناح لندن کے مشرقی حصے کی ایک مسجد میں جمعہ کی نماز کے لیے تشریف لے گئے۔ لوگوں نے انہیں دیکھتے ہی صفیں خالی کر دیں تاکہ وہ سب سے اگلی صف میں بیٹھ سکیں لیکن خود انھوں نے آخری صف میں بیٹھنا پسند فرمایا اور کہا کہ میں دیر سے آیا ہوں۔ کسی اور جگہ کا مستحق نہیں۔ نماز ختم ہوئی تو چھوٹے چھوٹے بچوں نے انہیں گھیر لیا۔ وہ قائداعظمؒ کو قریب سے دیکھنا اور ان سے ہاتھ ملانا چاہتے تھے ان میں سے ایسے بھی تھے جو اپنی چھوٹی چھوٹی کاپیوں میں ان کے دستخط لینا چاہتے تھے۔ اس کے بعد ہر نمازی نے ان سے مصافحہ کیا یہ خلوص اور عقیدت کا ایک بے مثال مظاہرہ تھا۔ ایک شخص پر رقت طاری ہو گئی اور اس نے دعا مانگی کہ اے خدا میری زندگی محمد علی جناح کو بخش دے یہ سارے کا سارا مجمع غریب مسلمانوں کا تھا۔ کوئی ملاح تھا، کوئی چھوٹا دکان دار، کوئی خوانچہ فروش، قائداعظمؒ کا ارشاد تھا کہ "میں کسی ایسی مسجد میں جانا چاہتا ہوں جو کسی فرقے سے خاص نہ ہو اور جس میں غریب مسلمان نماز پڑھتے ہوں" اس واقعہ سے جو اپنی نوعیت کا تنہا نہیں۔ انکسار، غریبوں سے محبت، بے تعصبی اور شعائر اسلام سے محبت ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے ڈرائیور فقیر محمد خان کا بیان ہے کہ ان کے ذاتی خدمت گار نے اسے بتایا کہ اکثر رات گئے صاحب نماز کے لیے سجدے میں ہوتے تھے۔

قائداعظمؒ کی ظاہری سرد مہری اور سخت گیری بھی بے وجہ نہیں تھی۔ انسان ایک وقت میں ایک ہی چیز سے محبت کر سکتا ہے۔ عام لوگ اپنی اور اپنوں کی ذات میں دلچسپی رکھتے

ہیں اور ان سے جذباتی محبت کا اظہار کرتے ہیں لیکن کچھ غیر معمولی عظیم لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی اور دوسروں کی ذات سے وابستگی سے بلند ہو کر کسی عظیم نصب العین یا مقصد سے اپنی تمام دلچسپی تمام جذباتی اور ذہنی زندگی مربوط کر دیتے ہیں۔ ان کی محبت ان کی نفرت ان کا جینا ان کا مرنا اسی مقصد کے حوالے سے ہوتا ہے ان کی توجہ کا مکمل ارتکاز ایک نقطے پر ہو جاتا ہے۔ اس لیے سطحی نظر کو وہ غیر جذباتی نظر آتے ہیں۔ قائداعظم رح کی تمام جذباتی ذہنی قوتیں ان کے قومی مشن میں اس طرح جذب ہوگئی تھیں کہ ان کے ذاتی احساسات اور جذبات نے ثانوی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اصولوں سے انحراف تو وہ نہ بیوی کی چاہت کے لیے کر سکتے تھے نہ بیٹی کی محبت کے لیے دوسرے تو دور کی بات ہوتے ہیں۔

بنیادی طور پر وہ حساس اور ہمدرد تھے۔ ۴۸-۱۹۴۷ء میں قائداعظم رح کے اسسٹنٹ سیکرٹری فرخ امین نے ان کے حساس اور انتہائی رحم دل ہونے کے بارے میں کئی واقعے نوٹ کئے ہیں۔ پریشانی کے ایسے موقعوں پر جب دوسرے اعصابیت کا شکار ہو جاتے ہیں وہ ظاہری سکون اور توازن کو قائم رکھتے تھے۔ تقسیم کے بعد مہاجروں کے شدید آلام اور مصائب سے وہ اندرونی طور پر بے حد متاثر تھے۔ فرخ امین نے لکھا ہے۔ میں نے ان دنوں انہیں رات کی خاموشیوں میں سونے کے کمرے میں اضطراب کی حالت میں ٹہلتے دیکھا۔

قائداعظم رح کی شخصیت کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ غم و فکر محبت اور ہمدردی کے جذبات کا برملا اظہار کبھی نہیں کرتے تھے۔ منافقت ان میں نام کو بھی نہیں تھی۔ وہ ان معاملات میں بھی کھرے تھے، جہاں منافقت کو مصلحت کا نام دیا جا سکتا تھا۔ ممتاز حسن نے لکھا ہے کہ جب تقسیم سے ذرا پہلے فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھنے لگی اور ہندو سکھوں نے بھاری مقدار میں اسلحہ جمع کرنا شروع کر دیا تو بعض لوگوں نے قائداعظم سے درخواست کی کہ مسلمانوں کو بھی مقابلے کے لیے ہتھیار اکٹھے کرنے کی اجازت ملنی چاہیئے۔ قائداعظم رح یہ سن کر بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے کہ "کیا تم لوگ مجھے منافق سمجھتے ہو کہ ایک طرف تو صلح کی اپیل کروں اور دوسری طرف

تمہارے لیے ہتھیاروں کا بندوبست کروں۔ میں ہرگز کسی ایسی تحریک کی حمایت نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ مسلمانوں کی طرف سے ہو یا غیر مسلموں کی طرف سے"۔

اس بے لاگ دیانت داری کا نتیجہ تھا کہ جائز سیاسی مقاصد کے لیے بھی وہ کسی کو پیسے دے کر اپنے ساتھ ملانے پر تیار نہیں ہوتے تھے خواہ اس میں کتنا ہی بڑا سیاسی فائدہ مضمر ہو۔ ممتاز حسن ہی راوی ہیں کہ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ میں موثر سیاسی کارکنوں کی سخت کمی محسوس کرتے ہوئے شملہ مسلم لیگ کے ایک رکن نے بڑی دوڑ دھوپ کر کے ایک کانگریسی مسلمان ورکر کو توڑ کر مسلم لیگ کے لیے کام کرنے کے لیے آمادہ کیا وہ بہت اچھا مقرر بھی تھا اس سے مسلم لیگ کو بہت فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ اس نے معاوضے میں صرف سو روپے ماہانہ طلب کیے۔ پوری صورتحال بتانے کے بعد قائداعظمؒ کی اجازت طلب کی گئی۔ قائداعظمؒ نے دو ٹوک جواب دیا۔ دیکھو تمہاری تجویز کو میں اس لیے منظور نہیں کر سکتا۔ کہ یہ مسلمانوں کا اپنا کام ہے اور اسے کرنے کے لیے کسی مسلمان کو کوئی رشوت دینا میرے نزدیک قطعاً ناجائز ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم ایک غریب قوم ہیں۔ اگر ہم یہ رقم دے بھی دیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہم سے زیادہ مالدار قوم اس سے زیادہ رقم دے کر اسے نہیں خرید لے گی"۔ اس مثال سے ان کی دیانت ہی نہیں فراست اور اصول پرستی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ قائداعظم نے یہ بھی بتا دیا کہ پاکستانی سیاست کا اصل اصول کیا ہونا چاہیئے۔

بعض اوقات انسان کی بڑائی کا اندازہ چھوٹے چھوٹے واقعات سے ہوتا ہے۔ ابوالحسن اصفہانی نے اپنی کتاب "قائداعظمؒ میری نظر میں" لکھا کہ جب وہ ان کے گھر کلکتے میں ٹھہرے تھے تو غیر ضروری بتیوں کو گل کر دیتے تھے اور ایسا کئی بار ہوا۔ اصفہانی نے کہا آپ یہ زحمت کیوں کرتے ہیں تو ان کا جواب تھا۔ روپے کو ضائع کرنا گناہ ہے اور اگر روپیہ عوام کا ہو تو اور بھی بڑا گناہ ہے"۔ پاکستان بننے کے بعد وہ ایوان صدر میں اکثر غیر ضروری روشنیوں کو گل کرتے دیکھے گئے۔ اصفہانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ تحریک پاکستان کے سلسلے

میں جو منی آرڈر آتے تھے ان کی دو آنے چار آنے والی رسیدوں پر بھی وہ خود دستخط کرتے تھے۔ نیازمندوں کے عرض کرنے پر کہ یہ خدمت کسی اور کے سپرد کی جائے چونکہ اس میں ان کا قیمتی وقت صرف ہوتا ہے انہوں نے جواب دیا، "بات رقم کی مقدار کی نہیں جذبے اور اصول کی ہے۔ جتنا جس کے پاس ہے وہ پاکستان کے لیے دے رہا ہے۔ میں خود دستخط کر کے اس کے جذبے کی قدر کرنا چاہتا ہوں اور اس کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس کا پیسہ پیسہ میرے علم میں ہے اور محفوظ ہے۔" وہ قومی پیسے کے بارے میں غیر معمولی طور پر محتاط تھے، جو کارکن پیسے کے حساب رکھنے میں کوتاہی کرتا یا لاپرواہی سے صرف کرتا خواہ اس طرح نقصان زیادہ نہ بھی ہوا ہو۔ پھر وہ اس پر کسی اور معاملے میں بھی اعتبار نہیں کرتے تھے۔ محتاط

قائداعظمؒ محض کسی کو خوش کرنے کے لیے خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو یا محض عوام کو متاثر کرنے کے لیے نہ کچھ کہہ سکتے تھے اور نہ کر سکتے تھے۔ ان کی دوستی اور دشمنی برملا ہوتی تھی اور اصول کی خاطر ہوتی تھی۔

ان کی سخت گیری ان کی انتہائی دیانت کا ایک ظاہری پہلو تھا!

جب کبھی ان کی دیانت داری کی تعریف کی جاتی تھی وہ کہتے تھے میرے نزدیک یہ بالکل فطری بات ہے۔ اصفہانی نے لکھا ہے ان کے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ ان کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہ تھا۔ کھانا، آرام، نیند سب کو اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔

دور سے وہ ضرورت سے زیادہ حقیقت پسند نظر آتے تھے۔ جذبات کے لیے ان کے پاس زیادہ وقت نہ تھا۔ اصل میں ان کی حالت اس جان باز سپاہی کی سی تھی جسے میدان جنگ میں لڑنے کے سوا نہ کسی چیز کا ہوش ہوتا ہے نہ ضرورت ہوتی ہے۔ قائداعظمؒ پر اقبالؒ کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز

قائداعظم کی خوش مزاجی اور حاضر جوابی

بنیادی طور پر قائداعظمؒ سنجیدہ دل ودماغ کے آدمی تھے۔ ان کے مشاغل اور دلچسپیاں بھی سنجیدہ نوعیت کی تھیں ان کے بارے میں عام تاثر بھی یہی ہے کہ وہ بے حد سنجیدہ اور متین انسان ہیں۔ سنجیدہ اور متین وہ ضرور تھے لیکن ان کی ہمہ گیر شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ مناسب اور موزوں موقعوں پر وہ وقار سے ہنستے ہنساتے بھی تھے۔ سلجھے ہوئے مذاق سے لطف اندوز بھی ہوتے تھے۔ خود بھی کبھی کبھی دلچسپ واقعات اور لطیفے سناتے تھے۔ ابوالحسن اصفہانی اور ممتاز حسن جنہیں قائداعظمؒ کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ فرخ امین جو آخری ایک برس ان کے پرائیویٹ سیکرٹری رہے تھے ان سب نے قائداعظمؒ کی خوش مزاجی کا تذکرہ کیا ہے۔ فرخ امین نے قائداعظمؒ کا سنایا ہوا ایک لطیفہ بھی لکھا ہے: اگر وہ نہیں ہو تو ویسے نظر کیوں آتے ہو؟" پورا لطیفہ یوں ہے۔

انگلستان کے ایک چھوٹے سے سٹیشن پر گاڑی معمول سے زیادہ دیر تک ٹھہر گئی۔ ایک ہندوستانی جج نیچے اتر کر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے، اتنے میں ایک انگریز بھی گاڑی سے اترا۔ اور سیدھا جج صاحب کے پاس جاکر پوچھنے لگا۔ گاڑی کب چلے گی۔ جج نے کہا۔ مجھے کیا معلوم اس پر انگریز نے کہا تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔ کیا تم اسٹیشن ماسٹر نہیں ہو؟ جج نے جھنجھلا کر جواب دیا نہیں۔ میں اسٹیشن ماسٹر نہیں ہوں۔ اگر وہ نہیں ہو تو ویسے نظر کیوں آتے ہو؟

ایک مرتبہ قائداعظمؒ لاہور میں اپنے ایک عزیز دوست اور معتمد لیگی رہنما ملک برکت علی کے ہاں شادی کی ایک تقریب میں شریک تھے۔ کھانے کے بعد جو فیرنی پیش کی گئی اس میں غلطی سے چینی کے بجائے نمک مل گیا تھا جو مہمان فیرنی کا چمچہ منہ میں ڈالتا منہ بناتا۔ میزبان اور شرمندہ تھے۔ قائداعظمؒ میزبان کے آڑے آئے۔ فوراً اپنی جگہ سے اٹھے اور مہمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا: حضرات نمکین فیرنی پر متعجب نہ ہوں، ملک صاحب آپ کو اپنے گھر کا

زیادہ سے زیادہ نمک کھلانا چاہتے ہیں اور بات ہنسی ہنسی میں ختم ہو گئی۔

لیکن ان کی ظرافت اور حاضر جوابی حریفوں کے لیے طنز کی تلوار بن جاتی تھی۔

ایک دفعہ کسی مقدمے میں بحث لمبی ہو گئی۔ قائد اعظمؒ کی عادت تھی کہ وہ تفصیل سے پورا تجزیہ کرتے تھے۔ انگریز مجسٹریٹ جھنجھلایا ہوا تھا۔ چمک کر بولا۔ مسٹر جناح! میں آپ کی باتوں کو ایک کان سے سنتا ہوں، دوسرے کان سے نکال دیتا ہوں۔ قائد اعظمؒ نے برجستہ جواب دیا۔ جناب والا! آپ کے دونوں کانوں کے درمیان کی جگہ غالباً خالی ہے۔"

اسی طرح کا ایک واقعہ ہے کہ قائد اعظمؒ ایک مقدمے میں بڑے اعتماد اور قدرے جارحانہ انداز سے اپنے دلائل پیش کر رہے تھے۔ انگریز مجسٹریٹ کے لیے یہ ایک نئی چیز تھی بھڑک اٹھا، تنبیہہ کے لہجے میں بولا "مسٹر جناح نہ بھولیے آپ کسی تھرڈ کلاس مجسٹریٹ سے مخاطب نہیں ہیں۔" مسٹر جناح نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "جناب والا آپ کے سامنے بھی کوئی تھرڈ کلاس وکیل بحث نہیں کر رہا ہے۔

ایک اور مقدمے میں بر خود غلط جج نے کہا "مسٹر جناح! ذرا زور سے بولیے میں سن نہیں رہا۔" قائد اعظمؒ نے کہا: غور سے سننا آپ کا کام ہے میں بیرسٹر ہوں، ایکٹر نہیں ہوں لیکن قائد اعظمؒ کی اس حاضر جوابی اور طنز کے اصلی جوہر سیاسی میدان میں کھلتے تھے۔ جب وہ اپنی برجستہ گوئی اور طنز کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔

کانگریسی لیڈر موہن داس کرم چند گاندھی نے مہاتما کا روپ دھار رکھا تھا اور مہاتما گاندھی کے نام سے معروف تھے ان کے روحانی کمالات کا بھی ہندوؤں میں بڑا چرچا تھا۔ یوں تو وہ تمام ہندوستانیوں کا لیڈر ہونے کا دم بھرتے تھے لیکن اندر سے خالص ہندو تھے اور ہندو مفادات کے کٹر محافظ۔ قائد اعظمؒ گاندھی کی منافقت کا حال جانتے تھے۔ ان کے روحانی کراماتوں کے قصوں سے بھی وہ مرعوب نہیں تھے وہ جانتے تھے کہ یہ بھی سیاسی ہتھکنڈے ہیں۔ دونوں سیاست کے میدان میں ایک دوسرے کے حریف تھے اور دونوں میں نوک جھونک

ہوتی رہتی تھی۔

ایک دفعہ گاندھی کے کسی چیلے نے اخبارات کو خبر مہیا کی کہ "کل شام مہاتما جی اپنے آشرم کی کٹیا میں پرارتھنا کر رہے تھے کہ باہر سے ایک بڑا سانپ کٹیا میں آگیا۔ مہاتما جی نہ اس سے ڈرے نہ انہوں نے اس کی پرواہ کی۔ برابر پرارتھنا میں محو رہے۔ سانپ نے مہاتما جی کے گرد ایک دو چکر لگائے اور جیسے چپکے سے کٹیا میں داخل ہوا تھا اسی طرح خاموشی سے باہر نکل گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ کانگریسی حلقوں، ہندوجاتی اور نیشنل پریس نے مہاتما گاندھی کی کرامت کے طور پر اس خبر کی خوب تشہیر کی۔ وقت بے وقت کوچہ و بازار میں عام جلسوں اور نجی محفلوں میں اس کے چرچے ہونے لگے۔

اس دوران ایک پریس کانفرنس میں اخبار نویسوں نے قائدِاعظمؒ سے پوچھا" قائدِاعظمؒ آپ نے سانپ اور گاندھی جی کی خبر اخبارات میں پڑھی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں پڑھی ہے۔ صحافیوں نے سوال کیا" آپ کا کیا خیال ہے یہ حقیقت ہوسکتی ہے یا محض پروپیگنڈہ ہے۔ جواب ملا۔ ایسا ہونا ممکن ہے اور ہو سکتا ہے یہ بات صحیح ہو" ایک من چلے رپورٹر نے پوچھ لیا۔ قائدِاعظمؒ تو آپ سانپ کے اس طرزِ عمل کی کیا توجیہہ کریں گے۔

قائدِ اعظم مسکرائے۔ آنکھوں میں ظرافت کی چمک پیدا ہوئی اور کہا:

"پیشہ وارانہ اخلاق کی بات ہے"

(زہریلے کیڑے اپنے جیسے زہریلے جاندار کو نہیں ڈسا کرتے) اس سیاسی طنز کا جواب نہیں جو لوگ گاندھی کی سیاسی چالوں سے واقف ہیں وہی اس کی داد دے سکتے ہیں۔

جون ۱۹۳۶ء میں قائدِاعظمؒ پنجاب مسلم لیگ کا پارلیمانی بورڈ قائم کرنے لاہور تشریف لائے اس وقت مسلم لیگ بالکل منظم نہیں تھی اور صوبے پر یونینسٹ پارٹی چھائی ہوئی تھی۔ قائدِاعظمؒ کی ٹرین رات کو پہنچی۔ کوئی ۸½ بجے کا وقت تھا جیسے ہی قائدِاعظمؒ نے پلیٹ فارم پر قدم رکھا سارے ریلوے اسٹیشن کی لائٹ آف ہوگئی۔ اتفاقاً یا کسی کی شرارت تھی۔ مجلس استقبالیہ کے

اراکین گھبرا گئے۔ قائداعظمؒ نے اپنی بھرپور آواز میں برجستہ فرمایا۔ دیکھا، لاہور میں میرے قدم رکھتے ہی یونینسٹ پارٹی کا چراغ گل ہو گیا۔

۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو دہلی سے کراچی روانہ ہونے سے پہلے قائداعظم نے جو پریس کانفرنس بلائی تھی اس میں ہندو صحافی بڑے جارحانہ انداز سے سوال و جواب کر رہے تھے، ایک نے پوچھا۔ پاکستان کیا مذہبی ریاست ہوگی؟ قائداعظمؒ نے جوابی سوال کیا۔ مذہبی ریاست کا کیا مطلب ہے؟ بغیر سوچے سوال نہیں کرنا چاہیئے اس پر ایک تیز ہندو صحافی نے اپنے خیال میں بڑا تیر مارا۔ "اس کا مطلب ہے ملاؤں کی حکومت۔ قائداعظم نے برجستہ جواب دیا۔ پنڈتوں کی حکومت کے بارے میں کیا خیال ہے (اشارہ پنڈت نہرو کی طرف تھا) اور کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

۱۹۴۶ء میں قائداعظمؒ اہم سیاسی مذاکرات کے لیے لندن تشریف لے گئے قائداعظمؒ پر سب کی نظریں لگی ہوئی تھیں، لیکن وہ قبل از وقت کچھ کہنا نہیں چاہتے تھے۔ جہاز سے اترتے ہی اخبار لندن ٹائمز کے رپورٹر نے انہیں گھیرا۔ "جناب آپ کیا پیغام لائے ہیں مقصد یہ تھا کہ قائداعظمؒ کے رویے کا کچھ کھوج لگایا جائے۔ اس روز اتفاق سے لندن کا مطلع صاف تھا۔ قائداعظمؒ نے فوراً جواب دیا۔" میں آپ کے لیے خوشگوار موسم لایا ہوں" پھر جائے قیام پر روانہ ہونے سے پہلے کار کے پاس ذرا کی ذرا ٹھہرے، پیچھے مڑ کر دیکھا، اخباری نمائندے بیان لینے جھپٹے۔ قائداعظمؒ نے مسکرا کر فرمایا" دوستو! آج جو بیان مجھے دینا ہے وہ یہی ہے کہ فی الحال میں کوئی بیان نہیں دوں گا" یہ کہہ کر کار میں سوار ہو گئے۔

قائداعظمؒ کی حاضر جوابی اور نکتہ سنجی کا ایک واقعہ سردار عبدالرب نشتر نے لکھا ہے۔ ایک میٹنگ میں پاکستان کا پرچم زیر بحث تھا۔ قائداعظمؒ نے فرمایا کہ یہ بہتر نہ ہوگا کہ پاکستان کے پانچ صوبوں کی نمائندگی کے لیے پرچم میں پانچ ستارے رکھے جائیں۔ اس کے جواب

میں سردار نشتر نے کہا۔ پاکستان کے ساتھ ریاستوں کے الحاق اور کئی وجوہ سے صوبوں کی تعداد میں کمی بیشی کا امکان ہے۔ اس صورت میں ستاروں کی تعداد بدلنا ہوگی اور نہ بدلی تو پانچ ستارے بے معنی ہو جائیں گے۔ اس پر قائداعظمؒ نے مسکرا کر فرمایا: ایسی صورت میں ہم پانچ ستاروں کی توجیہہ کریں گے کہ ان سے مراد پنجتن رضؓ ہیں۔

قائداعظمؒ کا یہ جواب ان کی حاضر جوابی کی مثال بھی ہے اور نکتہ سنجی کی بھی، اس سے ان کے لاشعوری ذہن کے مذہبی رجحان کا پتہ بھی چلتا ہے۔

قائداعظمؒ کی ازدواجی زندگی

ہر بڑے آدمی کے بارے میں تجسس ہوتا ہے کہ دنیا کے اسٹیج پر جیسا کچھ ہے، وہ تو ہے۔ اسٹیج کے پیچھے وہ کیسا ہے؟ اس کی گھریلو زندگی کیسی ہے؟ بیوی بچوں کے ساتھ اس کی تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ اس کی نجی اور جذباتی زندگی کا رنگ کیا ہے۔ قائداعظمؒ کے بارے میں بھی یہ تجسس ہے اور شدت سے ہے۔ چونکہ اس سلسلے میں معلومات کم ہیں اس لیے حقیقت کے ساتھ کچھ افسانے بھی مشہور ہو گئے ہیں۔

اب تک اس بارے میں جو کچھ تحقیق ہوئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

قائداعظمؒ نے زندگی میں دو بار شادی کی۔ ان کی پہلی شادی ۱۶ سال کی عمر میں لندن جانے سے ایک سال پہلے طالب علمی کے زمانے میں ۱۸۹۲ء میں بمبئی کے مشہور تاجر لیرا کھیم کی بیٹی ایمی یا امربائی سے ہوئی تھی۔ بہت دھوم دھام سے بارات کراچی سے ہریانہ جام نگر کاٹھیاواڑ گئی تھی۔ اور شادی کی رسومات روایتی طریقے سے سرانجام پائی تھیں کم عمری کی یہ شادی ان کی ماں کے اصرار سے ہوئی تھی جو ان کے لندن جانے سے پہلے ان کے سہرے کے پھول دیکھنا چاہتی تھیں۔ شادی کے تقریباً ایک سال بعد جنوری ۱۸۹۲ء میں وہ کاروباری سلسلے میں لندن چلے گئے۔ وہاں پھر قانون کی تعلیم حاصل کرنا شروع

کردی۔ ایک روایت کے مطابق ایمی بائی کا انتقال ۱۸۹۳ء میں ہو گیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ ۱۸۹۲ء میں بمبئی میں ایک وبا میں اللہ کو پیاری ہوئیں۔ ایمی بائی سے ان کی شادی ایک رسمی کارروائی تھی۔ اصل میں اس وقت دونوں بہت چھوٹے تھے۔

محمد علی جناح رح کی دوسری شادی ۱۹ر اپریل ۱۹۱۸ء کو بمبئی میں رتن بائی سے ہوئی دیکھا جائے تو یہ ان کی اصل شادی تھی۔ رتی بمبئی کے مشہور پارسی رہنما سر ڈنشا پٹیٹ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ وہ ۲۰ر فروری ۱۹۰۰ء کو پیدا ہوئیں۔ ان کی پرورش بڑے شاعرانہ ماحول میں ہوئی۔ رتی کی گیارہویں سالگرہ پر سر ڈنشا نے اپنی بیٹی کو مشہور انگریزی شاعر ٹینی سن کی نظموں کا مجموعہ تحفے میں دیا تھا۔ رتی کو ناول، ڈرامے وغیرہ کے مطالعہ کا شوق تھا۔ خاص طور پر وہ انگریزی کی رومانی شاعری کی دلدادہ تھیں۔ جب ۱۶ سال کی عمر میں وہ محمد علی جناح رح سے ملیں تو انگریزی کے رومانوی شاعروں جیسے شیلے کیٹس اور ورڈز ورتھ وغیرہ کو اچھی طرح پڑھ چکی تھیں، نفیس، روشن دماغ اور شاندار جناح رح ان کے لیے ایک تصوراتی ہیرو سے کم نہیں تھے۔ پھر ان کی ملاقات بھی دارجلنگ کے شاعرانہ ماحول میں ہوئی۔ سر ڈنشا اور لیڈی ڈنشا دونوں محمد علی جناح رح کے بڑے مداح اور قدردان تھے۔ ان کی قابلیت، شخصیت کے بھی اور قوم پرستانہ خیالات کے بھی، جناح رح گرمیوں کی چھٹیاں سر ڈنشا کی دعوت پر ان کے ساتھ بنگال کے مشہور پہاڑی مقام دارجلنگ پر گزار رہے تھے۔ دونوں کی شخصیت میں کچھ باتیں مشترک تھیں۔ مثلاً ذہانت اور فراست کے ساتھ دونوں ایک انفرادیت رکھتے تھے۔ دونوں انسان دوست تھے۔ سوشل ورک کے دلدادہ تھے اور سیاست میں لبرل خیالات رکھتے تھے۔ بنیادی طور پر یہ شخصیت کا حسن تھا۔ جس نے ایک کو دوسرے کی طرف کھینچا۔ جناح رح اس وقت چالیس برس کے ہو رہے تھے۔ رتی کی عمر ۱۶ برس سے کچھ ہی زائد تھی۔

ایک دوسرے کو پسند کرنے کے بعد جناح رح نے سر ڈنشا سے جس طرح شادی کا

ذکر چھیڑا وہ ان کی منطقی طبیعت کی ایک دلچسپ مثال ہے۔ انہوں نے سر ڈنشا سے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ دو مختلف فرقوں اور مذہبوں میں شادی بیاہ کے بارے آپ کی کیا رائے ہے؟ سر ڈنشا نے پرزور طریقے سے ایسی شادیوں کی حمایت کی، کہنے لگے "قومی اتحاد حاصل کرنے کے لیے یہ ایک موثر ذریعہ ہے، بہت اچھی بات ہے ضرور ہونا چاہیئے" یہ سن کر جناح نے سنجیدگی سے کہا "تو اجازت دیجئے۔ میں آپ کی بیٹی رتی بائی سے شادی کرنے جا رہا ہوں" سر ڈنشا سناٹے میں آ گئے۔ ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ ان کی اپنی رائے ان کے یوں گلے پڑے گی۔ سر ڈنشا بڑے تعلیم یافتہ اور آزاد خیال پارسی تھے اور جناح کے خیالات اور شخصیت کے بڑے مداح۔ پھر بھی وہ اس رشتے پر تیار نہیں ہوئے جب رتی نے اصرار کیا تو انہوں نے قانون کا سہارا لیا۔ قانوناً رتی ۱۸ سال کی عمر سے پہلے اپنے والدین کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کر سکتی تھیں۔ انہوں نے عدالت سے حکم امتناعی حاصل کر لیا۔ رتی بے چین تھیں۔ لیکن جناح تو جناح تھے انہوں نے کہا "قانون سر ڈنشا کے ساتھ ہے قانون کا احترام ضروری ہے۔ ہمیں دو سال انتظار کرنا چاہیئے" چنانچہ دو سال تک دونوں ایک دوسرے سے نہیں ملے۔ جناح رح نے اپنے وعدے کا پورا پاس کیا اور معاہدے کی پوری پابندی کی۔ رتی بائی کو پورا موقع دیا کہ وہ اپنے ارادے کو بدلنا چاہیں تو بدل لیں۔ محبت کو عقل و اصول کے تابع رکھنا ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہوتا ہے لیکن جناح رح نے اس مشکل کو بھی آسان کر دکھایا۔

رتی بھی دھن کی پکی تھیں۔ یہاں بھی اصول کی بات تھی۔ ۱۸ برس کی ہوتے ہی انہوں نے والدین کو بتا دیا کہ میں اب بھی اپنے فیصلے پر قائم ہوں۔ ۱۸ اپریل ۱۹۱۸ء کو انہوں نے جامع مسجد بمبئی میں جا کر بارضا و رغبت اسلام قبول کر لیا۔ ان کا اسلامی نام رتن بائی قرار پایا۔ بمبئی کے ۱۹ اپریل کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی۔ اسی دن بمبئی میں ۱۹ اپریل ۱۹۱۸ء کو ان کا نکاح قائداعظم رح سے اسلامی طریقے سے ایک اثنا عشری قاضی نے پڑھایا۔ (شیخ) نجفی اور

بمبئی

اور میرزا محمد علی مہاراجہ آف محمود آباد قائد اعظمؒ کی طرف سے گواہ تھے۔ رتن بائی کی طرف سے شریف دیوجی اور غلام علی گواہ تھے۔ حق مہر ایک ہزار ایک روپے تھا اور رونمائی یا نذرانے کے سوا لاکھ روپے ہنی مون کا زمانہ انہوں نے یوپی کے مشہور پہاڑی مقام نینی تال میں گزارا تھا۔

رتن بائی جناحؒ کی خلوت و جلوت کی ساتھی تھیں۔ ان کی سماجی ہی نہیں انکی سیاسی مصروفیات میں بھی ان کے شانہ بشانہ کام کرتی تھیں۔ لارڈ ولنگڈن بمبئی کا بد خود غلط اور بدترین سامراجی ذہنیت کا گورنر تھا۔ اس نے ۱۹۱۵ء میں بمبئی میں لیگ اور کانگرس کا مشترکہ اجلاس نہیں ہونے دیا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں گورنمنٹ ہاؤس کی ایک دعوت میں لیڈی ولنگڈن نے مسز جناح رتن بائی کے ساتھ بے ادبی کا رویہ روا رکھا تھا اور جناح اپنی بیگم کے ساتھ احتجاجاً دعوت سے اٹھ کر چلے آئے تھے جب اسی ولنگڈن کو کارپوریشن نے شہریوں کی طرف سے ۱۰ دسمبر ۱۹۱۸ء کو الوداعی سپاسنامہ پیش کرنے کی تجویز پیش کی تو جناح نے دوسرے قوم پرستوں کے ساتھ اس تجویز کی زبردست مخالفت کی۔ ٹاؤن ہال پر قبضہ کر لیا۔ پولیس سے اچھی خاصی مڈبھیڑ ہوئی اس ہنگامے میں رتن بائی بڑی جرأت سے اپنے دلیر شوہر کے ساتھ ساتھ رہیں یہاں تک کہ پولیس کے تصادم میں دونوں کو خراشیں بھی آئیں۔ رتن بائی جرأت کے ساتھ ساتھ فہم و فراست اور حاضر دماغی میں بھی کم نہیں تھیں۔

جناح امپیریل کونسل کے رکن کی حیثیت سے دلی آئے تھے۔ مسز رتی جناح ان کے ساتھ تھیں۔ وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ نے دونوں کو دوسرے معزز مہمانوں کے ساتھ رات کے کھانے پر دعوت دی۔ اس زمانے کے آداب کے مطابق اے ڈی سی نے وائسرائے اور لیڈی چیمسفورڈ کے آنے کا اعلان کیا تو مہمان تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ ہر مہمان اٹھ کر میزبان تک جاتا اور اس کا تعارف کرایا جاتا اور تمام خواتین رواجاً باری باری لیڈی چیمسفورڈ کے سامنے تعظیم کے طور پر سر خم کرتیں۔ جب مسز جناح کا وائسرائے اور لیڈی چیمسفورڈ سے

تعارف کرایا گیا تو مسز جناح نے مسلم خواتین کی طرح لیڈی چیمسفورڈ کی خدمت میں آداب عرض کیا۔ اے ڈی سی دم بخود رہ گیا۔ وائسرائے کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن اس وقت در گزر کر گیا۔ کھانے کے بعد گفتگو کا دور شروع ہوا۔ تو وائسرائے نے مسز رتی جناح سے کہا آپ کے شوہر کا مستقبل بہت شاندار ہے آپ کو ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بننا چاہیئے۔ آپ نے قصر وائسرائے کے آداب کے مطابق ہماری تعظیم نہیں کی۔ روم میں روم کے آداب ملحوظ رکھنے چاہئیں۔ مسز جناح اس انداز گفتگو سے قطعاً متاثر نہیں ہوئیں۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے وائسرائے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ یور ایکسی لینسی میں نے جملہ آداب کو ملحوظ رکھا ہے۔ آپ ہندوستان میں ہیں اور میں نے ایک ہندوستانی خاتون کی طرح آپ کو تعظیم دی ہے۔ مسز جناح کا یہ جواب ان کے اور ان کے شوہر جناح رح کے شایان شان تھا۔

رولٹ ایکٹ کے خلاف جناح سخت احتجاج کر کے کونسل سے استعفیٰ دے چکے تھے حکومت انہیں بائیں بازو کے انتہا پسندوں میں شمار کرتی تھی۔ جو ہوم رول سے کم کوئی چیز قبول کرنے پر تیار نہیں تھے، جب تحریک عدم تعاون سے انہوں نے تعاون نہیں کیا تو حکومت کی ساری مشینری حرکت میں آگئی کہ کسی طرح انہیں رام کیا جائے۔ لارڈ چیمسفورڈ کے برخلاف وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ جناح رح کے بڑے مداح تھے۔ ان کی ذات کے بھی اور ان کی صفات کے بھی، لارڈ ریڈنگ نے انہیں ترغیب دی کہ وہ ہائی کورٹ کے جج کا عہدہ قبول کرلیں۔ اس کے بعد وائسرائے کی کابینہ میں لا ممبر کی حیثیت سے تقرر کی پیشکش کی۔ جناح رح نے دونوں پیشکشیں مسترد کر دیں۔ آخر کار سر کے خطاب کا جال بھی ڈالا۔ جناح رح نے جواب دیا "سر محمد علی جناح کے مقابلے میں، میں یہ زیادہ پسند کروں گا کہ مجھے صرف مسٹر محمد علی جناح کہا جائے" مسٹر جناح سے مایوس ہو کر لارڈ ریڈنگ نے مسز جناح کو زیر دام لانا چاہا۔ ایک تقریب کے موقع پر لارڈ ریڈنگ نے مسز جناح سے پوچھا کیا وہ پسند نہیں کریں گی کہ لوگ انہیں لیڈی جناح کہیں مسز جناح نے بے ساختہ جواب دیا۔ اگر جناح نے سر کا خطاب قبول کر لیا تو میں ان سے

الگ ہو جاؤں گی۔

خودداری اور قومی حمیت میں وہ اپنے عظیم المرتبت شوہر سے کم نہیں تھیں اسی طرح وطن پرستی اور جرأت اظہار میں بھی مسز جناح کا جواب نہیں تھا۔ ایک اور موقع پر کھانے کی دعوت میں وہ لارڈ ریڈنگ کے پاس بیٹھی تھیں۔ ریڈنگ نے اپنے زندگی کے واقعات سناتے سناتے جنگ سے پہلے جرمنی میں اپنے زمانہ طالبعلمی کے واقعات کا تذکرہ کیا اور کہا کہ یہ سوچ کر کتنا دکھ ہوتا ہے کہ اب میں خواہش کے باوجود جرمنی نہیں جا سکتا۔ مسز جناح نے پوچھا "آخر کیوں نہیں۔ یور ایکسی لینسی؟ وائسرائے نے جواب دیا۔ بات یہ ہے کہ جرمن ہم انگریزوں کو خاص طور پہ جنگ کے بعد پسند نہیں کریں گے" یہ سن کر مسز جناح نے برجستہ کہا۔ "تو پھر یور ایکسی لینسی، آپ ہندوستان کیسے آ گئے" یہ ان کی شخصیت کا جلالی پہلو تھا۔ ہمدردی و غمگساری سے بھی ان کا دل لبریز تھا۔ جی الانہ نے اپنی کتاب قائداعظم "جناح" میں ان کی نرم دلی اور انسانی ہمدردی کی مثالیں دی ہیں۔

۴ مئی ۱۹۱۹ء میں جب جناح ایک سیاسی مہم پر لندن گئے تو رتن بائی بھی ان کے ساتھ تھیں۔ ۱۴ اگست ۱۹۱۹ء کو لندن میں ان کی اکلوتی بیٹی دینا پیدا ہوئی۔ اس قیام لندن کے دوران رتن بائی کی خط و کتابت گاندھی اور کانجی دوار کا داس سے رہی۔ اس سے ان کی سیاسی حیثیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے ناگ پور کے جلاس میں جناح نے گاندھی اور کانگریس سے کھل کر اختلاف کیا تھا۔ اس موقع پر بھی رتن بائی جناح کے ساتھ تھیں۔

رتن بائی کے حسن، خوش لباسی، بیش قیمت زیورات، ذہانت اور خود اعتمادی کی وجہ سے انگریز حکمرانوں کی بیویاں ان سے حسد کرتی تھیں، لیڈی ولنگڈن کا واقعہ اوپر گزرا۔ ۱۹۲۱ء میں وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے ان سے مل کر جو خطوط لندن لکھے ہیں، ان میں انکی خوبصورتی خوش لباسی، جواہرات، اور خود اعتمادی کا بار بار تذکرہ کیا ہے، خوبصورتی خوش ادائی

خوش لباسی، رتن بائی کی شخصیت کا صرف ظاہری پہلو تھا۔ وہ اپنے حسن کی وجہ سے بمبئی کا گلاب کہلاتی ہیں۔ اندر سے ان کی شخصیت بہت پہلودار تھی۔ شاعری ان کی گھٹی میں پڑی تھی، مطالعے کی بے حد شوقین تھیں۔ ۱۹۲۰ء سے بعد کے زمانے میں روحانیت اور علم النجوم سے انہیں گہری دلچسپی ہو گئی تھی۔ خود بھی بہت سے جانور پال رکھے تھے اور بیمار اور معذور پالتو جانوروں کی دیکھ بھال میں بہت دلچسپی لیتی تھیں اور ایسے اداروں سے بہت تعاون کرتی تھیں۔ کانجی دوارکاداس بمبئی کے ایک مشہور سوشل ورکر تھے۔ ان کے کام میں جناح ؒ اور مسز جناح دونوں عملی دلچسپی لیتے تھے۔

۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۸ء تک دس سال دونوں نے بحیثیت مجموعی مثالی ہم آہنگی سے گزارے اسمبلی، کورٹ، سیاسی پلیٹ فارم ہر جگہ دونوں ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ گرمیوں کی تعطیلات دونوں پہاڑی مقامات پر گزارتے تھے۔ نارمل اختلافات تو ایک آدھ بار ان میں پہلے بھی ہوئے تھے۔ لیکن جنوری ۱۹۲۸ء میں کچھ زیادہ ہی سرگرانی بڑھ گئی اور رتی علیحدہ رہنے لگیں۔ ۳ اپریل کو جناح ؒ انگلستان روانہ ہوئے، ایک ہفتے کے بعد ۱۰ اپریل کو رتی بھی اپنی والدہ کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ پیرس میں وہ شدید بیمار پڑ گئیں۔ ایک مشترک دوست کے توسط سے جناح ؒ کو ان کی بیماری کی اطلاع ہوئی اس وقت وہ ڈبلن میں تھے۔ وہ بھاگم بھاگ پیرس پہنچے۔ کلینک میں رتی کی تیمارداری کی۔ علاج تبدیل کروایا۔ ایک ماہ تک نرسنگ ہوم میں ان کے ساتھ رہے بہت محبت اور شفقت سے ان کی تیمارداری کی۔ وہ ان کے ساتھ ہی پرہیزی کھانا کھاتے تھے۔ یہ بات خود رتن بائی نے کانجی دوارکاداس کو ایک خط میں لکھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اختلافات ختم نہ ہو سکے۔ وہ علیحدہ علیحدہ ہندوستان واپس ہوئے۔ رتی نے ماں کے ساتھ دوسرا جہاز لیا۔ لیکن جناح ؒ کی پرخلوص تیمارداری رنگ لائے بغیر نہ رہ سکی ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو رتی جناح ؒ نے مارسیلز سے جناح کو ایک جذباتی خط لکھا۔ جس میں انہیں اپنی شدید وابستگی کا یقین دلایا گیا تھا۔ اس کا ایک فقرہ یہ تھا۔ جو ٹریجڈی محبت سے

شروع ہوئی تھی۔ ہونا چاہیئے کہ وہ محبت پر ہی ختم ہو۔" بمبئی کے ایم سی چھاگلہ نے جو جناح رح اور رتی دونوں کو قریب سے جانتے تھے اور جناح کے سیاسی حریف تھے لکھا ہے جناح رح نے رتن بائی کے ساتھ ہمیشہ انتہائی مروت اور محبت کا رویہ روا رکھا۔ اختلاف کے باوجود انکی شاہانہ زندگی کے تمام مصارف خوشی سے برداشت کیے اور عزت و احترام کا سلوک کیا۔

جنوری ۲۹ ۱۹ء میں رتن بائی پھر بیمار پڑ گئیں جناح سر شام ہسپتال میں ان کی مزاج پرسی کے لیے جاتے تھے۔ وقت ہوتا تو گھنٹوں باتیں کرتے۔ ماضی کی یادیں انہیں پھر قریب لا رہی تھیں۔ کچھ مفاہمت ہو رہی تھی کہ فروری ۲۹ ۱۹ء کے وسط میں مرکزی اسمبلی کے بجٹ سیشن میں شرکت کرنے کے لیے جناح رح کو بادل نخواستہ دہلی جانا پڑا۔ رتی کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ ۱۹، فروری کو وہ بے ہوش ہو گئیں۔ ۲۰، فروری کو اپنی سالگرہ کے دن ان کا انتقال ہو گیا۔ تجہیز و تکفین کے انتظامات شریف دیوجی نے اسلامی طریقے سے کیے۔ انہیں آرام باغ قبرستان میں دفن کیا گیا۔ جناح تدفین کے وقت موجود تھے۔ انہیں قبر میں اتارتے وقت وہ رو پڑے۔ قبر پر مٹی بھی سب سے پہلے انہوں نے ڈالی۔ جناح اور رتن بائی کے مشترکہ دوست اور رفیق کار کانجی دوارکا داس نے اپنی کتاب رتی جناح میں جناح کو خراج تحسین ادا کیا ہے یہ شادی دل و دماغ کے سنگم سے ہوئی تھی۔ دونوں ایک جان اور دو قالب تھے۔ رتی سے شادی کے بعد جناح نے اوریئنٹ کلب سے استعفٰی دے دیا تھا۔ اور بیشتر وقت رتی کے ساتھ گزارتے تھے۔ رتی جب باہر ہوتی تھیں تو کانجی دوارکا داس سے جناح کی عافیت معلوم کرتی رہتی تھیں اور لکھتی تھیں کہ جناح رح عادتاً زیادہ کام کرتے ہیں۔ انہیں اس سے باز رکھا جائے۔ کم عمر رتی ایک معروف اور عظیم رہنما کی بیوی کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں سے خوب واقف تھیں اور انہیں خوب ادا کیا۔

—

کردارِ قائدِ اعظمؒ کی جھلکیاں

خوددار وکیل

قائداعظمؒ کلکتہ میں مرزا اصفہانی کے یہاں مقیم تھے اور اس روز وہ خاص طور پر خوش تھے۔ کیونکہ انہیں بنگال کی یونائیٹڈ مسلم پارٹی کو اس امر پر راضی کرنے میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی کہ وہ کل ہند مسلم لیگ میں ضم ہو جائے۔ اس طرح راتوں رات مسلم لیگ سب سے بڑی اور سب سے زیادہ فعال جماعت بن گئی تھی یہ بہت بڑی سیاسی کامیابی تھی۔ قائداعظمؒ اپنے بارے میں عموماً بہت کم گفتگو کیا کرتے تھے لیکن اس روز اصفہانی کے مکان کے جنوبی برآمدے میں بیٹھے وہ بہت مسرور نظر آ رہے تھے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے۔

قائداعظم : اصفہانی! انسان کو کامیاب لمحوں میں ناکام لمحے ضرور یاد آتے ہیں۔ آج جب کہ اللہ نے مجھے سب کچھ دیا ہے اور بحیثیت وکیل میں نے اتنا کچھ پایا ہے لیکن میری وکالت کا ابتدائی زمانہ بڑی سختی کا تھا۔ ہر روز میں اپنے چیمبر میں جا کر بیٹھتا تھا اور اس انتظار میں صبح سے شام کر دیتا تھا کہ شاید کوئی مقدمہ ملے لیکن نہیں ملتا تھا۔ میں اتنا نووارد اور کم عمر تھا کہ بمبئی ایسے شہر میں جہاں بڑے بڑے تجربہ کار اور مشہور وکیلوں کی ریل پیل تھی، میری طرف کوئی توجہ نہ دیتا تھا میری طرح کے نئے وکیلوں کو عموماً کسی نہ کسی بڑے وکیل کی سرپرستی حاصل تھی بڑے وکیل اپنے رشتہ داروں اور واقف کاروں کو مؤکلوں سے متعارف کر دیتے تھے لیکن مجھے یہ آسانی بھی میسر نہیں تھی اور میں نے مقدموں کو خریدنا بھی پسند نہیں کیا۔

اصفہانی : مقدمے خریدنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟

قائداعظمؒ : جیسا کہ آپ کو معلوم ہو گا کہ مقدموں کی بھی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ میرے پاس بھی دلّال آتے رہتے تھے اور پیش کش کرتے کہ وہ مجھے مقررہ کمیشن پر چھوٹے

موٹے مقدمے دلا سکتے ہیں۔ اگرچہ میری شدید خواہش تھی کہ میں کسی نہ کسی طرح کام شروع کر دوں اور کچھ کمانے لگوں خواہ وہ کم ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ میں دلالوں سے کمیشن پر مقدمے لوں۔ چنانچہ ایک روز میں نے ایک دلال سے جو بہت پیچھے پڑا ہوا تھا صاف کہہ دیا "مسٹر، میں بھوک سے مرجانا پسند کروں گا لیکن دلالی پر مقدمے ہرگز نہ لوں گا۔ خدا گواہ ہے میں بہت پریشان تھا۔ وہ دن معاشی اعتبار سے میری زندگی کے مشکل ترین دن تھے لیکن میرے لیے وہ کام کرنا مشکل تھا جس کو میں جائز نہیں سمجھتا تھا۔ خدا عزم راسخ کا صلہ ضرور دیتا ہے۔ شکر ہے کچھ دنوں بعد بمبئی کے سرکاری وکیل میکفرسن نے مجھے کاغذات پڑھنے کی اجازت دے دی اور مجھے انہی کے توسط سے پریذیڈنسی مجسٹریٹی کی عارضی آسامی پر کام کرنے کا موقع مل گیا۔ اس دن سے گویا میرے دن پھر گئے۔ بعد کو مجھے یہ آسامی ایک معقول مشاہرے پر مستقل طور پر بھی پیش کی گئی لیکن جو راستہ میں نے منتخب کر رکھا تھا اس کی راہ میں میں نے اس ترغیب کو حائل نہیں ہونے دیا۔

یہ مکالمہ ایم اے اصفہانی کی کتاب "قائداعظم میری نظر میں" سے ماخوذ ہے۔

حوصلہ اور عزم کی داستان

۱۹۰۰ء میں نوجوان بیرسٹر محمد علی جناح بمبئی پریزیڈنسی مجسٹریٹ مقرر ہوئے یہ آسامی عارضی تھی جو مستقل مجسٹریٹ ہوشنگ دستور کے چھٹی جانے پر خالی ہوئی تھی۔ تین ماہ کے بعد مزید تین مہینے انہیں اس جگہ پر کام کرنے کا موقعہ ملا۔ بحیثیت مجسٹریٹ کے جناح کی کارکردگی اتنی اچھی تھی کہ چیف مجسٹریٹ سر چارلس اولیونٹ نے ایک ملاقات میں ان سے کہا:

چارلس اولیونٹ: مسٹر جناح! پریزیڈنسی مجسٹریٹ کی حیثیت سے آپ کی کارکردگی بہت ہی قابل قدر رہی ہے۔ اس کے لیے مبارکباد قبول کیجئے۔

جناح: سر اولیونٹ! قدر افزائی کا شکریہ۔

اولیونٹ: جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ آسامی عارضی تھی جلد ہی یہ جگہ مستقل طور پر خالی ہونے والی ہے کیا آپ اس آسامی کو قبول کرنا پسند کریں گے؟

جناح: شکریہ۔ مجھے مزید اس نوکری میں دلچسپی نہیں۔

اولیونٹ: بمبئی کے تمام قانونی حلقوں میں آپ کی قانون دانی اور قوت فیصلہ کی شہرت ہے۔ آپ کے پہلے تقرر پر میکفرسن نے آپ کی سفارش کی تھی آج میں خود آپ کے تقرر کی سفارش کرنا چاہتا ہوں۔

جناح: میں اس عزت افزائی کے لیے آپ کا مزید ممنون ہوں لیکن جیسا کہ میں نے کہا اس نوکری میں میری مزید دلچسپی نہیں۔ اس ملازمت سے جو تجربہ اور معاشی استحکام میں حاصل کرنا چاہتا تھا وہ حاصل کر چکا ہوں۔

اولیونٹ: مسٹر جناح، سوچ لیجئے! جذبات کی رو میں بہہ کر فیصلہ کرنا درست نہیں۔

جناح: سر اولیونٹ! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جذباتی فیصلے کرنا میری عادت ہی نہیں۔ میں نے بہت سوچ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔

اولیونٹ: مسٹر جناح! اس اسامی کی تنخواہ پندرہ سو روپے ماہوار تک جاتی ہے۔

جناح: آپ کی عنایات کا بے حد شکریہ۔ لیکن میں یہ عرض کردوں کہ انشاء اللہ میری آمدنی پندرہ سو روپے روز ہوگی۔

کچھ عرصے کے بعد ایک کلب میں اولیونٹ مسٹر جناح سے دوبارہ ملے۔

اولیونٹ: ہیلو۔ مسٹر جناح، آپ کیسے ہیں؟

جناح: شکریہ، خیریت سے ہوں۔

اولیونٹ آپ کی پریکٹس کا کیا حال ہے؟

جناح اللہ کا شکر ہے کہ ان دنوں میری آمدن دو ہزار روپیہ ماہوار سے زیادہ ہے۔

اولیونٹ آپ نے اچھا کیا کہ میری تجویز نامنظور کر دی تھی۔ آپ بڑے باصلاحیت اور پُرعزم ہیں۔

آخری صف میں جگہ

۱۹۴۶ء میں جب قائداعظمؒ سیاسی مذاکرات کے لیے لندن گئے تو دوران قیام جمعہ آگیا۔ انہوں نے اپنے سیکرٹری سے کہا:

"میں کسی ایسی مسجد میں جمعہ کی نماز کے لیے جانا چاہتا ہوں جو کسی خاص فرقے سے متعلق نہ ہو اور جس میں غریب مسلمان نماز پڑھتے ہوں۔"

چنانچہ جب قائداعظمؒ مشرقی لندن کی ایک مسجد میں جمعہ کی نماز کے لیے پہنچے تو خطبہ شروع ہو چکا تھا لوگوں نے انہیں دیکھتے ہی صفیں خالی کر دیں تاکہ وہ سب سے اگلی صف میں بیٹھ سکیں۔ لیکن خود انہوں نے آخری صف میں بیٹھنا پسند کیا۔

آپ آگے تشریف لائیں..... آگے آیئے!

میں یہیں ٹھیک ہوں۔ میں دیر سے آیا ہوں کسی اور جگہ کا مستحق نہیں۔

اس واقعہ کے عینی شاہد ممتاز حسن مرحوم نے ماہ نو ۵۴ء کے شمارے میں مزید لکھا ہے کہ نماز ختم ہوئی تو چھوٹے چھوٹے بچوں نے انہیں گھیر لیا وہ قائداعظمؒ کو قریب سے دیکھنا اور ہاتھ ملانا چاہتے تھے۔ بچوں کے بعد ہر نمازی نے ان سے مصافحہ کیا۔

مصافحہ کرتے ہوئے ایک بوڑھا شخص رونے لگا اور کہنے لگا۔ اے خدا میری زندگی محمد علی جناحؒ کو بخش دے۔

یہ سارا اجتماع غریب مسلمانوں کا تھا۔ کوئی ملاح تھا کوئی مزدور تو کوئی بس کنڈکٹر

اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ممتاز حسن لکھتے ہیں "اس واقعہ سے جو اپنی نوعیت کا تنہا نہیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ غریبوں سے انہیں کتنا تعلق ہے، فرقہ بندی سے وہ کتنے بلند ہیں۔ شعائرِ اسلام سے انہیں کتنی محبت ہے۔ قائداعظمؒ کی عظمت کا اندازہ وہی کر سکتا ہے۔ جس نے انہیں بہت قریب سے اور مختلف مقامات پر دیکھا ہو۔"

یہ تو اعتماد شکنی ہوئی

یہ واقعہ مارچ ۱۹۴۷ء کا ہے۔ قدرت اللہ شہاب آئی سی ایس ہندوستان کے صوبہ اڑیسہ کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی سیکرٹری کے منصب پر فائز تھے یہ محکمہ صوبہ کے چیف منسٹر ہری کرشن مہتاب کے چارج میں تھا۔ وہ قدرت اللہ شہاب پر بہت اعتماد کرتے تھے اور اکثر اپنے سرکاری اور سیاسی کاغذات ان کی تحویل میں دے دیتے تھے۔ ہری کرشن مہتاب آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ ایک بار وہ دہلی میں کسی میٹنگ سے واپس آئے تو جو کاغذات انہوں نے قدرت اللہ شہاب صاحب کے حوالے کیے ان میں ایک انتہائی خفیہ مراسلہ بھی تھا جو کانگریسی ہائی کمان کی طرف سے کانگریسی چیف منسٹروں کے نام اس ہدایت کے ساتھ جاری کیا تھا کہ ہر چیف منسٹر اسے اپنی ذاتی تحویل میں رکھے اس میں لکھا تھا کہ تقسیم ہند کا معاملہ تقریباً طے پا چکا ہے اس لیے جن صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں قائم ہیں۔ وہاں پر مسلمان افسروں کو کلیدی عہدوں سے تبدیل کر دیا جائے۔ ڈی، سی، آئی جی اور ایس پی عموماً ہندو ہوں۔ تھانوں کے انچارج بھی زیادہ سے زیادہ ہندو ہوں، محکمہ پولیس اور ضلعی انتظامیہ میں مسلمانوں کو فیلڈ ورک سے ہٹا کر بے ضرر قسم کے دفتری کاموں میں لگا دیا جائے۔ پولیس کی نفری میں مسلمان سپاہیوں کو بتدریج غیر مسلح کر کے پولیس لائن اور تھانوں میں معمولی فرائض پر مامور کیا جائے جن صوبوں میں سرحدی مسلمانوں سے بھرتی شدہ

گھڑ سوار ملٹری پولیس ہے اسے فوراً توڑ دیا جائے وغیرہ۔

ان ہدایات سے ظاہر ہوتا تھا کہ کانگریسی حکومتیں مسلمانوں کے خلاف بڑے خطرناک منصوبے بنانے میں مصروف ہیں۔ چنانچہ قدرت اللہ شہاب نے وہ دستاویز جیب میں ڈالی اور دہلی جاکر اسے قائداعظمؒ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

قائداعظم (دستاویز پڑھ کر) ہاں یہ دستاویز ہمارے لیے مفید ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ تم نے کہاں سے حاصل کی ہے؟

قدرت اللہ میں اڑیسہ کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی سیکرٹری ہوں۔ اس محکمہ کے سربراہ چیف منسٹر ہری کرشن مہتاب مجھ پر کافی اعتماد کرتے ہیں اور اکثر اپنے سیاسی اور غیر سیاسی کاغذات میری تحویل میں دے دیتے ہیں یہ دستاویز انہیں نے میرے حوالے کی تھی۔

قائداعظم ویل، ویل، تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ یہ تو اعتماد شکنی ہوئی۔

قدرت جناب، فرائض منصبی اپنی جگہ، میں نے اپنا قومی فرض پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

قائداعظم تم دیکھتے نہیں کہ ہر کاپی پر نمبر لگا ہوا ہے اس کی گمشدگی کا آسانی سے پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ کیا تم ایسا کرنے کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو؟

قدرت جی جناب، میں پوری طرح تیار ہوں۔

قائداعظم (دستاویز اپنے پاس رکھتے ہوئے) آل رائٹ، اب تم جا سکتے ہو۔

جب قدرت اللہ شہاب واپس مڑ کر دروازے کے قریب پہنچے تو قائداعظم نے بلند آواز سے پکار کر کہا "نوجوان آئندہ ایسا نہ کرنا"

یہ واقعہ قدرت اللہ شہاب کی ایک قلمی تحریر سے لفظ بہ لفظ نقل کیا گیا ہے۔

سیاست میں بھی اصولوں کی برتری

سیاست میں بھی اصول کی برتری کو قائم رکھنا قائداعظم ہی کا کام تھا ۱۹۴۶ء کے اوائل

کا ذکر ہے کہ بنگال میں قائدِ اعظمؒ کے ناصر رفیق کار مرزا ابوالحسن اصفہانی کلکتے کی ایک سیٹ کے لیے مسلم لیگی امیدوار تھے اور خیال تھا کہ وہ بلا مقابلہ منتخب ہو جائیں گے عین وقت، پر ایک حریف نے کاغذاتِ نامزدگی داخل کر دیئے اور ترغیب اور دباؤ کے باوجود اس نے دستبردار ہونے سے انکار کر دیا۔ اصفہانی کے قریبی دوست اور ایک ممتاز مسلم لیگی سیاست دان، عبدالرحمان صدیقی نے بڑی کاوشوں سے اسے شیشے میں اتارا اور اسے نام واپس لینے پر آمادہ کر لیا۔ یہ اچھی خبر لے کر صدیقی، اصفہانی کلکتے کی ایک سیٹ کے لیے مسلم لیگی امیدوار تھے اور خیال تھا کہ وہ بلا مقابلہ منتخب ہو جائیں گے۔ عین وقت پر ایک حریف نے کاغذات نامزدگی داخل کر دیئے اور ترغیب اور دباؤ کے باوجود اس نے دستبردار ہونے سے انکار کر دیا۔ اصفہانی کے قریبی دوست اور ایک ممتاز مسلم لیگی سیاست دان، عبدالرحمان صدیقی نے بڑی کاوشوں سے اسے شیشے میں اتارا اور اسے نام واپس لینے پر آمادہ کرلیا۔ یہ اچھی خبر لے کر صدیقی، اصفہانی کے یہاں پہنچے۔ اس زمانے میں قائدِ اعظمؒ بھی اصفہانی کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے ہی یہ گفتگو ہوئی۔

صدیقی اصفہانی! مبارک ہو، بالآخر بات بن گئی۔ وہ شخص اپنا نام واپس لینے پر آمادہ ہو گیا ہے بڑے طویل مذاکرات کرنے پڑے۔

اصفہانی خدا کا شکر ہے کہ یہ مرحلہ طے ہوا۔

صدیقی لیکن اس کی ایک معمولی سی شرط ہے۔

اصفہانی وہ کیا؟

صدیقی وہ یہ کہ تم ڈھائی سو روپے زرِ ضمانت اس کو دے دو جو اس نے نامزدگی کے کاغذات داخل کرتے وقت جمع کرایا تھا۔

قائدِ اعظم صدیقی، براہِ کرم ذرا دہرائیے کہ آپ نے کیا کہا۔ میں نے ٹھیک طرح نہیں سنا۔

صدیقی میں نے عرض کیا تھا کہ اصفہانی کا مدِ مقابل الیکشن سے اپنا نام واپس لینے کے

لیے تیار ہو گیا ہے لیکن وہ ڈھائی سو روپے مانگتا ہے جو اس نے زرِ ضمانت کے طور پر خزانے میں جمع کرائے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اگر ہم روپیہ دے دیں تو جان چھوٹ جائے گی۔

قائداعظم (تیزی سے) روپیہ دے دیں؟ کسی امیدوار کو نام واپس لینے کے لیے بالواسطہ رشوت دی جائے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ اس سے فوراً کہہ دو کہ اس کی یہ پیش کش رد کی جاتی ہے۔ اصفہانی انتخاب لڑیں گے۔ ایسا ہی کیا ہے۔

صدیقی بہت بہتر جناب، میں ابھی جاتا ہوں۔

قائداعظم بیٹا! آدمی یہی جواب دے سکتا ہے۔ سیاست میں اخلاقی استواری نجی زندگی کی نسبت زیادہ اہم ہے۔ اگر تم سیاسی معاملات میں کسی غلطی کے مرتکب ہو گے تو تم بہت سے ایسے لوگوں کو نقصان پہنچاؤ گے جو تم پر اعتماد کرتے ہیں۔

بددیانتی سے بہتر ہار جانا ہے

جنگ، محبت اور سیاست میں لوگ سب کچھ جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن قائداعظم رح کا کردار مختلف تھا۔ وہ سیاست میں بھی دیانتداری کو مقدم سمجھتے تھے اور اس اصول پر سختی سے عمل پیرا تھے۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات سر پر تھے۔ یہ انتخابات پاکستان کے لیے ریفرنڈم کی حیثیت رکھتے تھے سندھ اسمبلی میں مسلمانوں کی ۳۵ نشستیں تھیں قائداعظم رح نے لیگ کے امیدواروں کی مدد کے لیے سات ممبروں کی ایک انتخابی کمیٹی مقرر کی اور جی الانہ کو اس کا سیکرٹری مقرر کیا۔ اس کے چیئرمین یوسف ہارون تھے۔ قائداعظم رح نے جی الانہ کو انتخابی مہم کے لیے کثیر رقم دی اور اراکین پر اس انتخاب کی اہمیت واضح کر کے خود دوسرے صوبوں میں انتخابی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لیے تشریف لے گئے۔ پولنگ سے تقریباً چار ہفتے پہلے قائداعظم کراچی تشریف لائے اور جی الانہ سے یہ گفتگو ہوئی۔

قائداعظمؒ حصول پاکستان کی جدوجہد میں سندھ ایک اہم صوبہ ہے اس صوبے میں مسلم لیگ کو مسلمانوں کی ۳۵ کی ۳۵ نشستیں حاصل کرنی چاہیئں تاکہ یہاں لیگی وزارت بنائی جا سکے۔ الانہ! میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تم مجھے صحیح صورتحال سے آگاہ کرو۔ صوبہ کی انتخابی مہم کیسی جا رہی ہے؟

جی الانہ : جناب، میں آپ سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق شاید ۳۵ میں سے ۵ نشستیں نہ جیت سکیں۔

قائداعظمؒ : سندھ اسمبلی میں کل ۶۰ نشستیں ہیں۔ اگر ہم ۳۵ مسلم نشستوں میں سے ۴ نہ جیت سکے تو وزارت کس طرح بنا سکیں گے؟ یہ صورتحال تو بہت تشویشناک ہے۔

جی الانہ : انتخابی کمیٹی کو بھی یہی پریشانی ہے۔

قائداعظمؒ : لیکن یہ پانچ نشستیں کون سی ہیں اور ان کو حاصل نہ کر سکنے کے کیا اسلوب ہیں؟

جی الانہ : ہمارے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ روپے کی کمی ہے۔ سندھ کے ہندوؤں کے ہاتھ میں موٹر ٹرانسپورٹ اور پٹرول سٹیشن ہیں جب تک ہم لیگ کے امیدواروں کے لیے پٹرول اور گاڑیاں مہیا نہ کریں۔ ان کی کامیابی غیر یقینی رہے گی۔

قائداعظمؒ : تمہیں اور کتنی رقم درکار ہے؟

جی الانہ : ہمیں کم از کم مزید ایک لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔

قائداعظمؒ : میرے پاس جو روپیہ ہے وہ میرا ذاتی نہیں بلکہ مسلمانوں کی امانت ہے۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ ہر روپے پر ہمیں سولہ آنے فائدہ ہو۔

جی الانہ : جی۔

قائداعظمؒ : میں سودے بازی نہیں کر رہا ہوں۔ مزید پچاس ہزار لیجئے اور مجھے یہ یقین دلا دیجئے کہ ہم تمام ۳۵ نشستیں جیت لیں گے۔

جی الانہ : ہم ہر ممکن کوشش کریں گے اور انشاء اللہ تمام نشستیں حاصل کرکے رہیں گے۔

قائدِاعظم ہاں۔ ان مشکل نشستوں میں لیگ کے مقابل کون کون کھڑا ہو رہا ہے؟

جی الانہ ان میں سے ایک نشست پر جی ایم سید سے مقابلہ ہے۔

قائدِاعظمؒ جی ایم سید؟

جی الانہ جی ہاں۔

قائدِاعظمؒ یہ ایک انتہائی نازک انتخاب ہے لیگ کو مسلمانوں کی تمام نشستیں جیتنی چاہئیں خاص طور سے سید کی نشست تو ہمیں بہر قیمت حاصل کرنی ہے۔ آخر اس حلقہ میں ہماری کامیابی کی راہ میں کیا مشکلات ہیں؟

جی الانہ جی ایم سید اپنے ضلع کے انتہائی با اثر شخص ہیں وہ ضلع دادو کے پیر ہیں اور ان کے مریدوں کا حلقہ بہت وسیع ہے ہم نے ان کے مقابل ضلع حیدر آباد کے قاضی اکبر کو کھڑا کیا ہے۔ جی ایم سید کے حامی اس سے فائدہ اٹھا کر لوگوں سے کہتے پھر رہے ہیں کہ قاضی محمد اکبر باہر کے آدمی ہیں۔

قائدِاعظمؒ میں جی ایم سید کی نشست کو انتہائی اہم سمجھتا ہوں۔ بہر صورت یہ نشست حاصل کرنی ہے۔ اس حلقہ میں لٹریچر کی بارش کر دو ورکروں کی فوج بھیج دو۔ جلسے کرو اور قاضی اکبر کو ٹرانسپورٹ کے سلسلے میں ہر قسم کی امداد دو۔

جی الانہ بہت بہتر۔

قائدِاعظمؒ الانہ! تم اپنا ہیڈکوارٹر کراچی سے حیدرآباد منتقل کر دو تاکہ جی ایم سید کے انتخابی حلقے سے قریب رہ سکو۔ میں بہت جلد کل ہند اہمیت کے چند لیڈر اور علی گڑھ سے طالب علم رضاکار بھیجوں گا۔

جی الانہ : شکریہ۔ خدا حافظ۔

جی الانہ کمرہ سے باہر جانے کے لیے مڑتے ہیں کہ قائدِاعظمؒ دوبارہ طلب فرماتے ہیں۔ اپنے قریب کی کرسی پر انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے۔

قائداعظمؒ: ایک بات یاد رکھیے۔ اگرچہ یہ انتخابات اہم ہیں تاہم اس میں جیتنے کے لیے نامناسب طریقے اختیار نہ کیے جائیں۔ مثال کے طور پر آپ کو جی ایم سید کے حلقے میں مسلم لیگ کے نمائندے قاضی اکبر کو بہر قیمت کامیاب کرانا ہے لیکن ووٹروں کو کسی قسم کی رشوت نہیں دی جائے گی۔ میں یہ ہرگز پسند نہیں کروں گا کہ ووٹ خریدنے کے لیے کسی ووٹر کو ایک روپیہ بھی دیا جائے۔ یہ بددیانتی اور بے ایمانی ہے میں اس بے ایمانی کے مقابلہ میں ہار جانے کو ترجیح دوں گا۔

اس واقعہ کے راوی جی الانہ لکھتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ قیام پاکستان جیسے اعلیٰ مقصد کے حصول میں صرف اخلاقی طریقوں ہی کو بروئے کار لانا چاہیئے۔

کرائے کے کارکن بھی نہیں

۱۹۳۷ء میں جب قائداعظمؒ نے مسلم لیگ کی ازسرنو تنظیم شروع کی اور اسے ایک تحریک کے طور پر ملک کے طول و عرض میں پھیلانا شروع کیا تو ہر جگہ باشعور مسلمانوں نے ان کے ساتھ تعاون کیا۔ لیکن شروع میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ایسے منجھے ہوئے سیاسی کارکن تو اور بھی کم تھے جو اچھے مقرر ہوں اور عوام میں کام کر سکیں۔ یہی صورت حال ۱۹۳۷ء میں شملہ میں تھی۔ وہاں کے ایک دردمند مسلمان پیرزادہ محمد ذکاءاللہ نے مسلم لیگ کے لیے پُرجوش طریقے سے کام شروع کیا لیکن کچھ عرصے کے بعد انہیں اندازہ ہوا کہ عوام میں سیاسی کام کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلم لیگ کے ساتھ دو ایک عوامی مقرر بھی ہونے چاہئیں۔ چنانچہ بڑی تگ و دو کے بعد انہوں نے ایک ایسے مسلمان کانگریسی ورکر کو مسلم لیگ کیلئے کام کرنے پر راضی کیا اور رسمی اجازت لینے قائداعظمؒ کی خدمت میں باریاب ہوئے۔

ذکاءاللہ: ہمیں شملہ میں مسلم لیگ کی تحریک کو عوام میں مقبول بنانے کے لیے ایک تجربہ کار سیاسی کارکن اور خوش بیان مقرر کی اشد ضرورت تھی۔ بڑی کوششوں کے بعد ہم

ایک ایسے شخص کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

قائداعظمؒ : یہ تو اچھی خبر ہے۔

پیرزادہ : مگر اس کانگریسی مسلمان مفرور سیاسی کارکن کا ایک معمولی سا مطالبہ بھی ہے۔

قائداعظمؒ : کیا؟

پیرزادہ : کہ لیگ اس کے گزارے کے لیے صرف سو روپیہ ماہانہ کا انتظام کر دے۔ اگر ضروری ہوا تو ہم لوگ خود ہی اس رقم کا انتظام کر لیں گے۔ لیگ کے مرکزی فنڈ پر اس کا بار نہ ڈالیں گے۔ صرف آپ کی اجازت کی دیر ہے۔

قائداعظمؒ (قدرے ناخوشی کے ساتھ)
مجھے افسوس ہے کہ میں اس تجویز سے اتفاق نہیں کر سکتا خواہ روپیہ کوئی دے۔

پیرزادہ میں تو سمجھا تھا کہ میں ایک اہم خبر لے کر آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں اور آپ میری تجویز کا خیر مقدم کریں گے۔ آخر ہمارے پاس کارکن ہیں ہی کتنے اور ان میں سے بھی کتنے ایسے ہیں جو عام مسلمانوں پر اثر ڈال سکتے ہوں۔

قائداعظمؒ دیکھئے مسٹر پیرزادہ! میں آپ کی نیک نیتی سے پیش کی ہوئی تجویز کو اس لیے منظور نہیں کر سکتا کہ یہ کام مسلمانوں کا اپنا کام ہے اور اسے کرنے کے لیے کسی مسلمان کو رشوت دینا میرے لیے قطعاً ناجائز ہے۔ اگر آپ کے دوست واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں مسلم لیگ میں آکر کام کرنا چاہیئے تو اس کے لیے شرطیں ٹھہرانا کیا معنی۔ دوسرے ہم ایک غریب قوم ہیں۔ آپ کے دوست ہم سے صرف ایک سو روپے مانگتے ہیں۔ اگر ہم ان کی شرط منظور بھی کر لیں۔ اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہم سے زیادہ مالدار قوم ہم سے زیادہ دام دے کر انہیں ہم سے دوبارہ چھین نہ لے گی۔ تم ان کے پاس جاؤ اور کہو اگر وہ آکر ہم میں شامل ہو جائیں گے تو ہم دل و جان سے ان کا استقبال کریں گے جو روکھی سوکھی ہمیں میسر ہے

اس میں وہ بھی ہمارے حصہ دار ہوں گے لیکن اگر وہ پیشگی شرط منوانا چاہتے ہیں تو بہتر ہوگا کہ جہاں ہیں وہیں رہیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ صاحب، مسلم لیگ کا کام کرنے پر تیار نہیں ہوئے لیکن قائداعظم نے سیاسی رشوت دینے کی اجازت نہیں دی۔

اس واقعہ کا تذکرہ ممتاز حسن نے پیرزادہ ذکاراللہ کے حوالہ سے دسمبر ۱۹۵۴ء کے ماہِ نو میں کیا ہے۔

پہلا سبق، میں مسلمان ہوں

اپریل ۱۹۴۵ء میں قائداعظمؒ، خان آف قلات کی دعوت پر بحالی صحت اور آرام کے لیے بلوچستان تشریف لے گئے۔ پہلے انہوں نے کچھ وقت کوئٹے میں گزارا جب طبیعت کچھ سنبھلی تو مستونگ اور قلات کا دورہ کیا۔ اس موقع پر خان آف قلات نے ان سے ایک اسکول کا معائنہ کرنے کی درخواست کی۔

قائداعظمؒ ننھے منے چاق و چوبند بچوں سے مل کر بہت خوش ہوئے اور ان سے گھل مل گئے۔

قائداعظمؒ: (ایک بچہ سے، خان قلات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ کون ہیں؟

بچہ: یہ ہمارے بادشاہ ہیں۔

قائداعظمؒ: میں کون ہوں؟

بچہ: آپ ہمارے بادشاہ کے مہمان ہیں۔

قائداعظمؒ: تم کون ہو؟

بچہ: میں تو بلوچ ہوں۔

قائداعظمؒ: (خان قلات سے) اب آپ ان کو پہلا سبق یہ پڑھائیے کہ میں مسلمان ہوں۔

(بچوں سے) بچو! تم پہلے مسلمان ہو، پھر بلوچ یا کچھ اور۔

یہ واقعہ خان قلات نے کئی محفلوں میں خود سنایا۔ قائداعظمیات کے معروف محقق رضوان احمد ۱۳؍اکتوبر ۱۹۸۱ء کے جنگ میں یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

قائداعظمؒ کو بلوچستان بہت عزیز تھا۔ وہ ایک عرصے تک بلوچستان کے آئینی حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔

۱۹۴۲ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس الہ آباد میں ہوا تھا۔ اس اجلاس میں قائداعظمؒ کی صدارت میں بلوچستان کو دوسرے صوبوں کے مساوی آئینی حقوق دینے کی قرارداد منظور کی گئی۔

اس اجلاس کی ایک تاریخی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں قائداعظمؒ نے واشگاف الفاظ میں فرمایا: "میں آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا دل دراصل غریبوں کے ساتھ دھڑکتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ جوں جوں ہم ساتھ ساتھ قدم بڑھائیں گے۔ ہمارے غریب عوام محسوس کریں گے کہ میں ان کا خادم ہوں۔ اگر میں کامیاب ہوگیا تو یہ میرے لیے خوشی کا مقام ہوگا کہ میں نے غریب عوام کی خدمت کی اور ان کا معیار بلند کیا۔

کوئی ازم نہیں

۱۹۴۴ء میں پنجاب کے جاٹوں نے ایک نیا شوشہ چھوڑا تھا کہ ہندو جاٹ اور مسلم جاٹ ایک ہیں اور ان کے مفادات مشترک ہیں۔ ذات پات کے تعصبات کو ابھار کر مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی یہ ایک خطرناک سازش تھی۔ ۱۹؍مارچ ۱۹۴۴ء کو پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے فرمایا۔

قائداعظمؒ ہماری بنیاد کی چٹان اور ہماری اور ہماری کشتی کا لنگر اسلام ہے اور صرف اسلام ہے۔ ذات پات کیا، شیعہ سنی کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہم ایک ہیں اور ہمیں بحیثیت ایک متحد قوم ہی کے آگے بڑھنا ہے صرف ایک رہ کر ہی ہم پاکستان

کو قائم رکھ سکیں گے۔ میں یہاں کمیونسٹ پارٹی کو بھی خبردار کرنا چاہتا ہوں بہتر یہ ہے کہ کمیونسٹ مسلمانوں پر ہاتھ نہ ڈالیں۔ ہمارے لیے صرف اسلام ہی کافی وشافی ہے۔ یہی ہماری زندگی کا مکمل آئین ہے ہمیں کسی ازم کی ضرورت نہیں۔

پیسے پیسے کا حساب

قائد اعظمؒ بہت ہی محتاط طبیعت کے مالک تھے۔ عوام سے جو روپیہ انہیں وصول ہوتا تھا اس کا حساب دینے میں نہایت پابندی برتتے تھے۔ جب بھی انہوں نے مسلم لیگ کی طرف سے یا مصیبت زدہ مسلمانوں کی امداد کے لیے روپیہ کی درخواست کی مسلم عوام کی طرف سے اس کا بڑا حوصلہ افزا جواب ملا ۱۹۴۶ء کی انتخابی مہم کے لیے ہر روز ڈاکیہ چھوٹی بڑی سب طرح کی رقموں کے منی آرڈر کثیر تعداد میں لایا کرتا تھا۔ قائداعظم نے اپنے سیکرٹری کو حکم دے رکھا تھا کہ ساری رسیدیں خود ان کے دستخطوں کے لیے پیش کی جائیں اور پیسے پیسے کا باقاعدہ حساب رکھا جائے۔ چنانچہ رسید چار آنے کی ہو یا دس ہزار روپے کی۔ ان کے دستخطوں کے لیے پیش کی جاتی۔ اس طرح ان کا خاصا وقت ان چھوٹی چھوٹی رسیدوں پر دستخط کرنے میں صرف ہو جاتا ایک روز ان کے سیکرٹری نے کہا۔

سیکرٹری: جناب اس طرح چھوٹی بڑی رسیدوں پر دستخط کرنے میں آپ کا خاصا وقت صرف ہو جاتا ہے۔ اگر آپ رسیدوں پر دستخط کرنے کا کام کسی اور کے سپرد کر دیں تو کیا بہتر نہ ہو گا۔ حساب کا گوشوارہ آپ دیکھ لیا کریں۔

قائداعظمؒ: ہرگز نہیں۔ رسیدوں پر مجھے خود دستخط کرنے چاہییں۔ اس غریب شخص کے لیے جو مجھے چار آنے بھیجتا ہے۔ یہ ایسی ہی ہوگی جتنی کہ دس ہزار یا بیس ہزار کے عطیے کی۔ اس غریب آدمی کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ میں اس کی مدد کی قدر کرتا ہوں اور اس کے عطیے کو قیمتی سمجھتا ہوں۔ علاوہ ازیں جب میں کسی رسید پر دستخط

کرتا ہوں تو مجھے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنے پیش نظر مقصد کے لیے ہمیں ایک اور خیر خواہ مل گیا ہے اس مسرت سے بڑھ کر مجھے قوم سے اور کیا انعام مل سکتا ہے بہر صورت چند سو رسیدوں پر دستخط کرنے سے مجھے کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ عوام کی امداد و تائید سے لیگ کی اور میری قوت میں اضافہ ہو گا اور اپنی جدوجہد میں کامیاب ہونے کے لیے ہمیں اس قوت کی ضرورت ہے۔

یہ واقعہ مرزا ابوالحسن اصفہانی نے اپنی کتاب قائداعظم محمد علی جناح رح میں بیان کیا ہے۔

صرف ضروری خرچ

قائداعظم رح زیارت میں ڈاکٹر الٰہی بخش کے زیر علاج تھے جولائی ۴۸ء کے آخر میں جب زیارت کا موسم ٹھنڈا ہونے لگا تو انہوں نے دیکھا کہ قائداعظم رح کے کپڑے کافی گرم نہیں ہیں ان کو سردی لگ جانے کا اندیشہ تھا اس لیے انہوں نے محترمہ فاطمہ جناح کی اجازت سے گرم کپڑوں کے لیے کراچی لکھ دیا۔ دوسرے دن ان کی قائداعظم رح سے یہ گفتگو ہوئی۔

ڈاکٹر الٰہی بخش: جناب پاجامے جو پہنتے ہیں بہت ہلکے ہیں۔ ڈر ہے کہ کہیں آپ کو سردی نہ لگ جائے۔

قائداعظم رح: میرے پاس ریشمی پاجامے ہیں۔ خیال ہے کہ گاڑھے کے پاجامے بنوا لیے جائیں۔

ڈاکٹر: لیکن جناب، سوتی کپڑے کے پاجامے مناسب نہیں ہوں گے۔ آپ کو اونی کپڑے پہننے کی ضرورت ہے۔

قائداعظم رح: لیکن میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میرے پاس اور پاجامے نہیں ہیں۔

ڈاکٹر: میرا خیال تھا کہ آپ کو اونی پاجامے پہننے چاہئیں اس لیے آپ کی اجازت کے بغیر ہی میں نے ۳۰ گز وائلا کے لیے کراچی لکھ بھیجا ہے۔

قائداعظم رح: ڈاکٹر! سنیئے، میری نصیحت یہ ہے کہ جب آپ کچھ خریدنا چاہیں تو دوبارہ غور کر لیا کریں کہ کیا اس کے بغیر کام چل سکتا ہے یا نہیں یا واقعی اس کی ضرورت ہے۔

اصل میں مسئلہ تھوڑے سے فضول خرچ چند گز کپڑے کا نہیں تھا، ایک اصول کا تھا قائدِ اعظمؒ تھوڑے سے فضول خرچ کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا مزاج منطقی تھا۔ جب ڈاکٹر الٰہی بخش نے انہیں ادنی کپڑوں کی ضرورت پر قائل کر لیا تو ان کی ناراضگی جاتی رہی۔

ننھے منے بچوں کو تیرتے دیکھ کر مجھے خوشی ہو گی

یہ واقعہ ۱۹۴۵ء کے بعد کا ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے لاہور میں اپنی رہائش کے لیے ایک بنگلہ تین لاکھ پینتیس ہزار میں میاں نذیر احمد ایڈووکیٹ سے خریدا تھا۔ یہ بنگلہ لینے کے بعد وہ اکثر لاہور آکر اسی بنگلے میں ٹھہرتے تھے۔ ایک روز قائدِ اعظمؒ کی اس زمانے کے مشہور مسلم لیگی لیڈر میاں امیر الدین سے یہ گفتگو ہوئی۔

قائدِ اعظمؒ: میاں صاحب! میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ کی وساطت سے مجھے یہ بنگلہ مل گیا۔ قیمت بھی واجبی ہے۔

میاں امیر الدین: جی ہاں۔ یہ لاہور چھاؤنی کا سب سے اچھا بنگلہ ہے۔

قائدِ اعظمؒ: میاں صاحب! اب جب کہ میں زیادہ تر لاہور ہی میں رہنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ آپ ایک ایسا بنگلہ ڈھونڈیں جو اس سے خاصا بڑا ہو اور ہو سکے تو اس میں تیراکی کا ایک تالاب بھی ہو۔

میاں امیر الدین: (حیرت سے) تیراکی کا تالاب؟

قائدِ اعظمؒ: جی ہاں۔ اگرچہ مجھے تیرنا نہیں آتا۔ مگر ننھے منے بچوں کو تیرنا دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی ہے۔

میاں صاحب کہتے ہیں کہ ابھی ہم ایک ایسا بنگلہ ڈھونڈ ہی رہے تھے کہ پورا پنجاب ہندو مسلم فسادات کی لپیٹ میں آگیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔ پاکستان بننے کے بعد جب میں قائدِ اعظمؒ سے کراچی میں گورنر جنرل ہاؤس میں ملا تو وہ بنگلے کی بات بھولے نہیں تھے۔ انہوں نے مجھ سے پھر کہا:

میاں صاحب! مناسب بنگلہ آپ ضرور تلاش کریں۔ اس منصب سے سبکدوش ہونے کے بعد میں لاہور میں رہنا چاہتا ہوں۔

یہ واقعات ۱۱ ستمبر ۱۹۸۱ء کے مشرق میگزین میں عمر سلیم نے میاں امیر الدین اور میاں صلاح الدین کے حوالے سے لکھے ہیں۔

تحریک پاکستان اور مسلمان بچے

قائد اعظمؒ کے سیکرٹری مطلوب الحسن سید نے اپنی کتاب "ہمارے قائد اعظمؒ" میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں قرارداد پاکستان منظور ہونے کے چھ مہینے بعد قائد اعظمؒ سے اپنی ایک گفتگو نقل کی ہے۔

سید : سر آپ اجازت دیں تو میں کل کا ایک واقعہ بیان کروں، جس کا بالواسطہ تعلق تحریک پاکستان سے ہے۔

قائد اعظمؒ : ٹھیک۔

سید : سر، کل میں محمد علی روڈ سے گزر رہا تھا میں نے دیکھا کہ ایک لڑکے نے جس کی عمر بمشکل دس سال کی ہوگی۔ کسی چیز سے ٹھوکر کھائی اور گر پڑا۔ اس کے سر میں چوٹ آئی۔ اور خون بہنے لگا۔ لڑکے نے جب سر سے خون پونچھا تو اس کو دیکھ کر رونے لگا۔ وہاں سے ایک نوجوان گزر رہا تھا۔ اس نے اس لڑکے کو ملامت کی اور کہا کہ مسلمان ہو کر ذرا خون بہہ جانے پر روتا ہے۔ بچے نے کہا میں اس لیے نہیں روتا کہ خون بہہ گیا بلکہ اس لیے روتا ہوں کہ یہ ضائع جا رہا ہے۔ میں نے تو یہ خون پاکستان حاصل کرنے کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔

قائد اعظمؒ سید! جب قوم کے بچوں کا یہ جوش و جذبہ ہے تو کوئی طاقت پاکستان کو بننے سے نہیں روک سکتی۔ اگر ہمارے مخالفوں کو عقل آ گئی اور ان کی نیتوں میں فتور نہ ہوا

توانشاءاللہ ایک قطرہ بھی خون بہنے کی نوبت نہیں آئے گی اور اگر انہوں نے ہٹ دھرمی سے کام لیا تو دونوں طرف سے خون بہے گا۔

جب ۱۹۴۱ء میں مدراس میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سے فارغ ہو کر قائداعظمؒ جنوبی ہند کے ایک پُرفضا پہاڑی مقام اوٹا کمنڈ کی طرف کار سے روانہ ہوئے تو راستہ میں انہیں جگہ جگہ رُکنا پڑا۔ چونکہ وہاں کے دیہاتی مسلمانوں نے ان کے استقبال کا انتظام کیا ہوا تھا۔ ایک چھوٹے سے گاؤں کے لوگوں نے جس میں مشکل سے سو گھر ہوں گے۔ قائداعظم کو اصرار سے روکا کہ وہ ان سے خطاب کریں۔ ان مخلص دیہاتیوں نے چائے کا بھی انتظام کیا قائداعظمؒ ان کے خلوص اور جذبے سے بہت متاثر ہوئے۔ رُکے، خطاب کیا اور پھر ان کے ساتھ چائے پی۔ ابھی چائے پی ہی جا رہی تھی تو اس تقریب سے دور ایک لڑکا جس کی عمر مشکل سے ۹ سال کی ہوگی، نعرے لگا رہا تھا: "مسلم لیگ زندہ باد" قائداعظم زندہ باد۔ لے کے رہیں گے پاکستان۔ بن کے رہے گا پاکستان"۔ اس کے بدن پر پھٹے پرانے چیتھڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ قائداعظمؒ نے یہ دیکھا تو بہت متاثر ہوئے اور میزبان سے کہا، اس کو میرے پاس بلوائیے جب وہ کم عمر بچہ قائداعظمؒ کے سامنے پیش کیا گیا تو یہ باتیں ہوئیں۔

قائداعظم بچے آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔ تمہارا نام کیا ہے؟ (کچھ دیر چپ رہنے کے بعد ڈرتے ڈرتے) ابراہیم

قائداعظمؒ ابراہیم! گھبراؤ نہیں بچے، یہ بتاؤ تم نعرہ لگاتے ہو کہ پاکستان لے کر رہیں گے مگر کیا تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ پاکستان کس چیز کو کہتے ہیں؟

لڑکا (کچھ ہمت کر کے) مجھے اس کے سوا کچھ نہیں معلوم جہاں ہندو ہوں وہاں ہندوؤں کی حکومت اور جہاں مسلمان ہوں وہاں مسلمانوں کی حکومت ہونی چاہیئے۔

قائداعظمؒ شاباش! قرارداد لاہور کی اس سے بہتر کوئی اور وضاحت نہیں ہو سکتی۔

اوٹا کمنڈ پہنچنے کے بعد قائداعظمؒ نے مطلوب الحسن سید سے کہا۔

قائداعظمؒ سید! اس لڑکے کی بات تم نے سنی تھی؟

سید جی۔ میں پاس ہی تھا۔

قائداعظمؒ تعجب ہے کہ اس جگہ نہ کوئی اخبار آتا ہے نہ دیہاتیوں کے پاس ریڈیو ہے۔ پھر اس بچے کے ذہن میں پاکستان کے متعلق اتنی صحیح تعریف کیسے آئی۔

سید : جی۔

قائداعظمؒ اب پاکستان کو کوئی نہیں روک سکے گا۔

قائداعظمؒ کے سیکرٹری مطلوب الحسن سید نے یہ واقعہ اپنی کتاب ہمارے قائداعظمؒ میں بیان کیا ہے۔

پاکستان کا نقشہ

اوائل ۱۹۴۳ء میں وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے قائداعظمؒ کو مذاکرات کے لیے دعوت دی۔ ان مذاکرات کے دوران ایک مرحلہ پر یہ گفتگو ہوئی۔ اگر آپ یہ ضد چھوڑ دیں کہ پاکستان بننا چاہیے اور مسلمان علیحدہ قوم تسلیم کیے جانے چاہیئں تو میں فریق ثانی کو قائل کر سکتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کو بہت سی مراعات دے۔

قائداعظمؒ اس بات کا جواب میں آئندہ ملاقات میں دوں گا۔

چند روز بعد جب قائداعظمؒ دوبارہ ملاقات کے لیے گئے تو ان کی جیب میں ایک ریشمی رومال تھا جس پر ہندوستان کا نقشہ کڑھا ہوا تھا اور جس میں مسلمانوں — اکثریتی صوبے سبز رنگ سے دکھائے گئے تھے۔

قائداعظمؒ یہ ریشمی رومال دیکھیے۔

وائسرائے بہت خوب۔ کشیدہ کاری کا بہت اعلیٰ نمونہ ہے۔

قائداعظمؒ یہ میں نے آپ کو دست کاری کے نمونے کے طور پر نہیں دکھایا۔ یہ نقشہ ایک

۱۱ سال کی لڑکی نے کاڑھا ہے، جو پرانی وضع کے مسلمان گھر میں یوپی میں پیدا ہوئی۔ گھر میں پردہ کی سخت پابندی تھی۔ اس لیے یہ لڑکی کسی مدرسے میں پڑھنے کے لیے نہیں بھیجی گئی۔ اس نے نہایت محنت سے یہ نقشہ بنایا اور نہایت شوق سے اپنے ہاتھوں سے مجھے پیش کیا۔

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں لوگوں کو سکھاتا ہوں کہ وہ پاکستان مانگیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ خیال اب نوخیز طبقے کے رگ و پے میں بھی سرایت کر گیا ہے اور جب میں اس پر زور دیتا ہوں۔ تو فقط اپنی قوم کے خیالات کی ترجمانی کرتا ہوں۔

یہ واقعہ ۱۹۴۳ء میں کوئٹے میں ایک چائے کی دعوت کے موقع پر سر عبدالقادر نے خود قائداعظمؒ سے سنا اور بعد کو اپنے مضمون میں نقل کیا۔ جو قائداعظمؒ میری نظر میں نامی کتاب میں شامل ہے۔

ایک طالب علم کی سوچ کا کرشمہ

۱۱ جولائی ۱۹۴۷ء کو اعلان ہوا تھا کہ قائداعظمؒ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل ہوں گے دوسرے روز جو ملاقاتی قائداعظمؒ کی خدمت میں سب سے پہلے پیش ہوئے ان میں جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر چودھری حمید اللہ خان اور ایک سیاسی کارکن پروفیسر محمد اسحاق قریشی تھے۔

پہلے قائداعظمؒ نے اس سازش کا تذکرہ کیا، جس کے ذریعے ماؤنٹ بیٹن پاکستان اور ہندوستان کا مشترکہ گورنر جنرل بننا چاہتا تھا۔ قائداعظمؒ کا خیال تھا کہ اگر مسلم لیگ اس جال میں پھنس جاتی تو پاکستان اپنے قیام کے ابتدائی مرحلے میں ہی تباہ ہو جاتا اس کے بعد قائداعظمؒ نے اپنی سیاسی جدوجہد کے بعض دلچسپ واقعات سنائے اور اس ضمن میں انہوں نے فرمایا:

قائداعظمؒ: میرا خیال ہے کہ فہم و فراست اور دانائی مخصوص آدمیوں کی میراث نہیں اس لیے سیاسی امور میں بھی زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ساتھ مشورہ کرنا اور ہر طرح کے اور ہر طبقے کے لوگوں سے مشورہ کرنا مفید ہوتا ہے۔ بعض اوقات بظاہر ایک غیر اہم گمنام آدمی بھی کوئی کام کی بات سمجھا دیتا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں کانگریسی وزارتوں کے خلاف یوم نجات منانے کا مشورہ آپ کا کیا خیال ہے مجھے کس نے دیا ہوگا۔

پروفیسر اسحاق: آپ فرمائیں۔

قائداعظمؒ: یہ تجویز دسویں درجے کے ایک گمنام مسلمان طالب علم نے مجھے خط کے ذریعہ لکھ کے بھیجی تھی۔ میں نے اسے فوراً قبول کر لیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مسلم لیگ کی اس تحریک نے کانگریس کو سب سے پہلی سیاسی شکست دی تھی۔ اس تحریک نے ہمیں بھی اپنی قوت کا احساس دلایا اور ہم اعتماد اور عزم کے ساتھ آگے بڑھ سکے اور یہ کرشمہ اسکول کے طالب علم کی سوچ کا تھا۔

قائداعظمؒ کے ان ملفوظات کو پروفیسر محمد اسحاقؔ نے ۲۵ دسمبر ۷۳ء کے نوائے وقت میں نقل کیا ہے۔

بچوں کی دانائی

پاکستان بننے سے کئی سال پہلے، قائداعظمؒ بمبئی سے دہلی جا رہے تھے۔ جب رات کے ڈیڑھ بجے کے قریب ان کی گاڑی ایک غیر معروف ریلوے سٹیشن پر رکی تو کسی نے زور سے اس ڈبے کی کھڑکی کو کھٹکھٹایا، جس میں قائداعظمؒ سفر کر رہے تھے۔ رات اور وہ بھی سردیوں کی رات، قائداعظمؒ کے ملازم کھڑکی کھولنا نہیں چاہتے تھے۔ قائداعظمؒ کے کہنے پر انہوں نے کھڑکی کھولی تو دیکھا کہ دو کم سن بچے سردی میں ٹھٹھر رہے تھے۔ قائداعظمؒ کو بڑا تعجب ہوا اور پوچھا۔

قائداعظمؒ تم اس وقت، یہاں کیا کر رہے ہو؟

بچے ہم آپ کو دیکھنے آئے ہیں۔

قائداعظمؒ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں اس گاڑی سے آرہا ہوں۔

بچے ہم نے اخبار میں پڑھا تھا اور پھر خود اندازہ لگایا کہ تقریباً اس وقت آپ کی گاڑی یہاں پہنچے گی۔

قائداعظمؒ تم مجھے کیوں دیکھنا چاہتے تھے۔

بچے آپ ہمارے لیے پاکستان بنا رہے ہیں نا۔

قائداعظمؒ اچھا اب یہ بتاؤ کہ پاکستان کا مطلب کیا ہے؟

بچے وہ ملک جہاں مسلمانوں کی حکومت ہو گی۔

قائداعظمؒ نے یہ واقعہ ١١ر جولائی ٤٧ ١٩ء کو جموں کشمیر مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر چودھری حمید اللہ خان اور سیاسی کارکن محمد اسحاق قریشی کو سنایا اور آخر میں فرمایا:

دیکھئے گاندھی اور نہرو کہتے ہیں کہ انہیں پاکستان کا مطلب سمجھ نہیں آتا حالانکہ اگر سمجھنے کی بات ہو تو اسکول کے کمسن بچے بھی اس کو سمجھ سکتے ہیں۔

(حوالے کے لیے "نقوش قائداعظمؒ" صہ ٢٢٤ دیکھئے)

ایک بچے کا قومی احساس

١٩٤٠ء میں قائداعظمؒ دہلی سے لاہور تشریف لے جا رہے تھے، غازی آباد کے ریلوے اسٹیشن پر گاڑی رکی اور قائداعظمؒ نیچے اترے تو دیکھا کہ دس برس کا ایک بچہ پھولوں کا ہار لیے کھڑا ہے۔ دوسرے استقبالیوں کو چھوڑ کر قائداعظمؒ از خود اس کی طرف بڑھے اور کافی جھک کر اسے اپنے گلے میں ہار ڈالنے کا موقعہ دیا۔ پھر یہ باتیں ہوئیں۔

قائداعظمؒ: بچے۔ تم کیوں آئے ہو؟

بچّہ آپ کو دیکھنے کے لیے۔
قائداعظمؒ تم مجھے دیکھنے کیوں آئے ہو؟
بچّہ قوم کے لیے۔
قائداعظمؒ (بچے کی پیٹھ ٹھونک کر) شاباش۔ (پھر خوشی کے ساتھ حاضرین سے)
مسلمانوں کے بچوں میں بھی اب قوم کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔

اس واقعہ کو محمد اظہار الحسن کے حوالے سے "زندہ قائداعظمؒ" نامی کتاب میں نقل کیا گیا ہے۔

نوجوان، قوم کا میگزین

۱۹۳۷ء میں قائداعظمؒ مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لیے پٹنہ تشریف لے گئے۔ بڑا شاندار استقبال ہوا۔ مسٹر حسن امام کی کوٹھی کے میدان میں ایک جلسہ ہوا۔ قائداعظمؒ نے تقریر کی اور سامعین کو مسلم لیگ میں شمولیت کی دعوت دی۔ تقریر کے دوران انہوں نے کہا۔

قائداعظمؒ ہم بغیر میگزین کے ایک جنگ لڑ رہے ہیں۔
ایک نوجوان (کھڑے ہو کر) ہم آپ کا میگزین ہیں۔
قائداعظمؒ شاباش! میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔

اس واقعہ کا تذکرہ محمد انیس الرحمان نے جنگ کے ۱۹۷۵ء کے یوم پاکستان ایڈیشن میں کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان کے حصول کی جنگ میں قائداعظمؒ نوجوانوں کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔

بہت سے جناح

قائداعظمؒ کو نوجوانوں سے بہت امیدیں تھیں اور ان پر بہت اعتماد بھی تھا۔ حصول پاکستان کی جنگ لڑنے کے لیے قائداعظمؒ نے نوجوانوں خاص طور پر نوجوان طلبا

ہی لو آگے بڑھایا۔ ۱۹۳۷ء میں انہوں نے آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن منظم کی اس کا پہلا اجلاس قائداعظمؒ کی صدارت میں ۱۹۳۷ء میں کلکتہ میں ہوا۔ انہوں نے کہا:

قائداعظمؒ آپ لوگ تحریک پاکستان کا ہراول دستہ ہیں۔ نوجوان نسل سے مجھے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔

مجھے یقین ہے تم میں سے بہت سے جناح اٹھیں گے۔

طلبا جناب، آئندہ کیا ہوگا؟

قائداعظمؒ مستقبل تمہارے ہاتھوں میں محفوظ ہے۔

قومی کردار کی ضرورت

قائداعظمؒ اسلامیہ کالج لاہور کے غیور طلبا کی خدمات کی بہت قدر کرتے تھے اور ان پر بہت مہربان تھے۔ ایک بار طلبہ کی ایک محفل میں جس میں حکیم آفتاب احمد قرشی بھی موجود تھے۔ قائداعظمؒ مسلمانوں کے عروج وزوال پر تبصرہ کر رہے تھے۔

کسی طالب علم نے پوچھ لیا:

طالب علم آخر ہم میں سب سے بڑی کمی کیا ہے؟

قائداعظمؒ ہندی مسلمانوں میں قومی کردار کی کمی ہے۔ نوجوانوں کو اپنی سیرت کی تعمیر کرنی چاہیئے اور قومی کردار پیدا کرنا چاہیئے۔

یہ سن کر آفتاب قرشی نے کچھ کہا تو نہیں، لیکن ان کے چہرے سے قائداعظمؒ نے ان کے جذبات کو پڑھ لیا اور کہا:

قائداعظمؒ: تم نوجوان ہو، مخلص ہو اس لیے تم ہر شخص کو اپنے جیسا سمجھتے ہو۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ زمانے کے انقلابات سے گزرا ہوں۔ مجھے مسلمان قوم کا خوب علم ہے اب حالت پہلے سے بہتر ہوگئی ہے۔ مسلمان بیدار ہو رہے ہیں مگر اب

بھی مسلمان قوم میں ایسے افراد موجود ہیں جو ذاتی مفاد کو ملی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ مسلمان قوم کی سب سے بڑی ضرورت، قومی کردار ہے۔

یہ گفتگو حکیم آفتاب احمد قرشی نے ۱۴ اپریل ۱۹۸۰ء کے جنگ میں اپنے ایک مضمون میں نقل کی ہے۔

ترقی کے لامحدود امکانات

اگست ۱۹۴۸ء میں زیارت سے کوئٹہ آکر قائداعظمؒ کی صحت کچھ دنوں تک بہتر ہوتی رہی۔ اس عرصے میں ان کے ایک معالج ڈاکٹر ریاض علی شاہ کو لاہور جانا پڑا جب واپس آئے تو یہ گفتگو ہوئی۔

قائداعظمؒ آپ خیریت سے واپس آ گئے۔

ڈاکٹر شاہ جی ہاں۔ شکر ہے۔ میں بال بچوں کو ساتھ لے آیا ہوں۔

قائداعظم اچھا کیا۔

ڈاکٹر شاہ اب آپ اندر سے کیا محسوس کرتے ہیں؟

قائداعظم میں بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ (قدرے توقف کے بعد)

پاکستان کو خدا نے ہر چیز دے رکھی ہے۔ معدنیات و زراعت کے وسیع وسائل اقتصادیات کی ترقی کے روشن امکانات، ملک کو صنعتی بنانے کے ذرائع غرضیکہ ہر چیز پاکستان میں موجود ہے۔ قدرت کی فیاضی نے اس ملک کو دولت سے مالا مال کر رکھا ہے۔

لیکن ضرورت، محنت، خلوص اور دیانتداری کی ہے۔ اگر پاکستانی مسلمان اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کر سکے۔ انشاء اللہ میری قوم میں یہ اوصاف پیدا ہو کر رہیں گے۔ میں مسلمانوں سے کبھی مایوس نہیں ہوا۔ میرے ہادی اور آقا کی تعلیمات میں مایوسی کا لفظ تک نہیں۔

زندہ قوموں کو انتہائی مصائب اور مشکلات میں بھی مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ مسلمان

کو تو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب وہ مصیبتوں، مشکلوں، طوفانوں اور آندھیوں میں گھر جائے تو غیر اللہ سے رشتہ توڑ کر اپنے خدا کی طرف رجوع کرے کیونکہ وہ مصیبتوں کو راحتوں میں بدلنے پر قادر ہے تو پھر مسلمان کسی مصیبت سے خوفزدہ کیوں ہو مسلمانوں کو دشمن کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے گھبرانا نہیں چاہیئے بلکہ پوری قوت سے ان کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

قائداعظم رح کے یہ ملفوظات ڈاکٹر ریاض علی شاہ کے روزنامچہ سے اخذ کیے گئے ہیں۔

پاکستان کا روشن مستقبل

جولائی ۱۹۴۸ء کے اواخر میں قائداعظم رح کی صحت قدرے بہتر ہو گئی تھی یعنوڑی بہت توانائی بحال ہوتے ہی وہ اکثر اپنے معالجوں سے مختلف موضوعات پر بحث کرتے بلیشتر نوان کی گفتگو کا موضوع پاکستان ہی ہوتا۔ ایک روز جب ڈاکٹر ریاض علی شاہ ان کے انجکشن لگا چکے تو کچھ دیر ان کے پاس ٹھہرے رہے قائداعظم رح نے کہا۔

قائداعظم رح: ڈاکٹر صاحب! اب آپ کی رائے میری صحت کے بارے میں کیا ہے؟

ڈاکٹر شاہ: جناب، اب آپ کی عمومی صحت پہلے سے بہتر ہے۔

قائداعظم رح شکر ہے۔ میں بھی یہی محسوس کرتا ہوں۔

(تھوڑے توقف کے بعد)

آج پاکستان ایک زندہ حقیقت ہے ایک ایسی حقیقت جس کا دوست اور دشمن سب ہی اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔ پاکستان بن چکا ہے پاکستان کا مستقبل تابناک ہے۔ میرے دل کو اطمینان ہے کہ برعظیم ہند میں مسلمان غلام نہیں بلکہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے آزاد مملکت کے مالک ہیں جس کے وسائل و ذرائع لامحدود ہیں جس کی ترقی کی شاہراہیں نمایاں ہیں اور انشاءاللہ دنیا کا عظیم ملک بن جائے گا۔

ـــــــ ڈاکٹر!

جب میں محسوس کرتا ہوں کہ میری قوم آج آزاد ہے تو میرا سر عجز و نیاز کی فراوانی سے اللہ تعالیٰ کے آگے جھک جاتا ہے۔

ذرا سوچو ـــــــ!

یہ مشیت ایزدی نہیں تو کیا ہے کہ وہ قوم جس کو برطانوی سامراج اور ہندو بنیئے نے ہندوستان سے مٹانے کی سنگین سازش کر رکھی تھی آج وہ قوم آزاد ہے اس کا اپنا ملک ہے، اپنا پرچم ہے، اپنی حکومت ہے، اپنا سکّہ اور اپنا دستور ہے۔ کیا کسی قوم پر اس سے بڑھ کر خدا کا اور کوئی انعام ہو سکتا ہے۔ خدا کے اس انعام کی حفاظت اب مسلمانوں کا فرض ہے۔ پاکستان ایک تحفہ ہے اور اس خداوندی تحفے کا تحفظ ہر مسلمان کا ایمان ہونا چاہیئے۔

اگر پاکستانی نیک نیتی سے، دیانتداری، خلوص اور ضبط و نظم سے دن رات کام کرتے رہے اور ان میں نفاق، جاہ طلبی اور ذاتی مفاد پرستی کے قابل مذمت رجحانات پیدا نہ ہوئے تو انشاءاللہ چند سالوں میں ہی وہ دنیا کی بڑی قوموں میں شمار ہونے لگیں گے۔ ان کا ملک امن و آشتی تہذیب و تمدن ثقافت و شرافت کا مرکز ہوگا اور اس کی حدود سے ترقی کی شعاعیں نکل کر ایشیائی ممالک کی راہنمائی و رہبری کریں گی اور ان کو ترقی و امن کا راستہ دکھائیں گی۔

میں اپنا کام ختم کر چکا ہوں

اپنی آخری علالت کے زمانے میں قائد اعظمؒ زیارت میں صاحب فراش تھے۔ ڈاکٹر الٰہی بخش ان کا علاج کر رہے تھے۔ ایک روز انہوں نے برسبیل تذکرہ کہا:

ڈاکٹر الٰہی بخش: جو پاکستان آپ نے اپنی طویل جدوجہد کے بعد حاصل کیا ہے۔ اسے مضبوط بنانے کے لیے ہمیں ابھی مزید دس برس تک آپ کی ضرورت ہے۔

قائد اعظمؒ: میں اپنا کام کر چکا ہوں۔ اب مجھے مرنے کا ملال نہیں ہوگا لیکن میں زیارت

میں مرنا نہیں چاہتا۔ (کچھ توقف کے بعد)

آپ کے پاس اب سب کچھ ہے ایک آزاد اور خود مختار ملک، جس میں زندگی کی تشکیل آپ اپنی مرضی کے مطابق کر سکتے ہیں قدرت نے آپ کو سب کچھ دیا ہے۔

آپ کے وسائل لامحدود ہیں۔ سوائے کوئلے اور لوہے کے۔ لیکن یہ چیزیں بھی آپ اپنی فاضل پیداوار کے تبادلہ میں دوسرے ملکوں سے حاصل کر سکتے ہیں اب یہ کام نئی نسل کا ہے کہ وہ اپنے ملک کی تعمیر کرے اور مضبوط بنائے۔

کم و بیش یہی وہ الفاظ ہیں جو قائداعظم نے اپنے ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کے یوم استقلال کے پیغام میں ارشاد فرمائے۔ گویا یہ آخری پیغام ہے۔

ایک خدا، ایک رسُول، ایک کتاب اور ایک قوم

۱۹۴۲ء میں قائداعظمؒ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے لیے الہ آباد آئے اسٹیشن پر مشتاق دید مسلمانوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ جس کی وجہ سے بدنظمی ہونا قدرتی بات تھی۔ قائداعظمؒ نے اپنے سیلون کے دروازے پر کھڑے ہو کر بدنظمی کا مظاہرہ دیکھا تو انگشت اٹھا کر صرف اتنا کہا: ڈسپلن!

اور یہ اشارہ پا کر جو جہاں تھا بیٹھ گیا ان میں شہری مسلمان ہی نہیں، آس پاس کے ان پڑھ دیہاتی بھی تھے۔ اسٹیشن پر یکایک ایسا سکوت چھا گیا جیسے کوئی آبشار رک گیا ہو۔

قائداعظمؒ دوبارہ اپنے سیلون کے دروازے پر آئے۔

قائداعظمؒ: ایک خدا ایک رسول، ایک کتاب اور ایک قوم۔

متحد ہو جاؤ۔ متحد!

پاکستان قائم ودائم رہے گا

مرزا ابوالحسن اصفہانی جولائی ۱۹۴۸ء میں قائداعظمؒ سے ملنے زیارت گئے۔

اصفہانی : جناب میں دیکھتا ہوں کہ اس بیماری کی حالت میں بھی آپ کے اردگرد فائلوں کا انبار ہے میں یہ عرض کروں گا کہ کام بھی ضروری ہے لیکن آپ کی جان اس کام سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

قائداعظمؒ : میرے بچے، ایک وقت تھا جب واقعی مجھے تشویش رہتی تھی کہ کیا پاکستان ان مسائل ومصائب سے جانبر ہوسکے گا جو تقسیم کے بعد ہندوستان نے ہمارے لیے پیدا کر دیئے تھے۔ وہ غیر یقینی دور کم وبیش سال بھر اوائل جولائی ۱۹۴۸ء تک جاری رہا۔ خدا کا شکر ہے کہ ان بحرانوں سے ہم کامیابی سے گزر آئے ہیں۔ اب مجھے کوئی اندیشہ نہیں۔ انسان آتے جاتے رہیں گے لیکن پاکستان اللہ کا شکر ہے اب مضبوطی سے قائم ہو چکا ہے اور انشاءاللہ ہمیشہ قائم ودائم رہے گا۔

باب چہارم

اقبالیات

اقبالؒ

جناب صدر اور معزز حاضرین مجلس!

شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو اپنے دُکھ سُکھ یا خوشی و غم کو خوبصورت الفاظ اور خوبصورت انداز سے دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ اس طرح کہ آپ بیتی جگ بیتی معلوم ہونے لگتی ہے۔ دوسری طرح کے شاعر اپنے دکھ درد کی باتیں نہیں کرتے بلکہ زندگی کے بڑے بڑے بنیادی مسئلوں کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں پہلی طرح کے شاعر زندگی کو سنوارتے ہیں۔ دوسری طرح کے زندگی کو بناتے ہیں، رومی، سعدی، عبداللطیف بھٹائی، بابا فریدؒ، بلھے شاہؒ اور اقبالؒ کا شمار دوسری قسم کے شاعروں میں ہوتا ہے۔

اقبال کو دو امتیاز حاصل تھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت بڑے مفکر اور سیاسی مدبر بھی تھے۔ ان کی شاعری نے پورے مشرق کو جگا دیا اور ایک نئے شعور کے نور سے جگمگا دیا اور ان کی غیر معمولی سیاسی سجھ بوجھ نے برصغیر کے مسلمانوں کو نہ صرف ایک وطن کا تصور دیا بلکہ اس وطن پاکستان کے لیے ایک واضح نصب العین کی نشاندہی بھی کی۔

جناب والا!

اقبالؒ کی شاعری پر بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے۔ میں بھی اس تقریر کے آخر میں کچھ عرض کروں گا لیکن اس سے پہلے، میں اقبال کے بچپن اور لڑکپن کے چند واقعات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بتانے کے لیے کہ بڑے آدمی، آسمان سے نہیں اترتے، اچھے گھروں میں اچھے استادوں کے زیرِ سایہ پروان چڑھتے ہیں۔

اقبال نے اپنی فارسی کی نظم اسرارِ خودی میں اپنے بچپن کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ جب وہ چھوٹے سے تھے تو دروازے پر ایک فقیر آیا۔ جو بڑا ڈھیٹ تھا۔ اقبال نے غصے میں آکر اس کو دھتکارا اور پھر دھکا دے دیا وہ گر پڑا اور اس کی جھولی کی بھیک کی چیزیں زمین پر گر

پڑیں۔ اقبال کے والد شیخ نور محمد نے یہ نظارہ دیکھا تو تڑپ اٹھے اور اقبال سے سخت ناراضگی کے لہجے میں کہا، یہ تم نے کیا کیا، کیا یہ انسان نہیں، قیامت کے دن میں خدا کو کیا جواب دوں گا کہ میں ایک بچے کی تربیت بھی نہ کر سکا۔ علامہ اقبال رح لکھتے ہیں کہ اس واقعہ نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔

اقبال نے اپنے والد سے ایک اور مکالمے کا ذکر بھی کیا ہے۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد کا شمار سالکوٹ کے پہنچے ہوئے بزرگوں میں ہوتا تھا وہ ان پڑھ فلسفی کے لقب سے مشہور تھے۔ اور قرآن حکیم پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان ہی کی تربیت سے اقبال روز صبح سویرے نماز کے بعد قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ ایک روز انھوں نے اقبال سے کہا کہ بیٹے قرآن اس طرح پڑھا کرو کہ یہ جیسے تم پر اتر رہا ہے۔ جب اقبال نے اس قول پر تعجب کا اظہار کیا تو انہوں نے وضاحت کی کہ قاری پہ قرآن اترنے کا مطلب کیا ہے اسی بات کو بعد میں اقبال نے یوں بیان کیا ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

اقبال کے وہ استاد جنہوں نے اقبال کو اقبال بنایا مولوی سید میر حسن تھے۔ اقبال بچپن میں ان کا بے حد ادب کرتے تھے اور ان کی خدمت کو اپنے لیے سعادت سمجھتے تھے چنانچہ اقبال اکثر مولوی صاحب کے گھر کا سودا سلف لادیا کرتے تھے۔ ایک بار مولوی صاحب نے دیکھا تو منع کیا۔ اقبال پھر بھی یہ خدمت بجا لاتے رہے۔ ایک روز جو مولوی صاحب کی نظر پڑی تو کہنے لگے "اقبال! میں نے کتنی دفعہ کہا ہے کہ میرے گھر کا سودا سلف نہ لایا کرو۔ تم میرے شاگرد ہو نوکر نہیں ہو۔ اقبال نے ادب سے برجستہ کہا۔

"جناب میں آپ کا شاگرد نوکر ہوں"۔

اسی طرح کا ایک اور قصہ ہے کہ اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ چھٹی میں

چھوڑا

گھر آئے ہوئے تھے اور رحیما عطار کی دکان پر کھڑے حقہ پی رہے تھے کہ مولوی میر حسن صاحب پر نظر پڑی۔ حقے کو وہیں چھوڑا اور بھاگ کر آداب بجا لائے اور پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ دکان سے بھاگتے ہوئے ایک جوتی وہیں رہ گئی تھی۔ اسی طرح چلتے چلتے مولوی صاحب کو ان کے گھر تک چھوڑ کر آئے۔

اقبالؒ اپنے ایک اور انگریز استاد پروفیسر آرنلڈ کا بھی بہت احترام کرتے تھے۔ ان کی یاد میں اقبال نے ایک نظم بھی لکھی اور لندن میں انہی کے کہنے پر انہوں نے شاعری ترک نہیں کی۔

ان چند واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال ایک بہت بڑے شاعر اور مفکر ہی نہیں ایک بہت بڑے انسان بھی تھے۔

جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ اقبال کا تعلق شاعروں کے اس گروہ سے ہے جو زندگی کو بناتے ہیں، جو زندگی کو روشنی اور حرارت دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کا بہت سا کلام خاصا مشکل ہے۔ اسے بڑی عمر کے پڑھے لکھے لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں لیکن ہماری خوش قسمتی سے اقبال نے چند نظمیں کم عمر طلبہ کے لیے بھی لکھی ہیں جو ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک نظم ہے "ایک مکڑا اور مکھی" اس میں کہانی کے پیرائے میں انگریزوں اور ظالموں کی چالبازیوں کی قلعی کھولی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح ظالم آدمی، دھوکے اور فریب سے کام لیتا ہے۔

"ایک پہاڑ اور گلہری" نظم کا سبق ہے۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

ایک اور نظم ہے ہمدردی۔ اس کا پیام ہے۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

ایک پرندے کی فریاد ہے۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

محض پرندے کی فریاد ہی نہیں۔ اگر اس کو انگریزوں کی غلامی کے پس منظر میں پڑھا جائے تو اس کے اور بھی معنی نکلتے ہیں۔

اور وہ لافانی نظم بچے کی دعا۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

یہ بچوں کے ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اس سے بہتر دعا کسی نے نہ لکھی ہو گی۔

دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

سبحان اللہ! کیسی پاکیزہ آرزو ہے۔ پھر وطن کی محبت سے بھرپور یہ شعر

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

وطن کی محبت اسی وقت معنی خیز ہو سکتی ہے جب محبت کرنے والا روشن دماغ اور روشن ضمیر بھی ہو۔ اس لیے کہا ہے۔

زندگی ہو میری پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب

چونکہ محبت بغیر خدمت کے بے معنی ہوتی ہے اس لیے دعا میں ہے۔

ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

اس دعا کا آخری شعر۔

میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہے اس راہ پہ چلانا مجھ کو

قرآن حکیم کی سورۂ فاتحہ کی آخری آیت کو یاد دلاتا ہے۔

اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم

مختصر یہ کہ اقبال کی شاعری صراط مستقیم کی شاعری ہے اور یہی ان کی عظمت کا راز ہے۔

اقبالؒ اور عشقِ رسولؐ

صدر گرامی، مہمان خصوصی اور حاضرین!

اقبال کی مشہور نظم "جواب شکوہ" کا آخری شعر ہے ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

یوں تو یہ شعر اللہ تعالیٰ کی طرف مسلمانوں کے شکوے کے جواب میں ہے لیکن یہ اصل میں اقبالؒ کے اپنے دل کی آواز ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے وفا کرنا تصورات اقبالؒ کی بنیادی کڑی ہے۔

بال جبریل کا شعر ہے ؎

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس عین اسلام ہے۔ بال جبریل ہی میں اقبالؒ نے رسول کریمؐ کی شان میں کہا ہے ؎

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

ایک اور جگہ اقبال کہتے ہیں کہ اگر عشق رسولؐ نہ ہو تو مسلمان کی نماز بھی بے اثر رہتی ہے۔

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

اقبالؒ نے عشق رسولؐ پہ اپنی نظم ہی میں نہیں اپنی نثر میں بھی بہت زور دیا ہے کتاب سیرت اقبال میں اقبال کا یہ قول درج ہے۔

عشق رسولؐ سپر دین بھی ہے اور وسیلۂ دنیا بھی۔ اس کے بغیر انسان نہ دین کا رہتا ہے نہ دنیا کا۔

ایک اور کتاب "اقبال کامل" میں اقبال کے یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں۔

ہمارا کوئی عمل و عبادت حدیث کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔

اقبال نے عشق رسولؐ کو جو اسلام کی روح قرار دیا یہ آواز ان کے دل کی بھی تھی اور یہی فیصلہ ان کے فلسفی دماغ کا بھی تھا۔ اپنے انگریزی خطبات میں فرماتے ہیں۔

"پیغمبر اسلام کی ذات گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے۔ بہ اعتبار اپنے سرچشمہ وحی کے آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے۔ لیکن بہ اعتبار اس کی روح کے دنیائے جدید سے یہ آپ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم و حکمت کے وہ تازہ چشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رُخ کے مطابق تھے۔"

اقبال نے اپنے خطبات میں ایک اور جگہ رسول اللہؐ اور دین اسلام کے تعلق کو بہت ہی خوبصورت اور واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

اسلام بحیثیت دین خدا کی طرف سے ظاہر ہوا لیکن بحیثیت سوسائٹی یا ملّت کے رسول کریمؐ کی شخصیت کا مرہونِ منت ہے اسی لیے وہ کہتے ہیں ؎

بہ مصطفٰی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست   اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

یعنی تم مصطفےٰ تک رسائی حاصل کرو کہ وہی تمام تر دین ہیں۔ اگر تم ان تک نہیں پہنچے تو پھر سب کچھ بولہبی ہے، گمراہی ہے۔

اقبال نے عشقِ رسولؐ کی توجیہہ عام فہم انداز میں بھی کی ہے۔ اپنے عید میلاد النبی کے خطبہ میں انھوں نے کہا۔

" میرے نزدیک انسانوں کی دماغی اور قلبی تربیت کے لیے نہایت ضروری ہے کہ ان کے عقیدے کی رو سے زندگی کا جو نمونہ بہترین ہو وہ ہر وقت ان کے سامنے رہے چنانچہ مسلمانوں کے لیے اسی وجہ سے ضروری ہے کہ وہ اسوۂ رسولؐ کو مدنظر رکھیں۔ تاکہ جذبۂ تقلید اور جذبۂ عمل قائم رہے۔"

نذیر نیازی کی روایت ہے کہ ایک محفل میں اقبال نے فرمایا۔

" اللہ تعالیٰ کا ارادہ عالم انسانیت کو جس معراج کمال تک پہنچانے کا تھا اس کا آخری اور کامل و مکمل نمونہ نبی اکرمؐ کی ذات (ستودہ صفات) میں ہمارے سامنے پیش کر دیا۔"

اسی لیے اقبالؒ کہتے ہیں۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

عشقِ رسولؐ اقبال کے لیے قال کی نہیں حال کی بات تھی۔ جو لوگ اقبالؒ کی زندگی سے واقف ہیں وہ بتاتے ہیں کہ رسول اللہؐ کی ذات گرامی سے اقبالؒ کے عشق کا یہ عالم تھا کہ جب ان کا نام آتا تھا تو یہ ایک عاشق صادق کی طرح اشکبار ہو جاتے تھے۔ اس ضمن میں یہاں ان دو واقعات کا ذکر بے محل نہ ہو گا۔

"اوراق گم گشتہ" نامی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک بار پنجاب کے ایک دولتمند رئیس نے ایک قانونی مشورے کے لیے علامہ اقبالؒ سمیت پنجاب کے چند چوٹی کے وکیلوں کو

اپنے ہاں بلایا اور اپنی شاندار کوٹھی پر ان کے قیام کا بندوبست کیا۔ رات کو علامہ جب اپنے کمرے میں آ گئے تو عشرت کدہ پایا۔ آسائش و آرام کی قیمتی سے قیمتی چیز موجود تھی۔ ان کے لیے جو بستر لگایا گیا تھا وہ خاص طور پر نرم و نفیس تھا۔ اس پر لیٹتے ہی علامہ یکایک اٹھ بیٹھے اور ساتھ والے غسل خانہ میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ کر رونے لگے۔ پھر اپنے خادم علی بخش کو آواز دی۔ وہ باہر برآمدے میں تھا۔ جب وہ اندر آیا تو انہیں کمرے میں نہ پا کر حیران ہوا علامہ نے پھر آواز دی ادھر غسل خانے میں آؤ اسے فکر ہوئی کہ کیا بات ہے جب وہ اندر گیا تو دیکھا کہ یوں علامہ ٹھیک ٹھاک ہیں لیکن اشکبار ہیں۔ پوچھا کہ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ آپ کا کمرہ تو بادشاہوں جیسا ہے نواب صاحب نے اپنی خوابگاہ میں آپ کو ٹھہرایا ہے علامہ نے فرمایا ہاں مجھے معلوم ہے یہ شاہانہ خوابگاہ ہے۔ لیکن بستر پر لیٹتے ہی مجھے خیال آیا کہ جس رسول پاکؐ کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ آسائشیں نصیب ہوئی ہیں اس نے کھجور کے بوریئے پر سو کر ساری زندگی گزار دی۔ بس یہ خیال آتے ہی دل بھر آیا اب اس ریشم اور مخمل کے بستر پر لیٹنا میرے لیے ممکن نہیں۔ جاؤ باہر سے کوئی معمولی سی چارپائی اٹھا لاؤ۔ اور اس پر میرا اپنا پرانا بستر بچھا دو یہ سن کر علی بخش نے عرض کیا۔ ڈاکٹر صاحب! ایک آدھ دن تو اس شان و شوکت کے مزے بھی اٹھایئے علامہ نے کہا علی بخش مجھے اپنے بوریئے میں زیادہ آرام ملے گا۔

یہ واقعہ علامہ کی زندگی کے آخری دور کا ہے لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عقیدت کے جذبے سے وہ اس وقت بھی سرشار تھے۔ جب وہ نوجوان تھے۔ فلسفے اور بیرسٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ انگلستان جا رہے تھے۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کو جب علامہ کا جہاز ملوجا عدن کی بندرگاہ کے قریب پہنچا تو ساحل عرب کے تصور نے علامہ کو بے چین کر دیا اور سرزمین عرب کو مخاطب کر کے کہا:

"اے عرب کی مقدس سرزمین، تجھ کو مبارک ہو۔ تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا

کے معماروں نے رد کر دیا تھا۔ مگر ایک یتیم بچے کے خدا نے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کے تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی ہے تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں رہروانِ حق کو تمازت آفتاب سے محفوظ رکھا ہے کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیری ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے چھالوں کی پرواہ نہ کرتا ہوا اس متبرک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں بلال رضی اللہ عنہ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔"

یہ الفاظ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خط سے لیے گئے ہیں۔ (جو مقالات اقبال میں شامل ہے) ان الفاظ کو کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ نثر میں نعت رسول ﷺ کی اس سے بہتر اور مؤثر شاید کوئی اور مثال موجود نہیں۔

اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا خطاب نوجوانوں سے

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورت فولاد

محترم مہمانِ خصوصی، اور خواتین و حضرات!

میری تقریر کا عنوان ہے "اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا خطاب نوجوانوں سے":

قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی امیدیں بھی ملت کے نوجوانوں سے وابستہ تھیں وہ جوانوں کو اپنی آہِ سحر دینا چاہتے تھے۔ ان کی آرزو تھی کہ ان کا نورِ بصیرت عام ہو جائے۔

جوانوں کو میری آہ سحر دے

پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے

مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اقبالؒ کے نزدیک زندگی ذوقِ پرواز ہے۔

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی

فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

اس لیے اقبالؒ نوجوانوں کو سوزِ آرزو اور جستجو کی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔

ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے

چمن کے ذرّے ذرّے کو شہید جستجو کر دے

لیکن جب انہیں نوجوانوں کی زندگی میں جمود نظر آتا ہے، جب وہ انہیں شہید جستجو نہیں پاتے تو بے اختیار ان کے قلب کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلتی ہے۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے

کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

خواتین و حضرات!

بلند پروازیوں کے لیے بلندیوں پر نظر بھی ضروری ہوتی ہے اس لیے اقبال پوچھتے ہیں۔

شاہین ملت کبھی تو نے یہ بھی سوچا ہے کہ تیرے اسلاف کون تھے۔ تجھے پتہ ہے کہ تو کس گردوں کا ٹوٹا ہوا ستارہ ہے۔

میرے شاہین! تو اس قوم کا فرزند ہے جس نے قیصر و کسریٰ کے اقتدار کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا جس کے نام سے یونان و فارس کے تاجدار پناہ مانگتے تھے جس نے تخت روما کو پاؤں کی ٹھوکروں سے پامال کیا۔ جنھوں نے پردہ باطل کو چاک کیا، نذرانۂ جان دے کر

جہان نو پیدا کیا۔ اپنے خون سے تاریخ کو رنگین کیا۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاج سر دارا

اقبال نوجوانوں کو یاد دلاتے ہیں کہ یہ تمہارے ہی اسلاف تھے جن کی ٹھوکر سے صحرا و دریا دونیم ہو جاتے تھے اور پہاڑ سمٹ کر رائی بن جاتے تھے۔

اقبال نے نوجوانوں کو اسرار خودی اور رموز بے خودی سے آگاہ کیا۔

تو راز کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

اور بتایا کہ تقدیر امم کیا ہے۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

اور اس راز سے پردہ اٹھایا کہ جہاد زندگانی میں مردوں کی شمشیریں کیا ہیں۔

یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

سامعین گرامی!

اقبال کا پیغام امید و رجا کا پیغام ہے، عزم و حوصلے کا پیغام ہے۔ وہ نوجوانوں سے کہتے ہیں کہ اگر ایک نشیمن کھو جائے تو غم نہ کرو۔ آہ و فغاں کے لیے مقامات کی کمی نہیں۔

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم

مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

علامہ ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا

پُردم ہے اگر تو، تو نہیں خطرۂ افتاد

خواتین و حضرات!

قائد اعظمؒ نے ایک بار پاکستان کو اسلام کی لیباٹری کہا تھا۔ وہ عظیم تجربہ گاہ جہاں اسلام کے نظام حیات کی عملی تعبیر پیش کی جائے گی۔ آج جب ہم پاکستان میں اسلام کو قائم کرنے کے مقدس فریضے سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اس جدوجہد میں قوم کے نوجوانوں کو اپنا خصوصی کردار ادا کرنے پر خصوصی توجہ دینا ہے اور اپنے اندر صداقت، عدالت اور شجاعت کی بنیادی صفات پیدا کرنا ہیں اور میر کارواں کی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے میر کارواں کا رخت سفر بھی ساتھ لینا ہے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا

لیا جائے گا تجھ سے کام، دنیا کی امامت کا

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کیلئے

میں اپنی تقریر کو اقبال کی اس دعا پر ختم کرتا ہوں۔

کہ اے رب ذوالجلال! میری قوم کے جوانوں میں پھر خالد بن ولید پیدا کر۔

اے میرے اللہ! ان کو طارق جیسے سپوت دے۔

اے مالک کائنات! انہیں محمد بن قاسم جیسے جانباز عطا کر، انکے دلوں میں حسین ابن علیؓ کا جذبہ قربانی پیدا کر۔ تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے دل مرتضیٰؓ سوز صدیقؓ دے

کردارِ اقبالؒ

بے جی، آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا!

جب علامہ اقبال کی والدہ امام بی بی کا انتقال ہوا اور علامہ کے دوست احباب تعزیت کے لیے گئے تو علامہ بار بار کہتے:

"بے جی، آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا۔ آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا۔"

حاضرین حیران تھے کہ علامہ کس خاص احسان کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ آخر کسی نے پوچھا:

یکے از حاضرین: حضرت، ہر ماں سراپا احسان ہوتی ہے۔ آپ کا اشارہ کسی خاص احسان کی طرف ہے؟

علامہ ہاں، ایک خاص احسان کی طرف۔

حاضرین اگر بارِ خاطر نہ ہو تو ارشاد فرمائیں۔

علامہ میں نے سنا ہے کہ جب میں چھوٹا سا تھا تو والد ڈپٹی وزیر علی بلگرامی کے یہاں کپڑے سینے پر ملازم تھے۔ چونکہ ڈپٹی صاحب انگریز سرکار کے ملازم رہ چکے تھے اور ان کی پنشن کھاتے تھے اس وجہ سے بے جی کو شبہ ہو گیا تھا کہ ان کی آمدنی کا ایک حصہ شرعاً مشکوک ہے اس لیے انہوں نے مجھے اپنا دودھ پلانا بند کر دیا۔ پھر اپنی محنت سے خریدی ہوئی بکری کا دودھ مجھے پلانے لگیں۔ بعد میں والد صاحب نے صورتحال کی وضاحت کی اور ڈپٹی صاحب کی ملازمت بھی چھوڑ دی۔ لیکن اس واقعہ سے مجھ پر رزق حلال کی اہمیت واضح ہو گئی کہ رزق حلال ایمان کی جان ہے۔

اللہ اکبر، یہ تھی وہ ماں جس نے خالق پاکستان کی پرورش کی۔
کیا تعمیر پاکستان کے لیے رزق حلال کی ضرورت نہ ہو گی۔

بوریئے میں زیادہ آرام

پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورے کے لیے علامہ اقبال ؒ سمیت پنجاب کے چوٹی کے وکیلوں کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شاندار کوٹھی پر ان کے قیام کا انتظام کیا۔ رات کو علامہ جب اپنے کمرے میں گئے تو اسے عشرت کدہ پایا آسائش و آرام کی قیمتی سے قیمتی چیز موجود تھی۔ ان کے لیے جو بستر لگایا گیا تھا وہ تو خاص طور پر نرم و نفیس تھا۔ اس پر لیٹتے ہی یکایک اٹھ بیٹھے۔

علامہ : علی بخش ــــــ علی بخش ــــــ !!

علی بخش : ادھر غسل خانہ کی طرف آ ور۔

علامہ : غسل خانہ میں آپ کیا کر رہے ہیں؟ آپ کا کمرہ اور بستر تو بادشاہوں جیسا ہے۔

علی بخش : علی بخش۔ ہاں مجھے بھی معلوم ہے لیکن بستر پر لیٹتے ہی مجھے خیال آیا کہ جس رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں، انہوں نے تو بوریئے پر سو سو کر زندگی گزار دی تھی اس خیال سے دل بھر آیا۔ اب اس نرم و نفیس بستر پر لیٹنا میرے لیے ممکن نہیں۔ جاؤ باہر سے کوئی معمولی سی چارپائی اٹھا لاؤ اور اس پر میرا معمولی بستر بچھا دو۔

علی بخش جو حکم۔ لیکن آپ ذرا اس کے مزے بھی اٹھائیے۔

علامہ مجھے اپنے بوریئے میں زیادہ آرام ملے گا۔

کل میں رسولِ کریمؐ کو کیا منہ دکھاؤں گا؟

اپنی فارسی مثنوی رموزِ بیخودی میں علامہ نے اپنے بچپن کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ ایک

فقیر دروازے پر بار بار صدا لگا رہا تھا۔ اور کسی صورت میں ٹلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ ان کو جو غصہ آیا تو اس کے سر پر ایک پیڑ ڈنڈا دے مارا۔ فقیر لڑکھڑایا اور اس کی جھولی میں جو کچھ تھا وہ نیچے گر پڑا۔

علامہ کے والد شیخ نور محمد نے جب یہ دیکھا تو تڑپ اٹھے سخت آزردہ ہوئے۔

شیخ نور محمد : یہ تم نے کیا کیا؟

اقبال : یہ یہاں سے ٹلتا کیوں نہیں تھا؟

شیخ نور محمد بیٹا! کل آنحضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت میدان حشر میں ہوگی اس میں ملت بیضا کے غازی، عالم، شہید، زاہد، عاشق، گنہگار سب ہی شامل ہوں گے تو اس مظلوم فقیر کے نالے بلند ہوں گے۔

بیٹا! جب تیرے لیے مرکب کے بغیر راستہ چلنا مشکل ہو گا اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کہیں گے اللہ نے ایک مسلمان نوجوان تیرے سپرد کیا تھا تاکہ تو اسے صحیح تعلیم و تربیت دے لیکن اس نوجوان نے میرے دین سے کوئی استفادہ نہ کیا اور تو ایک کام بھی نہ کر سکا یعنی تو مٹی سے بنے ہوئے پتلے کو آدمیت کا سبق نہ دے سکا۔ تو میں اس کا کیا جواب دوں گا۔

بیٹا! ذرا خیال کر امت خیر البشر کے اجتماع کے سامنے میری کیا حالت ہوگی خدا کے لیے میری سفید ریش کالی نہ کر۔ میری امید و بیم کی کیفیت کا خیال کر۔ اپنے باپ پر اتنے ستم نہ ڈھا اور آقائے کل کے سامنے اس بندۂ عاجز کو رسوا نہ کر۔

وہ اُجرت حرام ہے جو کام کو بڑھا کر لی جائے

علامہ اقبال کی کاروباری دیانت کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے مسٹر داس پٹنہ کے مشہور بیرسٹر تھے ان کے پاس ریاست آرہ کا ایک مقدمہ آیا۔ اس سلسلہ میں فارسی کی قدیم

دستاویزات کا انگریزی میں ترجمہ کر کے ان پر تبصرہ کرنا تھا۔ بیرسٹر داس نے ڈاکٹر اقبالؒ کی خدمات حاصل کیں۔ علامہ پٹنہ گئے اور مقدمہ کے کاغذات تحویل میں لے لیے دوسرے دن بیرسٹر داس اور علامہ میں یہ گفتگو ہوئی۔

داس ڈاکٹر صاحب! دستاویزات آپ نے دیکھیں؟

علامہ جی ہاں۔ یہ لیجیے، میں نے خلاصہ تیار کر لیا ہے دعوے کے دلائل ترتیب دے دیئے ہیں۔

داس ارے اتنی جلدی!

علامہ مثل تو بہت ضخیم ہے اصل متعلقہ کاغذات زیادہ نہیں تھے۔

داس پھر بھی کچھ وقت لینا تھا۔ آپ کو ایک ہزار روپے روز کی فیس پر یہاں بلایا گیا ہے دو چار ہزار تو بنتے۔

علامہ مسٹر داس، میرے مالی فائدے میں جو آپ کی دلچسپی ہے اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ میرے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس روزی کو حرام قرار دیا ہے جو کام کو بڑھا کر لی جائے۔

اس معاہدے سے ارتکاز میں کمی آئے گی

علامہ اقبالؒ پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے لیکن اس سلسلے میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ذرا سا شبہ بھی ہو جاتا کہ مقدمہ جھوٹا ہے تو اس کو ہاتھ نہ لگاتے خواہ مؤکل کتنی زیادہ فیس دینے پر آمادہ ہوتا۔ صحیح مقدمے بھی صرف گزارے بھر کے لیتے تھے۔ جوں ہی چھ سات سو روپے ہاتھ آ جاتے مزید فیس لینا بند کر دیتے۔ ۱۹۳۵ء سے جب گلے کی تکلیف بڑھی تو آمدن کا یہ رہا سہا سہارا بھی نہ رہا۔ کچھ کتابوں کی رائلٹی ملتی تھی اور تھوڑا بہت پیسہ بنک میں جمع تھا۔ بس اسی طرح تنگی ترشی سے کام چل رہا تھا۔ دوستوں اور نیازمندوں کو صورتحال کا علم ہوا تو انہوں نے اس سلسلے میں سلسلہ جنبانی شروع کی۔

حیدرآباد کے وزیر سر اکبر حیدری نے علامہؒ کے ایک خاص دوست اور نیاز مند میاں امیر الدین کو لکھا کہ علامہؒ کی خدمت میں حاضر ہوں اور ان کی خدمت میں ان کی یہ پیش کش پیش کریں۔

میاں امیر الدین : ڈاکٹر صاحب! اب گلے کی تکلیف کا کیا حال ہے؟

علامہ : علاج جاری ہے اللہ کرم کرے گا۔

میاں امیر الدین : سر اکبر حیدری نے مجھے لکھا ہے کہ میں ان کی ایک تجویز آپ کے سامنے رکھوں۔

علامہ : وہ کیا کہتے ہیں؟

میاں امیر الدین : تجویز یہ ہے کہ اگر آپ سال میں صرف ایک ہفتہ عثمانیہ یونیورسٹی جا کر لیکچر دے دیا کریں تو یونیورسٹی اس کا معاوضہ دس ہزار روپیہ سالانہ ادا کرے گی۔

علامہ : آپ کو معلوم ہے کہ منجملہ اور چیزوں کے میرا تو گلا ہی بیٹھا ہوا ہے بولنے میں تکلیف ہوتی ہے لیکچر کس طرح دوں گا۔ تکلیف

میاں امیر الدین : اس کا علم انہیں ہے اسی لیے انھوں نے کہا ہے کہ آپ صرف لیکچر لکھ دیا کریں وہ کسی اور سے پڑھوا لیا کریں۔ پڑھوا لیا کریں گے

علامہ : (کچھ سوچ کر) پھر بھی اس تجویز کو قبول کرنا میرے لیے مشکل ہے۔

میاں امیر الدین : کیوں؟ میرے خیال میں تو یہ بہت معقول تجویز ہے۔

علامہ : مجھے اس کی معقولیت میں کلام نہیں۔ وجہ تردد کچھ اور ہے۔

میاں امیر الدین : کیا؟

علامہ : میں اسلامی فقہ پر ایک کتاب لکھنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اگر میں یہ کنٹریکٹ منظور کر لوں تو میں ذہنی طور پر مصروف ہو جاؤں گا اور کتاب مکمل نہ کر سکوں گا اس لیے یہ کنٹریکٹ مجھے منظور نہیں۔

میاں امیر الدین کی عمر اب کم و بیش نوے برس کی ہے۔ علامہ سے ان کی پہلی ملاقات

۱۹۰۱ء میں ہوئی تھی جب میاں صاحب چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے۔ اس وقت سے ۱۹۳۸ء میں علامہ کی وفات تک میاں صاحب علامہ کے قریب رہے ہیں۔ یہ واقعہ میاں صاحب کے حوالے سے خوشنود علی خان نے ۱۰ ر نومبر ۱۹۸۰ء کے اخبار جہاں میں نقل کیا ہے۔

پچاس سال تک فاتحہ

انسان جو کچھ سیکھتا ہے ماں باپ سے سیکھتا ہے یا استادوں سے علامہ اقبالؒ اس لحاظ سے بہت خوش قسمت تھے کہ ان کے والدین بھی سچے اور پکے مسلمان تھے۔ تقوے کی تصویر اور ان کے اساتذہ بھی ایک سے بڑھ کر ایک تھے خصوصاً ان کے استاد مولوی میر حسن جو حد درجہ متقی اور با اصول انسان تھے اور عزم و ثبات کا پیکر۔ مولوی میر حسن کی ایک بہن تھیں ۱۸ ار میں وہ بیمار ہوئیں کہ علاج معالجہ کچھ کارگر نہ ہوا۔ اور ان کی حالت بد سے بدتر ہو گئی تھی،

مولوی میر حسن ان کی پٹی سے لگے دن رات تیمار داری میں لگے رہتے لیکن افاقہ ہونا تھا نہ ہوا۔ ایک روز عصر کی نماز کے بعد مولوی صاحب نے پوچھا۔

مولوی میر حسن کیا حال ہے بہن؟

بہن کیا بتاؤں۔

مولوی میر حسن جو حال ہو بتاؤ۔ کیا بہت اداس ہو، کچھ چپ چپ ہو۔

بہن میں گھر میں ہوں تو آپ سب، مجھے پوچھتے ہیں۔

مولوی میر حسن کیوں مایوسی کی باتیں کرتی ہو۔

بہن کل مر جاؤں گی اور قبر میں اکیلی ہوں گی تو کوئی دعا کے لیے بھی وہاں نہ آئے گا۔

مولوی میر حسن بہن تم اپنا دل میلا نہ کرو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ زندگی میں جب تک مجھ میں چلنے پھرنے کی سکت رہے گی روزانہ تمہاری قبر پر فاتحہ پڑھنے آؤں گا۔

مولوی میر حسن کے بیٹے سید ذکی شاہ لکھتے ہیں کہ مولوی صاحب نے اس عہد کو عمر بھر

اس طرح نبھایا کہ کوئی کیا نبھائے گا۔ ۲۸-۱۹۲۷ء تک جب تک ان کی بینائی زائل نہ ہو گئی وہ پچاس سال سے زیادہ عرصے تک ہر روز اپنی مرحومہ بہن کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتے رہے، سردی ہو یا گرمی، مینہ برسے یا آندھی آتے، وہ اگر سیالکوٹ میں ہوتے صبح کی نماز پڑھتے ہی قبرستان کی طرف روانہ ہو جاتے اور تلاوت کرتے جاتے۔ ہمشیرہ اور والدین کی قبروں پر فاتحہ پڑھتے اور پھر اسی طرح تلاوت کرتے واپس آ جاتے۔ چونکہ یہ ان کا روز کا معمول تھا اس لیے جن لوگوں کو ان سے ملنا جلنا ہوتا وہ اکثر انہیں اوقات میں قبرستان جاتے یا آتے جاتے راستے میں مل لیتے۔

جو کچھ مولوی میر حسن پچاس سال تواتر سے کرتے رہے وہ محض ایک بہن سے وعدے کا پاس ہی نہیں تھا بلکہ ایک طرز زندگی تھا۔ جس شخص نے پچاس برس تک یہ عہد نبھایا وہ اپنی زندگی کے دوسرے معاملات میں کتنا با اصول، کتنا پرہیز گار اور کتنا متقی ہو گا۔ اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مولوی میر حسن کے بعض شاگرد ان کا کتنا ادب کرتے تھے اس کا حال ذکی شاہ کی زبانی سنیے۔ ہمارے کپڑے ایک غیر مسلم دھوبن دھوتی تھی اس کا لڑکا بھی ساتھ آیا کرتا تھا مولوی صاحب نے اسے اپنے شوق سے پڑھانا شروع کیا۔ جب بڑا ہوا تو وہ اپنی خوشی سے مسلمان ہو گیا۔ اس کا اسلامی نام رکن الدین رکھا گیا۔ مولوی صاحب نے اسے اپنے خرچ سے پوری تعلیم دلوائی۔ اس کے ساتھ مولوی صاحب کا ایک شاگرد نہال سنگھ تھا۔ رکن الدین اور نہال سنگھ دونوں میٹرک، ایف اے، بی اے، ایم اے اور مقابلے کے امتحانوں میں برابر اوّل دوم نکلتے رہے۔ رکن الدین سیشن جج کے عہدے پر پہنچ کر ریٹائر ہوئے نہال سنگھ پہلے ڈپٹی کمشنر بنے پھر پٹیالہ میں انہیں وزارت کا عہدہ ملا۔

ان دونوں شاگردوں کا یہ حال تھا کہ رکن الدین مولوی صاحب سے ملنے آتے تو واپس ہوتے وقت پچھلے پاؤں چلتے۔ کبھی مولوی صاحب کی طرف پیٹھ کر کے نہیں چلے۔ نہال سنگھ

ہوتے

کی یہ کیفیت تھی کہ گاڑی پر سوار جا رہے ہوتے، جہاں مولوی صاحب پر نظر پڑتی گاڑی روک کر اتر جاتے اور ادب سے ان کے قدم بقدم چلتے۔ ان کی موجودگی میں کبھی گاڑی پر سوار نہ ہوتے۔

اب سنیئے علامہ اقبالؒ مولوی میر حسن کا کتنا احترام کرتے تھے۔ علامہ کے بھانجے پروفیسر منظور احمد لکھتے ہیں۔

میں نے خود ایک مرتبہ دیکھا کہ علامہ (سیالکوٹ میں) رحیمہ عطار کی دکان کے سامنے کھڑے تھے۔ تختے پر حقہ رکھا تھا اور علامہ حقہ پی رہے تھے۔ ان کا ایک پاؤں زمین پر تھا اور دوسرا تختہ پر۔ طلائی کام کا جوتا پہن رکھا تھا جو پاؤں تختے پر تھا اس کا جوتا ذرا ڈھیلا تھا اب اتفاق ایسا ہوا کہ علامہ کو مولوی میر حسن آتے دکھائی دیئے علامہ نے تختے والا جوتا وہیں چھوڑا۔ ایک پاؤں میں جوتا اور دوسرا بغیر جوتے کے، اسی حالت میں مولوی میر حسن کی طرف بڑھے اور ان کے ساتھ ہو گئے، گردن جھکی ہوئی تھی۔ اسی طرح مولوی صاحب کو گھر پہنچا کر واپس آئے پھر دوسرا جوتا پہنا۔

لیکن عزت بھی انہی کی ہوتی ہے جو عزت کے قابل ہوتے ہیں۔

برہنہ پا استاد کے پیچھے پیچھے

علامہ اقبالؒ کے بھانجے پروفیسر منظور احمد بیان کرتے ہیں کہ یہ اس زمانے کی بات ہے جب علامہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ چھٹیوں میں سیالکوٹ آئے ہوئے تھے، رحیما عطار کی دکان کے سامنے کھڑے تھے تختے پر حُقہ دھرا ہوا تھا۔ علامہ حُقہ پی رہے تھے ایک پاؤں زمین پر اور دوسرا تختے پر تھا۔ طلائی کام کی جوتی پہنے ہوئے تھے اتفاق سے مولوی میر حسن ادھر سے گزرے، جوں ہی علامہ کی نظر ان پر پڑی، جھٹ مولوی صاحب کی طرف لپکے۔ جلدی میں تختے پر جو پاؤں تھا اس کا جوتا نکل گیا جو ذرا ڈھیلا تھا وہ اسی طرح شاہ صاحب کے پیچھے ہو لیے۔ اب صورت یہ تھی کہ علامہ کے ایک پاؤں میں طلائی کام کا جوتا تھا۔ دوسرا خالی اور

وہ سر جھکائے مولوی صاحب کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے اسی حالت میں شاہ صاحب کو انکے دروازے تک پہنچا کے واپس آئے جب دوسرا جوتا پہننے لگے نور رحیما نے کہا۔

رحیما باؤجی، تُسی حد کر دِتی۔

علامہ رحیما، تجھے کیا خبر کہ شاہ صاحب کا مرتبہ کیا ہے!

بیوہ کے بچوں کی خاطر

خوش معاملگی اور انسانی ہمدردی علامہ پر ختم تھی۔ ۱۹۲۲ء میں انار کلی سے اٹھ کر میکلوڈ روڈ کی جس کوٹھی میں منتقل ہوئے۔ وہ ان کے شایان شان نہ تھی نہایت بدنما اور بوسیدہ اور کرایہ پونے دو سو روپے ماہانہ۔ دوست، احباب اور نیازمند انہیں اکثر اس طرف توجہ دلاتے رہتے تھے۔ ایک روز علامہ سے عبدالمجید سالک کی یہ گفتگو ہوئی۔

سالک : ڈاکٹر صاحب یہ کوٹھی بدنما ہونے کے علاوہ بہت ہی خستہ حالت میں ہے۔

علامہ : جی ہاں۔ اس میں کھڑے رہنے کی کوئی بات نہیں (ہنس کر) صرف میری دعاؤں سے قائم ہے۔

سالک : پھر پونے دو سو روپے کرایہ، حضرات۔ یہ تو پیسہ برباد کرنے والی بات ہے۔ اس کرائے میں اس سے کہیں بہتر کوٹھی مل سکتی ہے۔

علامہ : آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ دوسرے احباب کا بھی یہی خیال ہے لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں کہ کوٹھی ایک بیوہ کی ہے جس کے بچوں کی گذران اسی کے کرائے پر ہے۔ مجھے یہ کوٹھی چھوڑنے یا کرایہ کم کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔

سفارش خودداری کے منافی

علامہ اقبالؒ مدت العمر مختلف امتحانوں کے ممتحن رہے۔ پرچے سیٹ بھی کرتے تھے

صدر ممتحن بھی ہوتے تھے اس سلسلہ میں بھی انہوں نے بعض اصول وضع کر لیے تھے جن پر نہ سختی سے کاربند رہے۔

ایک بار ایک مستحق مسلم امیدوار کے فارسی کے پرچے کا مسئلہ تھا۔ مسئلہ کی سنگینی اس حد تک تھی کہ حافظ محمود شیرانی اور سر عبدالقادر جیسے ثقہ حضرات علامہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

شیخ عبدالقادر: ڈاکٹر صاحب! اگر یہ مسلمان طالب علم فیل ہو گیا تو سٹیٹ سکالرشپ کوئی ہندو لے جائے گا۔

محمود شیرانی: پرچہ کی طوالت کی وجہ سے اس ہونہار طالب علم سے ایک غلطی ہو گئی۔

عبدالقادر: ڈاکٹر صاحب! آپ پرچہ تو دیکھیے۔

علامہ: (پرچہ دیکھ کر) آپ کے امیدوار کے چھبیس نمبر ہیں، جو مستحق ہے اسے سکالر شپ ملنا چاہیئے۔ میرے کچھ اصول ہیں جن پر میں کاربند ہوں اور اپنے افعال کا جواب دہ ہوں۔ اخلاقی اعتبار سے بھی میں ایسا کرنے سے قاصر ہوں امید ہے کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔

اسی طرح ایک بار مولوی محمد شفیع نے کسی کی سفارش کرنے کے بارے میں استدعا کی۔

مولوی محمد شفیع: ڈاکٹر صاحب، اس معاملہ میں سفارش کر سکیں تو۔ ۔ ۔ ۔

علامہ: آپ کو معلوم ہے کہ میں لوگوں کی سفارش نہیں کرتا۔ تجربہ ثابت کرتا ہے کہ ایسی سفارشات شاذ و نادر ہی کارگر ہوتی ہیں میں اس سلسلہ میں اپنے گذشتہ گناہوں سے پشیمان ہوں۔ تجربہ نے یہ حقیقت مجھ پر واضح کر دی ہے کہ یہ خودداری کے منافی ہے۔ بلا نتیجہ سفارش کرتے جانا مجھے ذلت انگیز معلوم ہوتا ہے۔

انگریز کو رام کرنے کا نسخہ

۱۹۲۲ء میں جب علامہ اقبالؒ انارکلی چھوڑ کر میکلوڈ روڈ پر کرائے کی ایک کوٹھی میں

رہنے لگے تھے۔ اسی کوٹھی کے بارے میں ایک روز مرزا جلال الدین بیرسٹر نے علامہ سے کہا۔

مرزا : میکلوڈ روڈ کی یہ کوٹھی بہر حال انارکلی کی رہائش سے زیادہ مکانیت رکھتی ہے اس کی آرائش کی طرف بھی توجہ دیجیے۔ کم از کم اس کے مردانہ کمروں کو ڈرائنگ اور ڈائیننگ رومز میں ہی تقسیم کر دیجیے۔

علامہ : میں کسی قسم کے بے معنی تکلفات میں الجھنا نہیں چاہتا۔

مرزا : کبھی کبھی حکام کو آپ اپنے ہاں مدعو کر لیا کریں۔ انگریز کو رام کرنے کا بہترین طریقہ دعوت ہے۔ انگریز اکثر بڑے بڑے وعدے ایسی ہی صحبتوں میں کیا کرتا ہے اور جو تعلقات کھانے کی میز پر قائم ہوتے ہیں اس کا احترام اسے ہمیشہ ملحوظ رہتا ہے۔

علامہ : میں ایسی تقریبات پر روپیہ ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔ اوّل تو انگریز کو رام کرنے کا سوال ہی میری دلچسپیوں کے دائرہ سے باہر ہے دوسرے اگر کھانا کھانے کے بعد بھی انگریز رام نہ ہوا تو اس دردسری کا کیا فائدہ۔

نوکروں کی دلداری

علی بخش کا بیان ہے کہ ڈاکٹر صاحب جو خود کھاتے تھے وہی نوکروں کو بھی کھلاتے تھے نوکروں کے لیے کبھی الگ کھانا نہیں پکتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ نوکروں کے لیے گھر سے دال پک کر آئی جس میں گھی نہیں ڈالا گیا تھا۔ جب علامہ کو پتہ چلا تو اندر گئے۔

علامہ : (سخت ناراضگی کے لہجہ میں) یہ چیز تم نے نوکروں کو نہیں کھلائی مجھے کھلائی ہے میں ایسی بات کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ نوکر ہمارے دست و بازو ہیں ہم ان کے پروں پر اڑتے ہیں۔ ہمارے کام ان کے سہارے چلتے ہیں یہ بات بہت بری ہے کہ کھانے میں ان کو الگ رکھا جائے۔

باب پنجم

تقاریر اور مباحثے

شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

جناب والا!

بے معرکہ دنیا میں کوئی قوم نہیں ابھرتی، یہ فطرت کا اٹل قانون ہے۔۔اس سے مفر ممکن نہیں۔ وہی قومیں سرفراز ہوئی ہیں جن کے بچے تیغوں کے سائے میں پل کر جواں ہوئے۔ ستاروں پر کمند انہی قوموں نے ڈالی ہے، مشقت جن کا شعار اور محنت جن کی عادت ہوتی ہے۔

جناب والا!

چشم فلک نے بڑے انقلاب دیکھے ہیں، قوموں کے عروج وزوال کی داستانیں تاریخ کے اوراق سے پوچھئے۔ کبھی سمیری بابل ونینوا میں بام عروج پر تھے۔ ان کے فخر کا تاج مصریوں نے چھینا اور تہذیب کو نئی رفعتوں سے ہمکنار کیا۔ مصریوں کا غرور یونانیوں نے توڑا۔ آریوں کی ایک شاخ نے ہڑپہ کے میدانوں میں اپنا چراغ روشن کیا۔ دوسری نے ایران میں اجالا کیا۔

ایران میں تہذیب کا قافلہ صدیوں بڑی شان سے رواں دواں رہا۔ اور لعل وجواہر لٹاتا رہا یہاں تک کہ یونان کی سنگلاخ چٹانوں سے ایک نوجوان اٹھا اور اس نے ایران کے شہنشاہ دارا کے تاج کو اپنی ٹھوکر سے پارہ پارہ کر دیا۔ یہ سکندر اپنی فوج ظفر موج کو لے کر ایران، مغربی ایشیا، مصر اور شمالی ہندوستان کو روندتا ہوا چلا گیا اور پھر یکایک موت کی تاریکیوں میں کھو گیا۔ اور ساتھ ہی یونانی سطوت ودولت کا ہار بھی ٹوٹ گیا۔ اور اس کے سارے موتی بکھر گئے۔ پھر رومیوں کا ستارہ چمکا اور صدیوں جنوبی یورپ، ایشیائے کوچک اور شمالی افریقہ میں رومیوں کے اقبال کے جھنڈے گڑے رہے۔ یہاں تک کہ گوتھک وحشیوں نے رومن سلطنت کے تارو پود بکھیر دیئے۔ دنیا ان تاریک راہوں میں سفر کر رہی تھی کہ دعائے خلیل اور نوید مسیحا کے پورا ہونے کا وقت آیا۔ رحمت حق کو جوش آیا اور دنیا کے افق پر ایک نیا آفتاب طلوع

ہوا۔ تمدن میں ایک نئی روح پیدا ہوئی۔ تہذیب نے ایک نیا رُخ بدلا۔

سینکڑوں برس یہ چشمہ صافی بہتا رہا اور دنیا اس آبِ حیات سے سیراب ہوتی رہی یہاں تک کہ تیرھویں صدی میں منگولوں کا طوفان بلاخیز اٹھا اور یہ سیل تاتار سطوت عباسی کو بہالے گیا۔ اس سے ایک سو سال کے بعد اندلس میں تند آندھیوں نے قرطبہ کے چراغوں کو بجھا دیا۔

پندرھویں صدی میں ترکی میں عثمانیوں نے اور سولھویں صدی میں مغلوں نے ہندوستان میں نئی شمعیں روشن کیں۔ لیکن انیسویں صدی ختم ہونے سے پہلے ہی داغ فراق صحبت شب کی جلی یہ شمعیں بھی خاموش ہوئیں۔

جناب والا!

سوال یہ ہے کہ قوموں کے عروج و زوال اور طلوع و غروب کا راز کیا ہے؟ سمیری تہذیب کا چراغ کیوں گل ہوا؟ مصریوں کو کس کی نظر کھا گئی؟ ایرانیوں کے جاہ و جلال کی کمند کیوں ٹوٹی؟ یونانیوں کے کمال و جمال کا آفتاب کیوں گہنا گیا؟ رومی تو بڑے جری اور جواں مرد تھے، وہ کیوں صفحۂ ہستی سے مٹ گئے؟ اور تو اور وہ غازی، وہ پُراسرار بندے جن کی ہیبت سے کبھی پہاڑ سمٹ کر رائی بن جاتے تھے آج خود کیوں سمٹ کر رائی بن گئے ہیں۔

جناب والا!

اس کا جواب وہی ہے جو اقبالؒ کی بے مثال بصیرت نے دیا تھا۔

شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

جب کوئی قوم اٹھتی ہے تو طاقت و توانائی، ہمت و حوصلہ، ضبط و نظم کی بے پناہ قوتوں سے آگے بڑھتی ہے۔ نئے مرحلے اور نئی منزلیں سر کرتی ہے۔ لیکن جب یہ سیل تند رو تہذیب کے مرغزاروں میں جوئے نغمہ خواں بن جاتا ہے اور تلوار کے دھنی طاؤس و رباب کی سرمستیوں میں کھو جاتے ہیں تو انجام وہی ہوتا ہے جو سمیریوں، مصریوں، ایرانیوں اور رومیوں کا ہوا۔

جناب والا!

فطرت کا قانون اٹل ہے وہ کسی کی رعایت نہیں کرتا۔ مسلمان جب عرب کے صحرا سے اٹھے تو وہ ایک انقلابی قوت تھے۔ اس لیے ایک سیل تند رو بن کے زمانے پر چھا گئے۔ لیکن جب خلافت پر ملوکیت غالب آئی اور حسین کی روایتوں کے امین یزیدی طرز احساس کا شکار ہو گئے تو اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا اس لیے جناب والا میں آخر میں پھر وہی فقرہ دہراؤں گا۔ جس سے میں نے تقریر کا آغاز کیا تھا کہ:

بے معرکہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں

اُمتوں کی تقدیر اس اٹل حقیقت میں مضمر ہے کہ:

شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا ستارہ

جناب والا!

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے موضوع زیرِ بحث:

ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا ستارہ

ارمغان حجاز کی نظم

بڈھے بلوچ کی نصیحت سے ماخوذ ہے۔ پورا شعر یوں ہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

اس شعر میں اقبالؒ نے فرد کی اہمیّت کو ابھارا ہے لیکن اقبال کی انفرادیت پسندی اسپنسر اور مل جیسے فلسفیوں کی طرح مادہ پرستانہ نہیں ہے۔ اقبال کا وہ فرد جو ملت کے مقدر کا ستارہ بنتا ہے کچھ خاص صفات رکھتا ہے۔ فرد کی ان صفات میں سے چند کی نشاندہی اقبال نے اسی نظم میں کر دی ہے۔

اقبالؒ کے مثالی فرد کی ایک صفت خودداری اور غیرت مندی ہے۔

غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاج سر دارا

یہ غیرت بھی عام چیز نہیں۔ یہ ایک پوشیدہ ہنر ہے

حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر
کہتے ہیں کہ شیشے کو بنا سکتے ہیں خارا

اقبالؒ کے فرد کی تعمیر میں خودداری کے بعد خود اعتمادی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ خود اعتمادی جو انسان کو تگ و تاز پر اکساتی ہے۔ تاکہ وہ اپنے زور بازو سے دولت دریا کو حاصل کر سکے۔

محروم رہا دولت دریا سے وہ غواص
کرتا نہیں جو صحبت ساحل سے کنارا

تو ثابت ہوا کہ وہ فرد جو ملت کے مقدر کا ستارا بنتا ہے صحبت ساحل سے کنارا کرتا ہے دریا کی گہرائی میں غواصی کرتا ہے، گہرائی میں جانے کا خطرہ مول لیتا ہے۔ جد و جہد کرتا ہے خطرات کا مقابلہ کرتا ہے، تب کہیں جا کے اسے سمندر کی تہ سے موتی نکالنے میں کامیابی نصیب ہوتی ہے۔

فرد کی تعلیم و تربیت میں اس جد و جہد کی خصوصی اہمیت ہے اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم ملت کے مقدر کا ستارا بن سکیں اور اس ذمہ داری کو پورا کر سکیں جو اسلام کے نام پر ایک ملک بنانے سے ہم پر عائد ہوتی ہے تو پھر ہمیں سخت کوشی کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

فرد کو ملت کے مقدر کا ستارا اقبال نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں محض اتفاقاً نہیں کہا۔ فرد کی اہمیت اقبال کے ہاں اساسی ہے۔

۱۹۰۸ء میں انگلستان سے واپس آنے کے بعد ہی اقبال نے اپنی مثنوی اسرارِ خودی کی داغ بیل ڈال دی تھی - ۱۹۱۱ء میں انھوں نے عطیہ فیضی کو ایک خط میں لکھا تھا کہ میں ایک مثنوی پر کام کر رہا ہوں - ۱۹۱۵ء میں اقبالؒ کی یہ شہرۂ آفاق مثنوی شائع ہوئی - یہ فرد کی اہمیت کا منشور ہے - فرد کی خودی تعمیر کے تین مرحلوں سے گزرتی ہے پہلا مرحلہ اطاعت کا ہے، دوسرا ضبط نفس کا اور تیسرا نیابت الٰہی کا۔

تعمیر خودی کے ان مرحلوں سے گزرنے کے بعد وہ فرد بنتا ہے جو ملت کے مقدر کا ستارا ہوتا ہے۔

اقبالؒ کے کلام میں ایسے فرد کا نام مومن ہے - وہ مومن جو بے تیغ بھی لڑتا ہے جس کی ٹھوکر سے صحرا و دریا دو نیم ہوتے ہیں - جس کی ہیبت سے پہاڑ سمٹ کر رائی بن جاتے ہیں جو خبر میں، نظر میں یکتا ہوتا ہے اور سخن میں دلنواز بھی۔

اقبالؒ نے اپنے مثالی فرد کی سب سے زیادہ خوبصورت اور موثر تصویر اپنی نظم مسجد قرطبہ میں کھینچی ہے۔

خاکی و نوری نہاد، بندہ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دلنواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو!
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

جناب والا!

یہ ہے وہ فرد جس کے بارے میں اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

باطل سے دبنے والے اے آسمان نہیں ہم

جناب والا!

حق و باطل کی آویزش نئی نہیں، باطل کی دراز دستیاں روزِ ازل سے قبائے حق سے الجھتی رہی ہیں۔ کبھی کوئی نمرود کسی خلیل کو آگ میں ڈال کر خاک کرنا چاہتا ہے کبھی کوئی فرعون کسی موسیٰ کے درپے آزار ہوتا ہے، لیکن رحمتِ حق کو بھی جوش آتا ہے۔ فرعون غرق دریا ہوتا ہے اور خلیل کے لیے آگ گلزار بن جاتی ہے۔ فرات کے کنارے کربلا میں پھر یہی قوتیں صف آرا ہوتی ہیں، چولے بدلے ہوئے ہیں۔

کشمکش وہی پرانی ہے، نہایت سادہ اور رنگین ہے داستان حرم۔ ہر کربلا کے بعد اسلام زندہ ہوتا ہے اور پھر ہر کربلا ایک نئے روپ میں آتی ہے اور ہر یزید کا نام یزید نہیں ہوتا۔

باطل سے دبنے والے اے آسمان نہیں ہم

ہر دور میں مردِ مسلمان کا امتحان ہوتا ہے اور ہر دور میں ایک نیا طوفان اٹھتا ہے ایک نئی آندھی آتی ہے۔

کبھی کوئی صلاح الدین ایوبی بن جاتا ہے، کبھی اجنبی دیار میں طارق بن زیاد کا نعرۂ اللہ اکبر گونجتا ہے اور کبھی سندھ کے تپتے صحراؤں میں ابن قاسم کی آواز شبستان وجود کو لرزا دیتی ہے ہند کے بت کدہ میں کوئی محمود بت شکن بنتا ہے۔ کوئی غوری جمنا کے پانی سے وضو کرتا ہے اور کوئی ٹیپو عزت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دیتا ہے۔

حق و باطل کی آویزش صدیوں سے جاری ہے۔ آج پھر ہم دوراہے پر کھڑے ہیں۔ دنیا سوال بن گئی ہے۔ کبھی ایسا تو نہ ہوا تھا۔

یہ شیر ببر نیند کے ایسے ماتے تو نہ تھے۔ ان خشکیوں اور دریاؤں میں لڑنے والوں کو آج کیا ہوا؟ یہ یورپ کے کلیساؤں میں اذانیں دینے والے خاموش کیوں ہیں۔ تلواروں کی چھاؤں

ہیں کلمہ پڑھنے والے آج اتنے بے حس کیوں ہو گئے ہیں؟

جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

جناب والا!

آج جب کہ پاکستان کے در و دیوار، پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کے کلمۂ حق سے گونج رہے ہیں اور پاکستان کی سیاست کو واضح طور پر اسلامی آب و رنگ دیا جا رہا ہے اور لادینی سیاست کے تصور کو مکمل طور پر رد کیا جا چکا ہے۔ وقت کا اہم ترین تقاضا ہے کہ اس مسئلہ پر علمی انداز میں غور کیا جائے کہ سیاست کو دین سے جدا کرنے کے مضمرات کیا ہیں اور اس سلسلے میں تاریخ کا فیصلہ کیا ہے۔ چنانچہ آج میں اسی موضوع پر اقبال ؒ کے حوالے سے کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

جناب والا!

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ایک بلند پایہ اور بلند نظر سیاسی مفکر تھے۔ انہوں نے یورپ میں رہ کر بہت قریب سے مغربی دنیا کے چاروں سیاسی نظاموں یعنی بادشاہت سوشلزم، پارلیمانی جمہوریت اور فاشزم کا بہت گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور ان سب کو رد کر دیا تھا۔

بادشاہت کے بارے میں علامہ ضرب کلیم میں فرماتے ہیں۔

غواص تو فطرت نے بنایا ہے مجھے بھی
لیکن مجھے اعماق سیاست سے ہے پرہیز
فطرت کو گوارا نہیں سلطانی جاوید
ہر چند کہ یہ شعبدہ بازی ہے دلآویز
فرہاد کی خارا شکنی زندہ ہے اب تک
باقی نہیں دنیا میں ملوکیت پرویز

جمہوریت کے بارے میں یہ کہ علامہ حقیقی جمہوریت کے خلاف نہیں تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے انگریزی خطبات میں واضح طور پر فرمایا کہ جمہوری طرز حکومت اسلام کی روح کے عین مطابق ہے لیکن علامہ مغربی طرز کی مروجہ جمہوریت کے سخت خلاف تھے۔ جس کے دامن پر افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کی نو آبادیوں کے خون کے دھبے تھے۔

ہے وہی سازِ کہن، مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

ضربِ کلیم میں مشرق و مغرب کے عنوان پر علامہ فرماتے ہیں۔

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظام جمہوری
نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

ارمغانِ حجاز کی نظم ابلیس کی مجلس شوریٰ میں ہے۔

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

علامہ نے سرمایہ دار مغرب کی جمہوریت کے چنگیز سے تاریک تر اندرون ہی سے پردہ نہیں اٹھایا۔ وہ سوشلزم کی استحصال سامانیوں سے بھی خوب واقف تھے۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

جناب والا!

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملوکیت، جمہوریت اور سوشلزم تینوں مروج طرز ہائے سیاست کو اقبال ایسے مفکر اور مدبر نے کیوں رد کر دیا۔ وہ کون سی خرابی ہے اور وہ کون سا بنیادی نقص ہے جو ان بظاہر متضاد سیاسی نظاموں میں ایک قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے؟ اقبال کا جواب یہ ہے۔

جلال بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

لادین سیاست میں ریاست سب سے زیادہ خود غرض اور ظالم استحصالی قوت بن کر ابھرتی ہے اور ریاست کا مفاد خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز، صحیح یا غلط مقدم سمجھا جاتا ہے۔ تو جناب والا!

اصل مسئلہ سیکولرزم ہے۔ سیاست سے دین کو جدا کرنے کا ہے سارا فساد فی الارض اسی افتراق سے پیدا ہوتا ہے۔

اقبال نے بال جبریل کی نظم دین وسیاست میں اپنا نقطہ نظر کھول کر واشگاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لیے نامرادی
دوئی چشم تہذیب کی نابصیری

جناب والا!

اقبال کی دوربین نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ مشرق و مغرب کی لادین سیاست دنیا کو تباہی کے گڑھے پر لا کھڑا کرے گی۔ چنانچہ اقبالؒ نے ضرب کلیم میں جنگ عظیم دوم سے بہت پہلے دنیا کو خبردار کر دیا تھا۔

جو بات حق ہو وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی ۔ خدا نے مجھ کو دیا ہے دل خبیر و بصیر

مری نگاہ میں ہے یہ سیاست لادین　　کنیزاہرمن ودوں نہاد ومردہ ضمیر

جناب والا!

پاکستان لادین سیاست سے چھٹکارا حاصل کرنے اور باضمیر اور روشن نہاد سیاست کی رحمتوں اور برکتوں کو عام کرنے ہی کے لیے قائم ہوا تھا۔ اس باخدا سیاست کا علَم سب سے پہلے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے بلند کیا تھا۔

یہ اعجاز ہے ایک صحرانشیں کا
بشیری ہے آئینہ دار نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

آیئے! دعا کریں اللہ تعالیٰ ہمیں جنیدی۔ دین اور اردشیری حکومت کو یکجا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ پاکستان کو قائم کرنے کا مقصد وحید بھی یہی ہے۔

شکریہ۔ پاکستان، پائندہ باد۔

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی　(اتفاق)

جناب والا!

جہاد ہماری سرشت ہے۔ ہمیں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانا آتا ہے۔ ہم اس قوم کے فرد ہیں جس نے دشت وصحرا بھی نہیں چھوڑے تھے۔ جس نے بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیئے تھے یہی وہ قوم ہے جس نے ایران کے آتش کدوں کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔

جس نے صلیبیوں کی تلواروں کو کند کیا تھا۔ جس نے جبل الطارق کے کنارے کشتیاں جلادی تھیں۔ جس نے کبھی یورپ کے کلیساؤں میں اذانیں دی تھیں۔ ہم وہی ہیں جنہوں نے کبھی جمنا کے پانی سے وضو کیا تھا۔ آب رود گنگا کو وہ دن یاد ہوگا جب ہمارا کارواں اس

کے کنارے آکے اترا تھا۔ وہ محمود جو بت شکن تھا جس نے بت فروش کہلانا پسند نہیں کیا۔ وہ ہم ہی میں سے تھا۔ وہ صلاح الدین ایوبی جس نے صلیبیوں کے سیلاب بلاخیز کو پاش پاش کر دیا۔ ہمارے موتیوں کی لڑی کا ہی گوہر آبدار تھا۔ ہمارا ماضی درخشاں تھا، ہمارا مستقبل بھی درخشاں ہے۔ دنیا موت سے ڈرتی ہے۔ ہم اسے یوں تلاش کرتے ہیں جیسے جوہری کھوئے ہوئے جواہرات کو تلاش کرتا ہے ہم تیغوں کے سائے میں پل کر جواں ہوئے ہیں اور ہلال کا خنجر ہمارا قومی نشان ہے۔

پاکستان زندہ باد　　　پاکستان پائندہ باد

جب بھی وطن نے ہمیں پکارا ہے ہم سر پہ کفن باندھ کے نکل آئے ہیں۔ ہمیں اپنی زندگی عزیز نہیں قوم کی عزت عزیز ہے، ہم مومن ہیں۔ ہم بے تیغ بھی لڑنا جانتے ہیں ہماری ٹھوکر سے صحرا و دریا دونیم ہوئے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ خونِ صد ہزار انجم سے سحر پیدا ہوتی ہے اور ہم ایک نئی سحر پیدا کرنے کے لیے صد ہزار سروں کی قربانی دینے کو تیار ہیں۔　　　باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

جناب صدر!　　　(اختلاف)

فاضل مقرر کی تقریر میں نے پوری توجہ سے سنی۔ میں ان کی خطابت کی داد دیتا ہوں تاریخی حوالے بھی خوب تھے۔ جذبے کی فراوانی بھی تھی۔ جوش و ولولے کا دریا بھی لہریں مار رہا تھا۔ لیکن فاضل مقرر اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی معقول دلیل نہ دے سکے۔ خطابت کی گرمی میں، وہ مومن ہونے کی شرط ہے، اقبال کا زور مومن ہونے پر ہے بے تیغ لڑنے پہ نہیں۔ فاضل مقرر نے تو شعر کی بساط ہی الٹ دی ہے۔

جناب صدر! جذبہ اچھی چیز ہے لیکن جذباتیت تباہ کن ہوتی ہے۔ فاضل مقرر کی تقریر

جذباتیت سے بھرپور ہے۔ اگر وہ یہ بتاتے کہ مومن بے تیغ کیوں لڑ سکتا ہے۔ مومن کو وہ کون سی طاقت حاصل ہوتی ہے جو تیغ و تفنگ سے زیادہ طاقت ور ہوتی ہے تو ایک بات بھی تھی۔ انہوں نے مومن کی قوت کا کھوج نہیں لگایا۔ انہوں نے مومن کی توانائی کا تجزیہ نہیں کیا اور یہی ان کی تقریر کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔

جناب صدر!

ہم جو حقیقی ایمان سے عاری نظر آتے ہیں اور عمل سے بھی، کیا ہمیں زیب دیتا ہے کہ عظیم بے تیغ سپاہیوں، خدا کے پُراسرار بندوں، ذوقِ خدائی رکھنے والے غازیوں کا نام لے کر اپنی نااہلی اور کم ہمتی پر پردہ ڈالیں۔ صلاح الدین ایوبی، محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کے عظیم تاریخی کارنامے کیا ہمارے حال کی زبوں سامانی کا بدل ہو سکتے ہیں۔

جناب صدر!

ہم طارق کی کشتیوں کا ذکر کرتے نہیں تھکتے، لیکن کوئی یہ نہیں بتاتا کہ سات سو سال اندلس پر حکومت کرنے کے بعد قرطبہ کی اذانیں کیوں خاموش ہو گئیں؟ ابوعبداللہ کو ذلت و رسوائی کے ساتھ الحمرا کیوں چھوڑنا پڑا؟ کیوں اسپین سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹ گیا؟ ہم صلاح الدین ایوبی کا تذکرہ تو کرتے ہیں؟ لیکن یہ نہیں بتلاتے کہ آج بیت المقدس پر کون قابض ہے اور کیوں قابض ہے۔

جناب صدر!

ہم بات بات پر موت کا تذکرہ تو کرتے ہیں، ملک کی خاطر مر جانے کو تو کہتے ہیں جہاد کرنے کو تو کہتے ہیں۔ لیکن ملک و وطن کی خاطر زندہ رہنے کے عزم کا اظہار نہیں کرتے۔

جناب صدر!

آپ نے نوٹ کیا ہوگا۔ مقرر نے بار بار موت کا لفظ استعمال کیا مر جانے کے عزم کا اظہار کیا۔ لیکن زندگی کا لفظ ساری تقریر میں ایک بار بھی نہیں آیا۔ اس طرح فاضل

مقرر نے ماضی کے اوراق تو الٹے لیکن حال کے تذکرہ سے دامن بچا گئے۔ خوابوں کی باتیں تو کیں، حقیقتوں سے آنکھ نہ ملا سکے۔

جناب صدر!

حقیقت سے یہ فرار، خیالی دنیا میں رہنے کی یہ عادت، یہ سستی جذباتیت یہ رسمی مذہب پرستی بہت خطرناک علامتیں ہیں۔ ہمیں حقیقتوں کو سمجھنا ہے اور ان کا مقابلہ کرنا ہے اپنے قومی اور ذاتی کردار کی خامیوں کا تجزیہ کرنا ہے۔ یہ کہہ کر کہ ہم پاکستان کی خاطر مرنے کو تیار ہیں۔ اپنی ذمہ داریوں سے نہیں بچ سکتے۔ اس وقت پاکستان کی خاطر زندہ رہنے کی بھی کم ضرورت نہیں، پاکستان کو زندہ رکھنے کی کوشش میں ہمیں ہر روز ان منزلوں سے گزرنا ہوگا جو موت سے زیادہ کرب انگیز ہوں گی۔ محنت، خدمت اور دیانت، اتحاد، تنظیم اور ایمان کی زندگی گزارنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس لیے جناب صدر، آخر میں یہ عرض کروں گا کہ بے تیغ لڑنے کا عزم مبارک مومن بننے کا حوصلہ بھی کیجیے۔

پاکستان کی بقاء سائنسی اور تکنیکی ترقی پر منحصر ہے

عالی مقام مہمان خصوصی، صدر گرامی، اور معزز سامعین

سماجی ارتقار کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ جو قوم نہ اپنی حالت کو سمجھتی ہے اور نہ ماحول کے تقاضوں کو، وہ مٹ جاتی ہے۔ اس کی داستان بھی داستانوں میں نہیں ہوتی۔ جیسا کہ متحدہ ہندوستان میں اقبال نے اہل ہند کو متنبہ کیا تھا۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہ شعر لکھتے وقت غالباً اقبالؒ کے ذہن میں بغداد اور غرناطہ کی مسلمان تہذیبوں کی تباہی تھی۔ آج جب کہ ہم اغیار کے نرغے میں گھرے ایک دوراہے پر کھڑے ہیں اور ہمیں اپنی

قومی زندگی کا اہم ترین فیصلہ کرنا ہے کہ پاکستان کی بقا اور استحکام کا راستہ کیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ آج جس موضوع پر ہم بحث کر رہے ہیں یعنی پاکستان کی بقا کا انحصار سائنسی و تکنیکی ترقی پر ہے۔ ہماری قومی ترجیحات کا صحیح تعین کرنا ہے اسی لیے میں اس پر ایک نئے زاویے سے روشنی ڈالنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

جناب والا!

مسئلہ بہت واضح ہے کہ پاکستان دشمنوں میں گھرا ہوا ہے نظریاتی سیاست ہونے کی وجہ سے دونوں سپر طاقتیں ہمیں شک و شبہ کی نظر سے دیکھتی ہیں اور ہندوستان تو ہمارا ازلی دشمن ہے۔ ان حالات میں بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ہم اپنے دفاع کو اتنا مضبوط کریں کہ کسی کو ہماری طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہ ہو۔

جناب والا!

اپنے دفاع کو مضبوط کرنا اور اپنی زمینی و نظریاتی سرحدوں کو مستحکم کرنا وقت کا اہم ترین قومی تقاضا ہی نہیں، ہمارا مذہبی فریضہ بھی ہے۔ قرآن حکیم میں بڑے پر زور الفاظ میں مسلمانوں کو تنبیہہ کی گئی ہے کہ اپنے دفاع کو مضبوط کرو۔ اور دشمنوں سے جنگ کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہو۔ ورنہ سخت نقصان اٹھاؤ گے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اگر تم جنگ کے میدان میں دو بدو مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہو تو تمہیں سخت سزا ملے گی اور تمہاری جگہ دوسری قوم لے لے گی"

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اپنی مدافعت کے لیے خبردار رہو، اور کفار سے حتی الوسع مقابلہ کرنے کی کوشش کرو، اپنی قوت اور تمام گھوڑوں سے۔

قرآن کریم میں ایک اور جگہ حکم دیا گیا ہے "اے ایمان والو! اپنے بچاؤ کا انتظام کرو" ایک اور مقام پر آتا ہے " کافر تو یہ چاہتے ہیں اگر تم اپنے ہتھیاروں اور سامانوں سے غافل

ہو جاؤ تو تم پر یکبارگی حملہ کر دیں۔"

ان آیات سے بہت واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمیں اپنے دفاع اور تحفظ کے لیے سر توڑ کوشش کرنی ہے اور اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لانا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان اور عالم اسلام کی بقا، استقلال اور استحکام کی جنگ لڑنے کا سب سے زیادہ موثر ذریعہ کیا ہے، اللہ کا شکر ہے کہ مسلمان ہوتے ہوئے ہمارے پاس یقین محکم بھی ہے۔ عزم راسخ بھی اور ستاروں پر کمند ڈالنے کا حوصلہ بھی اور وسائل سے بھی ہم محروم نہیں۔ تو کیا چیز ہے جو ہماری بقا اور استحکام کی ضامن بن سکتی ہے۔ اس کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ ہے، سائنسی، فنی، تکنیکی ترقی۔ یہ دور ٹیکنالوجی کا ہے۔ صنعتی پیداوار کا ہے۔ اسی ترقی میں ہماری نجات ہے۔ صرف ہماری نہیں پوری تیسری دنیا کی امیدیں تکنیکی اور صنعتی ترقی سے وابستہ ہیں جبکہ پہلی اور دوسری دنیا کا مفاد اس میں ہے کہ تیسری دنیا ان کے لیے خام مال پیدا کرتی رہے اور ان کی صنعتی پیداوار کی منڈی بنی رہے۔

جناب والا!

میں زرعی ترقی کا مخالف نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ زرعی برآمدات کے ذریعے ہم اپنے دفاع میں خود کفیل نہیں ہو سکتے بلکہ بغیر صنعتی بنیاد قائم کیے اور بغیر جدید ٹیکنالوجی سے استفادہ کیے ہم زرعی پیداوار کو بھی نہیں بڑھا سکتے۔ یہاں یہ حقیقت بھی مدنظر رکھنی چاہیے کہ ترقی یافتہ صنعتی ممالک نہیں چاہتے چاہیے کہ ہم جدید ٹیکنالوجی حاصل کریں اور اپنے دفاع کو مستحکم کریں پاکستان کے پرامن ایٹمی پروگرام پر بھارتی، امریکی اور اسرائیلی لابی نے جو واویلا مچا رکھا ہے اور اسلامی بم کا جو طوفان اٹھایا ہے۔ اس کی غرض و غایت اس کے سوا کچھ نہیں کہ پاکستان کو پرامن مقاصد کے لیے بھی ایٹمی ٹیکنالوجی سے محروم رکھا جائے اور اس طرح اس کو کمزور رکھ کر اس کا استحصال کیا جائے۔

جناب والا! معروف سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ

سائنس اور ٹیکنالوجی میں خطرناک حد تک پس ماندہ ہے۔ ہمارے لیے سائنسی ترقی ہماری بقا کا سوال ہے۔ جدید ٹیکنالوجی ہماری معیشت اور قومی آزادی کی سب سے مضبوط ضمانت ثابت ہوگی۔ سائنس، تحقیق اور ٹیکنالوجی میں ترقی کر کے ہی پاکستان عالم اسلام کی خدمت بھی کر سکے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ جدید ٹیکنالوجی میں مہارت اور کمال ہمارا ہی نہیں پورے عالم اسلام کا مسئلہ ہے۔ یہ کوئی راز نہیں، اسرائیل کی جارحانہ کارروائیوں کے پیچھے امریکی امداد کے علاوہ اس کی اپنی سائنسی اور تکنیکی برتری بھی ہے۔ پاکستان اور پورے عالم اسلام کو اس چیلنج کا جواب دینا ہے۔ جو اسلام دشمن قوتوں نے اپنی ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر ہمارے سامنے پیش کیا ہے!

جناب والا!

آخر میں، میں یہ عرض کروں گا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف رجعت ہمارے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہوگی۔ اسلام میں علم و حکمت کا حصول ایک فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن حکیم بار بار تفکر و تدبر کی دعوت دیتا ہے۔ وحی کی ابتدا ہی اقرأ کے لفظ سے ہوئی۔ رب زدنی علماً ایک قرآنی دعا ہے۔ اسلام کے اس علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے تحصیل علم و حکمت کی وہ عظیم اور ہمہ گیر تحریک پیدا ہوئی جس نے گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں بغداد اور اندلس کو دنیا کا روشن ترین خطہ بنا دیا تھا۔ جدید مغربی دنیا کی علمی و تحقیقی سرگرمیوں کے سوتے مسلم اسپین ہی سے پھوٹے۔ یہ ساری دنیا کو معلوم ہے کہ دنیا کا سب سے پہلا انسائیکلوپیڈیا مسلمانوں ہی نے بغداد میں دسویں صدی عیسوی میں اخوان الصفا کے نام سے بتیس جلدوں میں ترتیب دیا تھا۔

جناب والا!

مختصر یہ کہ پندرہویں صدی ہجری کے اوائل میں ہمارے سامنے جو سب سے بڑا چیلنج ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی تصورات اور اقدار کو جدید اداروں میں کیسے تبدیل کیا جائے۔ یہ بڑی

فراست اور جراُت کا کام ہے ورنہ طرز کہن پر اڑنا اور آئین نو سے ڈرنا منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں۔ شکریہ!

لیڈر بنائے جاتے ہیں پیدا نہیں ہوتے (اتفاق)

صاحب صدر!

مشرقی ملکوں میں جو تھوڑے بہت افراد علوم وفنون میں ممتاز نظر آتے ہیں یا وہ لوگ جو اپنے اپنے شعبوں میں لیڈر کی حیثیت رکھتے ہیں ان کو دیکھ کر یہ حسرت آتی ہے کہ یہ تو خوش قسمت تھے کہ ان کی صلاحیتوں اور ذہانتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ نہ جانے اور کتنے جوہر قابل ہوں گے جن کو چمکنے کا موقعہ نہیں ملا۔ جو بن کھلے مرجھا گئے۔ جو پتھر سے ہیرا نہ بن سکے نظم طباطبائی نے اپنی نظم گور غریباں میں (جو انگریز شاعر طامس گرے کی نظم کا ترجمہ ہے) اسی ٹریجڈی پر ماتم کیا ہے۔ خدا جانے تھے ان لوگوں میں کیا کیا جوہر قابل

خدا معلوم رکھتے ہوں گے یہ ذہن رسا کیسے
زمانے نے مگر کوئی ورق ایسا نہیں الٹا
کہ بار فکر سے مہلت یہ پاتے سر اٹھانے کی
مصیبت نے طبیعت کی روانی کو کیا پسپا
کہ بار آنے نہ پائی جوہر ذاتی دکھانے کی
بہت سے گوہر شہوار باقی رہ گئے ہونگے
کہ جن کی خوبیاں سب مٹ گئیں تہہ میں سمندر کی

غالب نے اسی حسرت کا اظہار اس شعر میں کیا ہے۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یونیسکو کے ایک مطالعہ کے مطابق دنیا کی مختلف نسلوں کے درمیان صلاحیت وذہانت میں اتنا فرق نہیں پایا جاتا جتنا کہ کسی نسل کے اندر مختلف افراد میں پایا جاتا ہے پھر یہ جو مشرق و مغرب کی صنعتی، سائنسی، سیاسی اور تمدنی ترقی میں زمین وآسمان کا فرق ہے، کیوں ہے؟ وہ یورپ و امریکہ جو قرون وسطی تک اندھیرے میں تھے بعد کو روشنیوں کے اجارہ دار کیسے بنے؟ وہ فرنگی جو جنوبی ایشیا میں سترھویں صدی کے اواخر میں تاجروں کے آئے تھے وہ تاجدار کیسے بنے؟ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک معمولی کلرک لارڈ کلایو بن کر کیسے ابھرا؟ ایسا کیوں ہے کہ علوم وفنون کے بڑے لیڈر ستر ھویں صدی سے نہر سویز کے اس پار ہی پیدا ہوئے؟

جناب صدر!

یہ محض اتفاق نہیں، یہ محض تقدیر کا کھیل نہیں۔ یہ انقلاب اس لیے آیا کہ لیڈر بنائے جاتے ہیں پیدا نہیں ہوتے۔ وہ اپنے تہذیبی اداروں میں اپنا لیڈر بنا سکے اور بنا رہے ہیں اور ہم بدقسمتی سے ایسے ادارے بوجوہ قائم نہیں کر سکے جو لیڈر بناتے ہیں۔

یوں۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

لیکن یہ "نمی" کسی کسی کے حصے میں آتی ہے۔

جناب والا!

جن کو ہم پیدائشی لیڈر کہتے ہیں۔ جیسے صلاح الدین ایوبی، محمد بن قاسم، شاہ ولی اللہ سرسید، اقبال، قائداعظمؒ، ڈاکٹر عبدالسلام ان کا جوہر ذاتی بھی اسی لیے چمک سکا کہ ان کو سازگار ماحول میسر آسکا۔ موزوں تربیت مل سکی اور ضروری تجربات حاصل ہو سکے۔

اگر صلاح الدین ایوبی کو اپنے عظیم باپ نجم الدین ایوب، اور چچا جنرل اسدالدین شیرکوہ کی سرپرستی اور تربیت میسر نہ ہوتی تو کیا وہ صلیبیوں کو شکست فاش دینے کے قابل ہو سکتا۔

محمد بن قاسم نے سترہ برس کی عمر میں بلوچستان، سندھ اور ملتان کو زیر ضرور کیا لیکن کیا اس کے پیچھے اس کے چچا حجاج بن یوسف کی تربیت اور تنظیم اور دمشق کی ملٹری اکیڈمی کی تعلیم نہیں تھی؟ اور اس کے پاس پتھر پھینکنے اور آگ کے گولے پھینکنے کی منجنیقیں نہیں تھیں؟ جن سے راجہ داہر محروم تھا۔

شاہ ولی اللہ جینئس ضرور تھے، لیکن ان کی خاندانی روایت اور تربیت بھی اعلیٰ ترین تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے والد شاہ عبدالرحیم اپنے دور کے فاضل ترین علماء میں سے تھے اور ان کے دادا شاہجہان کی فوج میں جرنیل تھے اور سرسید کے والد میر متقی مغل بادشاہ شاہ عالم کے مقربین میں سے تھے۔ علامہ اقبال کی طبعی ذہانت میں کلام نہیں، لیکن یاد کیجئے کہ اقبال کو ان کے والدین مولوی بنانا چاہتے تھے، اس لیے انہوں نے اقبال کو مولوی غلام حسین کے مکتب میں داخل کیا تھا۔ اگر وہ مولوی میر حسن کی نگاہ میں نہ آتے اور وہ انہیں انگریزی مدرسہ سے روشناس نہ کراتے اور اگر اقبال اپنے بھائی شیخ عطا محمد کے تعاون سے انگلستان نہ جاتے تو نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال، داغ کے رنگ کی شاعری مثلاً ؎

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

سے آگے بڑھتے یا نہیں؟

جناب والا!

جو لوگ قائداعظمؒ کو پیدائشی لیڈر کے طور پر پیش کرتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ قائداعظمؒ کا سیاسی لیڈر بن جانا محض حسن اتفاق تھا۔ اگر وہ اپنے کاروبار کے سلسلہ میں انگلستان نہ جاتے اور وہاں مجبوراً قانون کی تعلیم حاصل نہ کرتے تو یقیناً ایک کامیاب تاجر محمد علی جناح بھائی رہتے۔ شاید قائداعظمؒ محمد علی جناح نہ بن سکتے۔

جناب والا! ان تمام مستند تاریخی مثالوں اور شواہد سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہو

گا کہ لیڈر بنتے ہیں پیدا نہیں ہوتے۔ شکریہ

لیڈر بنائے جاتے ہیں پیدا نہیں ہوتے (اختلاف)

صدر گرامی!

میرا نظریہ یہ ہے کہ نظام ربوبیت کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں ایسے یگانہ روزگار انسان پیدا کرتا رہتا ہے جو اپنے اپنے دائرے میں انسانوں کی رہبری، رہنمائی یا قیادت کے فرائض انجام دیتے ہیں اور ایسے غیر معمولی کارنامے سرانجام دیتے ہیں جن سے تہذیب و تمدن کی راہیں روشن ہو جاتی ہیں۔ یہ لیڈر غیر معمولی ذہن اور کردار رکھتے ہیں اور ان کی کامیابی اور پرکاری کو محض تربیت و ماحول کا مرہون منت نہیں کہا جا سکتا۔

صدر والا قدر!

اسلامی تاریخ ایسے ناموں سے بھری پڑی ہے۔ الغزالی جابر بن حیان رازی، بوعلی سینا، البیرونی، ابونصر فارابی، نظام الملک طوسی، عمر خیام، وغیرہ نے علم و فن، فلسفہ اور سائنس کی دنیا میں حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے۔ ان میں بعض بہت ہی نامساعد حالات کی پیداوار تھے۔ مثلاً الغزالیؒ کے والد غزال تھے یعنی اون کاتنے کا کام کرتے تھے۔ اس نسبت سے وہ الغزالیؒ کہلائے۔ سائنسدان جابر بن حیان کے والد عطار تھے۔ طوسی کے باپ، محصول وصول کرنے پر ملازم تھے۔ اسلامی تاریخ کے مشہور مورخ طبری پر اتنی غریبی کا زمانہ گزرا تھا کہ ایک بار اپنی قمیص کی آستینیں بیچ کر ایک وقت کی روٹی کھائی۔

صدر ذی وقار!

سپہ گری کے میدان میں بھی جو بڑے نام ہیں وہ بھی اس حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں کہ جرنیل اور سپہ سالار بھی پیدا ہوتے ہیں بنائے نہیں جاتے۔ سعد بن وقاص، خالد بن ولید

موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد، محمد بن قاسم کو کون سی ملٹری اکیڈیمی پیدا کر سکتی ہے؟

ماضی قریب میں بابر، شیر شاہ، احمد شاہ ابدالی، حیدر علی جیسے ملٹری لیڈرز کی زندگی اس دعوے کی تردید کرتی ہے کہ لیڈر بنائے جاتے ہیں پیدا نہیں ہوتے۔ سب کو معلوم ہے کہ جب بابر کا باپ عمر مرزا مرا ہے تو نوجوان بابر کس کسمپرسی کی حالت میں تھا۔ شیر شاہ ایک معمولی جاگیردار کا بیٹا تھا۔ جس کو اس کے باپ نے گھر سے نکال دیا تھا۔ احمد شاہ ابدالی نادر شاہ کے باڈی گارڈ کا سردار تھا، اور بس حیدر علی ایک سپاہی سے تاجدار بنا۔

صدرِ گرامی!

خود پاکستان کی تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ لیڈر بنائے نہیں جاتے پیدا ہوتے ہیں سر سید احمد خاں کے بھائی سید محمد کا نام کس نے سُنا ہے۔ حالانکہ وہ بھی اسی ماحول کی پیداوار تھے۔ جس میں سر سید پلے بڑھے۔ قائد اعظم رح محمد علی جناح کے چھوٹے بھائی احمد علی جناح گمنامی کی زندگی جیئے اور گمنامی کی موت مرے۔ حالانکہ وہ انہی والدین کی اولاد تھے۔ جن کی اولاد محمد علی جناح تھے۔ خود علامہ اقبال کو دیکھئے کہ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کو کون جانتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے بچپن کا زمانہ خاصی تنگدستی کے حالات میں گزرا تھا لیکن جو جوہر قابل ہوتا ہے وہ بہر حال چمک اُٹھتا ہے۔ اب ذرا علامہ اقبال ہی کی مثال کو بڑھائیے۔ علامہ کے بیٹے جاوید اقبال کو علامہ سے بہتر ابتدائی ماحول ملا۔ وہ اس کی وجہ سے بیرسٹر تو ہو گئے۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کر لی، چیف جسٹس کے مرتبے تک بھی پہنچے لیکن اقبال ہونا اور بات ہے۔

صدرِ والا!

ان دلائل اور مثالوں سے آج کی قرارداد کی تردید ہوتی ہے کہ لیڈر بنائے جاتے ہیں پیدا نہیں ہوتے۔

—

لیڈر بنائے جاتے ہیں پیدا نہیں ہوتے (اختلاف)

جناب والا!

آج کی قرارداد سے قطعاً مجھے اتفاق نہیں ہے اس لیے میں اس کی تردید میں اپنے دلائل پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

میں تربیت اور تعلیم کے اثر اور ضرورت سے انکار نہیں کر رہا ہوں۔ بغیر تربیت و تعلیم کے اور سازگار ماحول کے کوئی لیڈر، لیڈر نہیں بن سکتا۔ لیکن بنیادی اہمیت تعلیم و تربیت کی نہیں خداداد صلاحیت کی ہے بغیر غیر معمولی ذہنی صلاحیت اور تخلیقی قوت کے کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا جا سکتا۔ لیڈر وہی ہوتا ہے تاریخ کا رخ وہی موڑتا ہے۔ سائنس کے انکشافات وہی کرتا ہے، ٹیکنالوجی میں کمال وہی حاصل کرتا ہے جو اپنے مخصوص میدان میں قیادت کے جوہر لے کر پیدا ہوا ہو۔

جناب والا!

اگر تاریخ کے جھروکوں میں جھانک کر دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ تاریخ ساز ہستیاں وہی تھیں جو اپنے اپنے دائرہ کمال میں تخلیقی جوہر و قیادت کی صلاحیت لے کر پیدا ہوئی تھیں اور جنھوں نے ہر قسم کے نامساعد ماحول کے پتھروں کو توڑ کر اپنے لیے راہ پیدا کی۔ جدید سائنسی تہذیب کی ابتداء ڈھائی ہزار سال پہلے یونان سے ہوئی اور یونانی علم و حکمت کا پہلا لیڈر وہ بوڑھا فلسفی سقراط تھا جو ایتھنز کے گلی کوچوں میں کھڑا لوگوں کو درس حکمت دیا کرتا تھا۔ اور سقراط

جناب والا!

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ایتھنز کے ایک سنگ تراش کا بیٹا تھا۔ اب آپ ہی فرمایئے کہ سقراط کو سقراط تعلیم و تربیت نے بنایا یا اس کی خداداد ذہانت و فراست نے؟

نیوٹن، جینر، ڈارون، لوئی پاسچر، گراہم بیل، مارکونی، ایڈیسن، آئن اسٹائن اور ڈاکٹر

عبدالسلام ایسے لوگ جنھوں نے اپنے اپنے دائرہ کار میں عظیم ترین کارنامے انجام دیئے ہیں وہ اس دعوے کا ثبوت ہیں کہ لیڈر پیدا ہوتے ہیں بنائے نہیں جاتے۔

جناب والا!

جون آف آرک جس نے پندرھویں صدی میں کچھ عرصے کے لیے فرانس کی تقدیر بدل دی اور انگریزی افواج کو پے در پے شکستیں دیں۔ اسے آپ کامیاب لیڈر نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے۔

ایک غریب کسان کی یہ ان پڑھ بیٹی جو فرانس کی آن پر قربان ہو گئی۔ اس نے کس مدرسے میں تربیت پائی تھی۔ اسے کون سا سازگار ماحول ملا تھا۔

جناب والا!

امریکہ کا پہلا صدر، جارج واشنگٹن جو بہت کامیاب جرنیل بھی تھا کیا یہ واقعہ نہیں کہ وہ ایک غریب زمیندار کے گھر پیدا ہوا تھا؟ اور کیا یہ حقیقت نہیں کہ ابراہیم لنکن ایک ان پڑھ ترکھان کا بیٹا تھا۔ آخر وہ ۱۸۶۰ء میں امریکہ کا اتنا کامیاب صدر بنا تو کیوں بنا؟

جناب والا!

انیسویں صدی میں نپولین نے بڑا نام پایا۔ ۱۷۶۹ء میں کارسیکا کے جزیرے میں ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہونے والا یہ نپولین ۱۷۹۲ء میں آرٹلری کا ایک معمولی کیپٹن تھا ۱۸۰۴ء میں فرانس کا شہنشاہ کیسے بنا؟ اسی طرح ترکی کے ایک گمنام، لکڑی کے تاجر علی رضا کا بیٹا مصطفٰے ۱۹۲۲ء میں مصطفٰے کمال اتاترک کیوں اور کیسے بنا؟

جناب والا!

اس لیے اور صرف اس لیے کہ لیڈر پیدا ہوتے ہیں بنائے نہیں جاتے۔

شکریہ!

انسان تقدیر کے ہاتھوں میں کھلونا ہے (اتفاق)

جناب والا!

زیر بحث موضوع ہے۔ انسان تقدیر کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہے ، میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔

جناب والا!

کائنات کی بے کراں وسعتوں میں انسان کی حیثیت ہی کیا ہے کبھی آپ نے اندھیری راتوں میں تاروں بھرے آسمان پر نظر ڈالی ہے۔ان لاکھوں کروڑوں، اربوں سیاروں کے ریگستان میں ہماری زمین کی کیا حیثیت ہے ایک ناچیز ذرہ اور بس، اور اس پر بھی انسان کا کتنا بس چلتا ہے اس کا حال معلوم کرنے کے لیے مصر کے ریگزاروں میں اہرام کو دیکھئے ان مغرور فرعونوں کا حشر دیکھئے جو تقدیر کو شکست دینا چاہتے تھے، آج دیو ہیکل پتھر کے اہرام تو باقی ہیں لیکن لازوال ہونے کے دعویدار انسان خاک ہو چکے ہیں ان کے تاجوں کے موتی کب کے لوٹے جا چکے۔ باہیبت و باجبروت شہنشاہوں کے سروں کی کھوپڑیاں دجلہ وفرات کے کنارے اپنی بیکسی کا ماتم کرتی ہیں۔ بابل اور نینوا کے شہر اپنے دور کی تہذیبوں کے آفتاب تھے۔ آج ان کے کھنڈروں کو بھی ڈھونڈنا پڑتا ہے جو زبان حال سے کہتے ہیں۔

دیکھو ہمیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

بادشاہوں کے بادشاہ دارائے اعظم کی شان وشوکت کا طلسم سکندر نے توڑا اور سکندر کا غرور تقدیر کے ہاتھوں کی ایک ہلکی سی جنبش نے۔

یونان کی شمعیں بجھ گئیں۔ ایران کے آتشکدے سرد پڑ گئے فردوسی کے ممدوح مٹ گئے۔ ہارون رشید کا بغداد لٹ گیا۔ اندلس کا سازچمن ٹوٹ گیا۔ کیسی کیسی تہذیبیں بے نشان ہو گئیں۔ کیسے کیسے نفیس تمدن خاک میں مل گئے۔ وسط ایشیا کے میدانوں سے جو چنگ جو

اٹھے تھے۔ انہوں نے کیا کیا طوفان نہ اٹھائے۔ لیکن ان بلا خیز چٹانوں کے جاہ و جلال کی کمند ٹوٹی تو کہاں ٹوٹی۔

کبھی آپ نے شالیمار کی ویرانیوں کی کہانی سنی ہے۔ کبھی شاہی قلعہ کی سسکیوں پر کان لگائے ہیں۔ کبھی نورجہاں کے مقبرہ کی بے کسی دیکھی ہے؟ وہ نورجہاں جو جہان نور تھی اس کی ہڈیوں کی بے حرمتی کی داستان تاریخ کے اوراق میں پڑھی ہے؟ تو پھر انسان تقدیر کے ہاتھوں کھلونا نہیں تو کیا ہے؟

انسان تقدیر کے ہاتھوں میں کھلونا ہے (اختلاف)

جناب صدر!

انسان کو تقدیر کے ہاتھوں کھلونا کہنا انسانیت کی توہین ہے، انسان کے اشرف و افضل ہونے کی شہادت خود قرآن حکیم دیتا ہے۔ پھر جو اشرف و افضل ہے وہ ایک کھلونا یعنی مجبور و لاچار کیسے ہو سکتا ہے؟ مجبور

انسان نے چاند ستاروں پر کمندیں ڈالی ہیں۔ انسان نے پہاڑوں کے جگر چیرے ہیں سمندروں کی تہیں کھنگالی ہیں۔ ایٹم کو دو نیم کیا ہے۔ جس نے یہ عظیم کارنامے انجام دیئے ہیں اسے تقدیر کے ہاتھوں کھلونا کیسے کہا جا سکتا ہے؟

جناب والا!

تہذیب کی کہانی اسرار فطرت پر فتح پانے کی کہانی ہے۔ قدرت نے مٹی پیدا کی انسان نے پیالہ بنایا۔ قدرت نے رات بنائی۔ انسان نے چراغ بنایا۔ قدرت نے دریاؤں کو رواں کیا انسان نے ان سے توانائی پیدا کی۔ قدرت نے اپنے خزانوں کو سمندر کی گہرائیوں میں چھپایا۔ انسان نے اپنی فہم و فراست سے ان خزانوں کو اپنی مٹھی میں بند کیا۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں جب خلاباز خلاؤں میں مصروف تگ و تاز

ہیں۔ جب انسان ان جہانوں پہ کمندیں ڈال رہا ہے۔ جو ستاروں سے آگے ہیں۔ جب چاند کی مٹی کب کی انسان کے پیروں تلے آ چکی۔ جب مہلک ترین بیماریوں کے تیر بہدف علاج دریافت ہو چکے۔ جب فاصلے سمٹ چکے۔ اس وقت جب الف لیلہ کے افسانے حقیقت بن چکے۔ جب ہر کس وناکس اللہ دین کا چراغ لیے بیٹھا ہے۔ اس دور میں اس زمانے میں انسان کو تقدیر کے ہاتھوں کھلونا کہنا غلط ہے اور سراسر غلط ہے۔ شکریہ

ہمیں ذہین افراد کے بجائے باکردار افراد کی ضرورت ہے

(اتفاق)

جناب والا!

قرارداد میں بجائے کے لفظ سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ جیسے ذہانت اور کردار ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ذہانت کو رد کر کے صرف کردار کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ قرارداد کا اصل مفہوم یہ نہیں۔

قرارداد میں بجائے کا لفظ ضرورت کی شدت کو ظاہر کرتا ہے جیسے جو آدمی پیاس سے مر رہا ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ اسے روٹی کی بجائے ایک بوند پانی کی ضرورت ہے یا اس آدمی کے بارے میں جو شدید بیماری میں مبتلا ہو۔ ڈاکٹر کہتا ہے۔ اسے کھانے کے بجائے دوا کی ضرورت ہے یہ کہنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ صرف پانی یا دوا چاہیئے، غذا یا دوسری ضروری چیزیں بیکار ہیں۔ اسی طرح جب میں یہ کہتا ہوں کہ ہمیں ذہین لوگوں کے بجائے باکردار لوگوں کی ضرورت ہے تو میں صرف اس یقین کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ پاکستان کے موجودہ حالات کے پس منظر میں خاص طور پر، زندگی کے ہر شعبے میں، ہر گوشے میں ہمیں ہر چیز سے زیادہ، ذہانت، دولت علم سے بھی نسبتاً زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ بلند کرداری ہے، عزت نفس ہے، شرافت ہے، اصول پرستی ہے۔ قدروں کا احساس ہے۔ ایک مشہور مفکر کا قول ہے کہ علم کی کمی خلوص سے پوری ہو جاتی ہے، لیکن خلوص یا کردار کی کمی کسی چیز سے پوری نہیں ہوتی۔ قرآن حکیم

کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ برتری کا معیار نہ ذہانت ہے، نہ علم، نہ زبان، نہ دولت، نہ نسل، بلکہ تقوای ہے اور تقوے کا تعلق کردار سے ہے، اخلاق سے ہے، قدروں سے ہے رویّوں سے ہے۔ جناب والا!

اس سلسلے میں اقبال کا خیال بھی یہی ہے۔

نگہ بلند، سخن دلنواز، جان پُرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کیلئے

نظم مسجد قرطبہ میں اقبال نے مومن کی صفات یہ بیان کی ہیں۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا و کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

اقبال نے طارق کی دعا میں مسلمان کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں بھی خبر، نظر اور اذانِ سحر کو لازم و ملزوم قرار دیا گیا ہے۔ ذہانت چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے۔

جناب والا!

ذہانت دودھاری تلوار ہے۔ اگر اسے اخلاقی قدروں کی رہنمائی میسّر نہ ہو تو ذہانت سے بالآخر فرد کو بھی نقصان ہے اور قوم کو بھی۔

جناب والا! اس وقت پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ قومی زندگی کے ہر میدان میں

ہر سطح پر بھی باکرداری کی کمی ہے۔ ہمارے پاس وسائل بھی ہیں، ذہانت بھی ہے علم بھی ہے، تجربہ بھی ہے، لیکن ان سب چیزوں سے صحیح کام لینے کے لیے جس کردار جس خلوص، جس لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی کا تقریباً فقدان ہے۔ مٹی تو بڑی زرخیز ہے لیکن نم نہیں ہے۔ بے معرکہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں۔ ہم اسی ذوق نگ وناز سے محروم ہیں۔ ہمارا ہنر ضرب کلیمی نہیں رکھتا۔

جناب والا!

تخلیق پاکستان کی جدوجہد جذبے کے سہارے جیتی گئی۔ آزادی کے چراغ قربانی اور ایثار سے روشن کیے گئے۔ خود قائداعظمؒ کی زندگی اس حقیقت کی شاہد ہے کہ ان کا سب سے بڑا ہتھیار ان کا عظیم کردار تھا، محنت، دیانت اور قومی خدمت جس کے عناصر ترکیبی تھے، آج ہمیں ایک نہیں ہزاروں لاکھوں جناحوں کی ضرورت ہے۔ جو پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلام کی تجربہ گاہ بنا سکیں، جو ان عظیم مقاصد کو بروئے کار لا سکیں جن کیلئے پاکستان بنایا گیا تھا۔

جناب والا!

میں اپنی تقریر ان اشعار پر ختم کرتا ہوں۔

الٰہی ہمیں ایسے انسان عطا کر دیانت، شرافت، محبت کے پیکر
صداقت، عزیمت، شجاعت کے پیکر
خود آگاہ بے باک، بیدار انسان نہ تن کی محبت نہ دھن کی محبت
دلوں میں فقط ہو وطن کی محبت
الٰہی ہمیں ایسے انسان عطا کر

ہمیں ذہین افراد کی بجائے باکردار افراد کی ضرورت ہے

صدر گرامی قدر! (اختلاف)

فاضل مقرر نے جس طرح موضوع کو توڑ مروڑ کر اس کی تائید کی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرارداد معقول نہیں۔ قرارداد میں بجائے کا لفظ بہت اہم ہے وہی بحث کے رُخ کا تعین کرتا ہے۔ اگر موضوع یہ ہوتا کہ ہمیں ذہین اور باکردار افراد کی ضرورت ہے تو میں یقیناً اس کی حمایت میں بولتا۔ اگر موضوع یہ ہوتا کہ ہمیں ذہین افراد سے زیادہ باکردار افراد کی ضرورت ہے تو بھی میں اس کی حمایت کرتا۔ لیکن موجودہ صورت میں قرارداد کی حمایت نہیں کر سکتا۔

جناب صدر!

کیا یہ ضروری ہے کہ کردار اور ذہانت کو ایک دوسرے سے ٹکرایا جائے۔ ذہین افراد بھی باکردار ہو سکتے ہیں اور باکردار افراد بھی ذہین ہو سکتے ہیں۔ ذہانت اور کردار میں کوئی ازلی دشمنی نہیں۔ اصل میں دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ذہانت بغیر کردار کے نقصان دہ ہے اور خالی خالی کردار بغیر ذہانت کے غیر موثر رہتا ہے۔

اس لیے جناب والا! یہ کہنا کہ ہمیں ذہین افراد کے بجائے باکردار افراد کی ضرورت ہے ذہانت کی کمی کا ثبوت ہے۔

جناب صدر!

فاضل مقرر نے اقبال سے استدلال کیا ہے۔ یہاں بھی انہوں نے ٹھوکر کھائی اقبال نے خبر اور نظر کو مربوط کیا انہیں ایک دوسرے کی ضد نہیں کہا۔ مومن کی شان ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ خبر میں بھی یکتا ہوتا ہے نظر اور اذانِ سحر میں بھی۔ اقبال کے دوسرے شعر میں بھی سخن دلنواز اور جان پرسوز سے پہلے نگہ بلند کا تذکرہ ہے جو اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ نگاہ کی بلندی، شعور کی چمک یا ذہانت کی روشنی بھی میر کارواں کے رختِ سفر کا صرف ضروری بلکہ پہلا جزو ہے

فاضل مقرر نے اپنے دعوے کی تائید میں مسجد قرطبہ سے اقبال کے اشعار نقل کیے ہیں لیکن وہ اس بند کا آخری شعر نقل کرنا کیوں بھول گئے جس میں مومن کے بارے میں کہا گیا ہے۔

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

جناب صدر!

فاضل مقرر نے تحریک پاکستان میں قائداعظمؒ کے عظیم کردار کا تذکرہ بھی کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس مثال میں انہوں نے قائداعظمؒ کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ قائداعظمؒ کی کامیابی کا راز ان کے غیر معمولی کردار میں ضرور مضمر تھا۔ ان کی دیانت بے مثال ضرور تھی۔ لیکن دیانت کے ساتھ ان کی فراست کا حصہ بھی کم نہیں تھا۔ مسلمانوں میں صرف کردار کے دھنی لیڈروں کی کمی نہیں تھی۔ بڑے بڑے مخلص، بڑے بڑے ایثار پیشہ درویش صفت لیڈر پڑے تھے جو باکرداری میں قائداعظمؒ سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تھے، لیکن دیانت کے ساتھ ساتھ فراست میں قائداعظمؒ کا کوئی حریف نہیں تھا۔ اسی فراست سے انہوں نے ہندوؤں اور انگریزوں کی دودھاری تلوار کا کاٹ کیا۔ اسی فراست کی روشنی میں انہوں نے تحریک پاکستان کی تکمیل کی طرف رہنمائی کی۔

اس لیے جناب صدر، قرارداد کا دعویٰ کہ ہمیں ذہین افراد کے بجائے باکردار افراد کی ضرورت ہے۔ حقیقت کا ادھورا اظہار ہے اس لیے میں قرارداد کو مسترد کرتا ہوں۔

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نور بصیرت عام کر دے

قلم تیز چلتا ہے تلوار سے

جناب والا!

انسانی ترقی کی تاریخ قلم یعنی علم کی ترقی کی تاریخ ہے۔ جدید تہذیب کی تاریخ یونان کے سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے فلسفیوں اور سائنس دانوں سے شروع ہوتی ہے۔ یونانیوں کا سیاسی عروج بھی ان کی ذہنی ترقیوں کا رہین منت تھا۔ سکندر اعظم ارسطو کا شاگرد رہ چکا تھا۔ یونانی شمعوں سے رومیوں نے اپنے چراغ روشن کیے۔ اور جب رومیوں پر زوال آیا تو اس کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ انہوں نے تلوار کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینی شروع کر دی تھی۔ گبن نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف

میں سلطنت روما کے زوال کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رومیوں نے تعلیم اپنے غلاموں کے سپرد کر دی تھی۔ رومن امراء کے لڑکے صبح جن غلام استادوں سے پڑھتے تھے شام کو وہ ان کی خدمت کے لیے دست بستہ کھڑے رہتے تھے۔ جو قوم علم یا معلم کو ذلیل کرتی ہے وہ خود ذلیل ہو جاتی ہے۔ رومیوں کا بھی یہی حشر ہوا۔

یونانیوں اور رومیوں کے بعد تہذیبی کارواں کو مسلمانوں نے اپنے خون جگر سے آگے بڑھایا اور تقریباً ایک ہزار سال ۱۴۹۲ء میں سقوط قسطنطنیہ تک مسلمان سائنسدانوں اور فلسفیوں نے علم کے چراغوں کو روشن رکھا۔ مسلمانوں کے عروج کا زمانہ ان کے علمی عروج کا زمانہ ہے۔ جب انہوں نے قلم کو چھوڑا تو تلوار بھی کند پڑ گئی۔ اندلس سے ابو عبداللہ کے ذلت آمیز اخراج کے پس منظر میں مسلمانوں کا علمی زوال تھا۔ اٹھارویں صدی میں انگریزوں نے بکسر، پلاسی اور بنگلور کی لڑائیوں میں جو کامیابیاں حاصل کیں ان کے پیچھے انگلستان کے صنعتی انقلاب اور علمی برتری کی قوت تھی۔ ورنہ ذاتی بہادری میں ٹیپو اور سراج الدولہ کسی سے کم نہ تھے۔

جناب والا! آج بھی قلم تلوار سے تیز چل رہا ہے۔ ہر ترقی کے پیچھے ذہنی ترقی ہوتی

ہے۔جاپان اور جرمنی جیسے ترقی یافتہ ملکوں کی اقتصادی، سیاسی اور فوجی قوت اور برتری کا راز جدید ٹیکنالوجی میں ان کی فتوحات سے ہے۔آج کی جنگ بھی لیبارٹریوں میں لڑی جاتی ہے۔اقبال نے کہا ہے۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

ظاہر ہے ستاروں پر کمند ڈالنا بغیر قلم یا علم، یا ٹیکنالوجی یا سائنس کے ممکن نہیں اس لیے قلم یا علم یا روشنی ہی سب کچھ ہے۔

آخر میں، میں حضرت قائداعظمؒ کے ایک قول کا حوالہ دوں گا۔

۳ جولائی ۱۹۴۳ء کو بلوچستان مسلم لیگ کے جلسے کے موقع پر جب بلوچستان کے طلبا نے قائداعظم کی خدمت میں تلوار کا روایتی تحفہ پیش کیا تو قائداعظمؒ نے جواباً فرمایا:

یہ تلوار جو آپ نے مجھے عنایت کی ہے صرف اپنی حفاظت کے لیے اٹھے گی۔لیکن فی الحال آپ کے لیے جو سب سے ضروری امر ہے وہ تعلیم ہے۔علم تلوار سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے چاہیئے اور علم حاصل کیجیے۔" شکریہ

تلوار قلم سے اہم تر ہے

جناب والا،

مجھے قرارداد سے قطعاً اتفاق نہیں، میرا مؤقف یہ ہے کہ قلم اہم تو ہے لیکن اہم تر نہیں قرارداد کے دو لفظ، قلم اور تلوار غور طلب ہیں۔تلوار طاقت اور تگ ودو کی علامت ہے اور قلم علم و دانش کی۔

جناب والا۔

مجھے اس امر سے انکار نہیں کہ قلم قوموں کی زندگی میں اہمیت رکھتا ہے۔لیکن تلوار کی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں۔

جناب والا۔

دنیا میں خیر بھی ہے، اور شر بھی، حق بھی اور باطل بھی۔ اور اس خیر و شر کی کشمکش میں رزم و حق باطل میں تلوار اکثر فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ قلم نے فنکاروں، شاعروں کے فن اور دانشوروں کے علم نے اکثر شر کا ساتھ دیا ہے۔ ملوکیت و آمریت کی تائید و تصدیق کی ہے۔ ان کے سیاہ کو سفید کر کے دکھایا ہے اس لیے قلم یا علم کو سراسر باعث خیر کہنا تاریخ کی شہادت کو جھٹلانا ہے۔ اس کے برعکس تلوار نے اکثر قلم کی حفاظت کی ہے۔

جناب والا،

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی　　یہ خاکی اپنی فطرت میں نوری ہے نہ ناری ہے

علم کی اہمیت اپنی جگہ لیکن آخری فیصلہ عمل کی قوت سے ہی ہوتا ہے۔ تلوار ہی سے ہوتا ہے اقبال نے اپنی فارسی کتاب جاوید نامہ میں شرف النسا کے محل کے ذکر میں لکھا ہے کہ اگر قرآن نہ ہو تو انسان تلوار کا صحیح استعمال نہیں کر سکتا، اور اگر تلوار نہ ہو تو قرآن کے دشمنوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

علامہ ہی نے بال جبریل میں کہا ہے:

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد　　　　شکریہ

خواتین کے لیے فوجی تربیت لازمی ہونی چاہیئے

صدر گرامی　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　الف

موضوع زیر بحث کی حمایت میں، میں اپنے دلائل پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

جناب والا!

پہلی بات تو یہ کہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ آج بھی لڑکیوں کے کالجوں میں لڑکیوں کی ایک محدود تعداد کو فوجی تربیت دی جاتی ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ لڑکیوں کو ابتدائی فوجی

تربیت دینے کی اہمیت اور ضرورت تسلیم کر لی گئی ہے۔ موضوع کے حق میں، میری پہلی دلیل یہ ہے کہ جس اصول کے تحت لڑکیوں کو محدود پیمانے پر فوجی تربیت دی جاتی ہے اسی اصول اور ضرورت کے تحت اس تربیت کے دائرہ کو بڑھایا بھی جا سکتا ہے۔

جناب والا

وہ فوجی تربیت جو اب اختیاری اور محدود ہے اس کو سب کے لیے لازمی کرنے کی ضرورت اس لیے ہے کہ ہم دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ انڈیا ہمارا ازلی دشمن ہے وہ کسی وقت بھی جارحیت کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ آج کی جنگ ٹوٹل جنگ ہوتی ہے۔ اس میں فوجی اور غیر فوجی مرد اور عورت کی تفریق نہیں ہوتی۔ سب کو حتیٰ کہ بچوں اور بوڑھوں کو بھی جنگی تگ و تاز میں اپنا کردار ادا کرنا پڑتا ہے۔

جناب والا!

ہمارے کئی اہم شہر بالکل بارڈر پر واقع ہیں۔ اگر کبھی جنگ زیادہ پھیل جائے یا ہوائی حملے بڑھ جائیں تو عورتوں کو بھی میدان میں اترنا پڑے گا۔ اور محاذ جنگ کے پیچھے سول ڈیفنس کی بہت اہم خدمات انجام دینا ہوں گی۔

جناب والا!

موضوع کے حق میں، میری تیسری دلیل یہ ہے کہ فوجی تربیت حاصل کرنے سے قومی امور میں، خاص طور سے ملک کے دفاع سے متعلق اور ان کی دلچسپی بڑھے گی۔ اس کا تعمیری اثر سیاست پر تو گھر پر اور بچوں میں پڑے گا۔ دوسرے یہ کہ فوجی ڈسپلن کا تجربہ حاصل کرنے سے ان کی زندگی میں ڈسپلن کی کارفرمائی ہوگی اور وہ بہتر مائیں ثابت ہوں گی۔

جناب والا!

جنگ ہو یا زمانہ امن، ہر وقت فوجی تربیت خواتین کے کام آئے گی۔

شکریہ

خواتین کے لیے فوجی تربیت لازمی ہونی چاہیئے

۱۵/۱۱/۸۴ ع

جناب والا!

موضوع زیر بحث کچھ مبہم ہے۔ اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ کس ملک کی خواتین کا تذکرہ ہے۔ شاید فلسطینی خواتین کے لیے جو اپنے مردوں کے شانہ بہ شانہ آزادی کی جنگ لڑ رہی ہیں یہ تجویز معقول ہو۔ لیکن پاکستانی کی صورت حال کے حوالے سے یہ تجویز سراسر دور از کار بلکہ محال ہے پاکستان اور تیسری دنیا کے دوسرے ممالک جو اکثر آبادی کی کثرت کے مسئلہ سے دوچار ہیں وہاں تو مردوں کے لیے بھی لازمی فوجی تربیت، اور لازمی فوجی سروس ممکن نہیں چہ جائیکہ وہاں کی عورتوں کے بارے میں ایسا سوچا جائے۔

جناب والا!

لازمی فوجی تربیت اور محدود مدت کے لیے لازمی فوجی سروس آبادی کے لحاظ سے چھوٹے صنعتی ملکوں کا مسئلہ ہے۔ جو اپنی محدود لیکن کارکردگی کے لحاظ سے موثر افرادی قوت کو فوج کی ملازمت ایسے غیر پیداواری کام میں لگانا نہیں چاہتے۔ اور وہاں کے بیشتر لوگ بھی پروفیشنل ملازمتوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ صنعتی ملکوں اور اسرائیل ایسی چھوٹی ریاستوں کی صورتحال کا تقاضا ہے کہ وہاں مردوں کے لیے فوجی تربیت لازمی کر دی جائے۔ تاکہ پیداوار بھی جاری رہے اور کام بھی نکل جائے۔ لیکن عورتوں کے لیے لازمی فوجی تربیت اور فوجی ملازمت دنیا کے کسی ملک میں رائج نہیں۔ اور نہ یہ عملی طور پر ممکن ہے۔ اس لیے پاکستان میں قومی اور مذہبی تناظر میں عورتوں کے لیے لازمی فوجی تربیت کے بارے میں سوچنا ایک فینٹیسی سے کم نہیں۔

جناب والا!

میں تو مردوں کے لیے بھی لازمی فوجی تربیت کے حق میں نہیں ہوں۔ پاکستان میں تعلیم کی شرح اور معیار پہلے سے بہت کم ہے۔ اگر اسکولوں اور کالجوں میں ملٹری ٹریننگ

عام اور لازمی کردی جائے تو اس کارروائی سے نہ صرف سرکاری خزانے پر ناقابل برداشت بوجھ پڑے گا۔ بلکہ فوجی ٹریننگ سے زیرتربیت طلبا کی تعلیم بھی متاثر ہوگی۔ فوجی ٹریننگ وقت آنے پر مکمل طریقے سے فوجی اکیڈمی میں حاصل کی ہی جاسکتی ہے۔

جناب والا!

ہماری خواتین کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ وہ قوم کے نونہالوں کی تربیت صحیح طریقے سے کرتی رہیں اور قومی زندگی کے جس جس شعبے میں ان کی ضرورت ہو وہاں اپنی قابلیت کے جوہر دکھائیں۔ جو مائیں عزیز بھٹی۔ اکرم، راشد منہاس، طفیل اور سرور پیدا کرتی ہیں انہیں ساری قوم سلام کرتی ہے جن ماؤں کی گودیں کل کے غازی اور شہید کھیلتے ہیں انہیں کسی فوجی تربیت کی ضرورت نہیں۔ آب حیات میں پانی کے دو قطرے ملانے سے کیا حاصل۔ شکریہ

روح کی زنجیر ہے فکر معاش

جناب والا!

حزب اقتدار کا مفروضہ یہ ہے کہ روح دین ہے اور فکر معاش دنیا۔ روح کی آبیاری عبادت ہے اور فکر معاش مادی چیز ہے۔ اس لیے روحانی ترقی کی ضد ہے جناب والا میں اسی نکتہ پر ذرا کھل کر بحث کرنا چاہتا ہوں۔

یہ دین ہے وہ دنیا ہے۔ یہ روحانی ترقی ہے وہ مادی ترقی۔ اگر یہ ہے تو وہ نہیں اور وہ ہے تو یہ نہیں۔ یہ خیال ہی غلط ہے اسلام میں دین اور دنیا میں تضاد نہیں۔ اقبال نے صحیح فرمایا تھا کہ منزل، کبریا است بیشک۔ انسان کی منزل خدا ہے۔ لیکن اس منزل کا راستہ کیا ہے؟ راستہ یہی مادی زندگی ہے۔ انسان کو مادی زندگی دی گئی ہے۔ اسے ذہن سے نوازا گیا ہے۔ اسے جبلی قوتیں دی گئی ہیں۔ اسی راستے سے تو اسے آگے بڑھنا ہے۔

فرشتہ سے بڑھ کر ہے انسان بننا

کیوں؟ اس لیے کہ انسان ایک مادی چیز ہے۔ اس کے ساتھ فکر معاش ہے۔ فکر معاشرت ہے۔ فکر جبلت ہے۔ اس کے سامنے رحمان ہے۔ رب ذوالجلال والاکرام کی نشانیاں ہیں تو اس کے ساتھ شیطان بھی ہے "شر" بھی ہے۔ اگر شر نہ ہو یا اگر معاش کی جدوجہد نہ ہو اگر انسانی خواہشوں سے جہاد نہ ہو تو روحانی ارتقاء کیسے ہو؟

جناب والا،

حزب اختلاف کا نقطہ نظر وہ معلوم ہوتا ہے جو مہاتما بدھ کا تھا۔ وہ فکر معاش کو روحانیت کے منافی سمجھتے تھے۔ تب ہی تو دنیا کو چھوڑ کر رہبانیت کی زندگی اختیار کر لی۔ یہی رہبانیت قدیم عیسائیوں کا مسلک رہی۔ لیکن جناب والا۔ لا رہبانیۃ فی الدین، ہمارے دین میں رہبانیت نہیں ہے۔ فکر معاش ہو یا فکر معاشرت، فکر تعلیم ہو یا فکر تربیت یہ سب راستے روحانی ترقی کی طرف جاتے ہیں۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے ۔۔۔ اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

شکریہ

چاند کی فتح

جناب والا!

۲۱ جولائی ۱۹۶۹ء کی صبح کو جب نیل آرمسٹرانگ نے پہلا انسانی قدم چاند کی اچھوتی سرزمین پر رکھا تو یہ صرف آرمسٹرانگ کا قدم نہیں تھا بلکہ ترقی کی طرف پوری انسانیت کا قدم تھا۔ انسانی تاریخ میں یہ دن سدا یاد رہے گا۔ اس دن انسان کا صدیوں کا خواب پورا ہوا اس روز انسان کی عظمت کا ایک نیا چراغ جلا۔ اس روز یہ ثابت ہو گیا کہ انسان ستاروں پر بھی کمند ڈال سکتا ہے۔ اقبال نے کہا تھا:

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں

ایک شاعر کے تصور کو سائنسدانوں نے سچ کر دکھایا۔

جناب والا،

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خلائی پروازیں بیکار ہیں کیونکہ ان سے زمینی مسائل حل نہیں ہوئے ہیں یہ مانتا ہوں کہ اس دنیا میں بہت سے مسائل ہیں جو ہماری توجہ چاہتے ہیں مثلاً غریبی کا مسئلہ ہے۔ بھوک جہالت اور امن قائم کرنے کے مسئلے ہیں۔ مگر یہ مسئلے آج کے تو نہیں صدیوں کے ہیں اور صدیوں تک رہیں گے اور جوں جوں انسان ترقی کرتا جاتا ہے۔ اسی نسبت سے وہ نت نئے مسائل سے دوچار ہوتا جاتا ہے۔ چاند کی فتح اصل میں سائنسی ترقی کی طرف ایک بہت بڑا قدم ہے اس سے براہِ راست انسان کے علم اور سائنس میں اضافہ ہوگا۔ اور بالواسطہ طور پر دنیا کو دوسرے مسائل حل کرنے میں مدد ملے گی۔

جناب والا!

جب ایٹم کو چیرا گیا تھا تو بھی یہی سوال اٹھا تھا دنیا نے دیکھ لیا کہ خود ایٹم ہی جنگ کو روکنے کا ایک ذریعہ بن گیا۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ خلائی پروازوں سے زندگی کے بہت سے مسائل کو حل کرنے میں مدد ملے گی۔ اور مل رہی ہے۔

جناب والا!

اب تو چاند کی فتح بہت پرانی بات ہو چکی ہے ان دنوں مریخ انسانی تگ و دو کی زد میں ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

اقبال نے سچ ہی کہا تھا:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

شکریہ

جھا نکنے

انسانیت کا مستقبل روشن ہے

صدر محترم!

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس وقت ہماری دنیا ایک نہایت خوفناک اور پریشان کن صورتحال سے گزر رہی ہے۔ جنگ جہالت اور بیماریوں کا دور دورہ ہے۔ بظاہر جدھر دیکھیے تاریکی اور مایوسی بڑھ رہی ہے۔ حزب اختلاف کے معزز ارکان اسی ظاہری صورت حال سے غلط نتائج اخذ کر رہے ہیں۔ وہ ظاہر کی تہہ میں جھانکنے کی کوشش نہیں کر رہے۔ وہ یہ بھول گئے ہیں کہ رات کی ظلمتوں کے سینے ہی سے سورج کی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ خون صد ہزار انجم کے بعد ہی سحر پیدا ہوتی ہے۔

صدر گرامی! ہم جانتے ہیں کہ اس وقت دنیا مہلک ہتھیاروں کی دوڑ میں گرفتار ہے جیسے ہم سب فنا ہونے کے لیے بے چین ہوں لیکن اس کے باوجود ایک ایسی روشن حقیقت ہمارے سامنے ہے جو ہمیں مایوس نہیں ہونے دیتی۔ ایٹم بم بنایا گیا۔ ۱۹۴۵ء میں جاپان پر پھینکا گیا اور ایسی تباہی دیکھی گئی جو اس سے پہلے تصور میں نہیں آسکی تھی۔ آج اس لرزہ خیز واقعے کو چالیس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اس دوران میگاٹن بم ہائیڈروجن بم اور نیوٹرون بم جیسے ہیبت ناک ہتھیار تخلیق کیے جا چکے ہیں جو ہلاکت خیزی اور تباہ کاری میں ہیروشیما والے بم سے ہزاروں گنا زیادہ طاقتور ہیں۔ لیکن غور فرمایئے کیا ۱۹۴۵ء کے بعد سے آج تک کوئی ایٹم بم دنیا کے کسی گوشے میں، کسی خطۂ زمین پر گرانے کی غلطی کی گئی۔ اگر نہیں! تو پھر کیا آپ یہ نتیجہ نہیں نکالتے کہ انسان کی بصیرت نے، اس کی سوجھ بوجھ نے اسے فنا اور مکمل تباہی سے محفوظ رکھا ہے۔ میں یہ عرض کروں گا کہ انسان کے اندر اپنے تحفظ کی جبلت بڑی مضبوط ہے۔ وہ بقا چاہتا ہے۔ فنا نہیں۔ وہ تعمیر چاہتا ہے تخریب نہیں وہ ترقی چاہتا ہے۔ زوال نہیں۔ وہ روشنی کا طالب ہے اندھیروں کا نہیں۔ اس نے مہلک ہتھیاروں

کے ساتھ ساتھ بھی بے شمار کام کیے ہیں۔ وہ ایک روشن مستقبل کی طرف رواں دواں ہے اور انشاءاللہ بالآخر بقا کا جذبہ غالب آئے گا۔

جناب صدر! ہم حزب اختلاف کے اس نکتے کو تسلیم کرتے ہیں کہ کمزور اقوام سامراجی طاقتوں کی سیاسی غلامی سے تو آزاد ہو گئیں لیکن معاشی غلامی کا اب تک شکار ہیں۔ ابھی تک ان کی ذہنی غلامی پر مجبور ہیں لیکن اس نکتے سے آگے بڑھ کر یہ بھی تو دیکھیں کہ کمزور اقوام میں احساس زیاں اور شعور تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ وہ اب اپنی ہستی کو منوانے لگی ہیں۔ صنعت اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں قدم رکھ رہی ہیں۔ مشترک مسائل کا احساس انہیں اتحاد کی لڑی میں پرو رہا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ان کے مطالبات کے آگے بڑی طاقتوں کو سر تسلیم خم کرنا پڑیگا۔

صدر گرامی! انسانیت کے روشن مستقبل کے حق میں میری ایک دلیل یہ ہے کہ ہماری دنیا میں جو اس صدی کے اوائل میں جہالت اور تعلیمی پس ماندگی کا شکار تھی نہایت تیزی سے تعلیم کی روشنی پھیل رہی ہے۔ یونیسکو کے اعداد و شمار کے مطابق اس وقت دنیا کے تقریباً پچاس فیصدی انسان پڑھنا لکھنا سیکھ چکے ہیں یا سیکھ رہے ہیں۔ ایشیا اور افریقہ کے ان ملکوں میں بھی خواندگی کی مہم تیز کر دی گئی ہے جن کی شناخت ہی جہالت تھی۔ ان میں ٹیکنالوجی اپنا راستہ بنا رہی ہے۔ معدنیات اور تیل کے خزانے جو ان پسماندہ ملکوں کی زمین کے سینے میں پوشیدہ تھے رفتہ رفتہ آشکار ہو رہے ہوں۔ اور وہ وقت آنے والا ہے جب ہر محروم انسان کو ان میں سے حصہ ملے گا۔

صدر محترم!

اب ذرا ایک اور جانب نگاہ ڈالیے وہی جنوبی افریقہ جہاں کالوں کی اکثریت گوروں کے ظلم و استحصال کے سامنے مویشیوں کی طرح بے بس تھی۔ اب اس نے غلامی اور جبر و استحصال کے خلاف سر اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ آج جنوبی افریقہ کے مظلوم عوام ظالم سے اپنا حق چھیننے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ جہاں جہاں بھی غلام ہیں اب غلامی سے اکتا گئے ہیں۔ اور

زنجیریں توڑ رہے ہیں۔ ہر طرف زنداں قیدیوں کی تکبیروں سے کانپ رہے ہیں۔ ظالم گھبرائے ہوئے ہیں۔ مظلوموں کے سیلاب کے آگے بند باندھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر جب مظلوموں کا شعور جاگ اٹھے تو ان کے سیلاب کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ ان کا روشن مستقبل اب نظر کے سامنے ہے۔

ابھی چند سال پہلے تک اسلامی ملکوں کو کمزور سمجھ کر حقارت سے ٹھکرایا جا رہا تھا لیکن ایران کے جرأت مندانہ انقلاب اور افغانستان و فلسطین کے مجاہدوں کی کامیاب تگ و تاز نے ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان بھی ایک طاقت ہیں اور دنیا والوں کو ان کا لوہا ماننا پڑے گا۔ پاکستان اور دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی مشترک خطرات کا احساس ابھرا ہے۔ اس احساس نے ان کے اتحاد کے لیے زمین ہموار کر دی ہے۔ دوسری طرف ان میں اسلام کی اخلاقی قوت کا شعور بھی بیدار ہو رہا ہے۔ ایک فلاحی معاشرے کے قیام کا زبردست جذبہ ابھر رہا ہے۔ پورا عالم اسلام جو دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہے تیزی سے روشن مستقبل کی طرف گامزن ہے۔ وہ صداقت عدالت اور شجاعت کا سبق پھر دہرا رہے ہیں تاکہ دنیا کی امامت کے لائق بن سکیں۔ اگر ایک ملک میں بھی اسلامی اقدار پر مبنی معاشرہ قائم ہو جاتا ہے تو آس پاس کے ملک بھی اسلام کی طرف پر زور کشش محسوس کرتے ہیں۔ کیا آپ اس سے اتفاق نہیں کرتے کہ جیسے جیسے یہ دنیا اسلامی اقدار کو قبول کرے گی اس کا مستقبل روشن ہوتا جائے گا۔

صدر گرامی!

دینی جذبے کا فروغ اسلامی ملکوں تک ہی محدود نہیں عیسائی ممالک کو دیکھیے صدیوں سے انہوں نے اپنے دین اور اس کی روحانی و اخلاقی اقدار کو اپنی زندگی سے خارج کر رکھا تھا عدم تشدد کے بجائے تشدد جنگ پسندی اور ہلاکت خیزی ان کا مسلک بن چکا تھا۔ وہ روحانیت کو فراموش کر بیٹھے تھے۔ مادیت کے پجاری بن چکے تھے۔ لیکن اب مغرب کی عیسائی دنیا بھی مادیت کی اس تھکا دینے والی دوڑ سے بیزار ہو چکی ہے وہ محسوس کر رہی ہے کہ زندگی اگر

اسی راستے پر چلتی رہی تو انجام بہت بھیانک ہوگا۔ یورپ کے علاوہ کہیں بھی روحانیت اور اخلاق کی ضرورت کا احساس جاگ اٹھا ہے۔ وہاں بھی روحانیت کی سحر طلوع ہوتی نظر آرہی ہے۔ وقت آنے والا ہے جب ظلم، تشدد بربریت جہالت اور مادہ پرستی کے بادل چھٹ جائیں گے اور روشن مستقبل کا مسکراتا ہوا چہرہ سامنے آجائے گا۔

شکریہ

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن

سامعین والاقدر،

میری تقریر کا عنوان ہے:

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن

مسلمان کی زندگی کی ابتدا جہاد ہے اور انتہا شہادت۔ قرآن حکیم میں ہے۔

وجاھدوفی اللہ حق جھادہٖ۔ اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اس طرح جیساکہ جہاد کا حق ہے۔ جہاد کے اصل معنی کسی مقصد کے لیے جدوجہد کرنے کے ہیں۔ ہر مقصد کے لیے نہیں بلکہ کسی اعلیٰ اور برتر مقصد کے لیے جدوجہد کرنے کو جہاد کہا جاتا ہے۔ اور وہ اعلیٰ وارفع مقصد کیا ہو؟ اس کا جواب قرآن حکیم ہی ہمیں دیتا ہے یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان باتوں کو کرنا اور پھیلانا جن کا خدا نے حکم دیا ہے اور ان باتوں سے خود رکنا اور دوسروں کو روکنا جنہیں خدا نے منع کیا ہے۔

ہم طلبہ کے لیے امر بالمعروف یا جہاد کی ایک صورت یہ ہے کہ ہم جسمانی، ذہنی اخلاقی اور روحانی اعتبار سے ترقی کریں تاکہ بڑے ہوکر ہم پاکستان کی زمینی سرحدوں اور نظریاتی سرحدوں کا کامیاب تحفظ کرسکیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارا اسکول ہمیں مادی اخلاقی اور روحانی جہاد کے لیے تیار کررہا ہے۔

زندگی آزمائش بھی ہے اور انعام بھی، زندگی اپنے عظیم انعامات صرف ان دلیروں اور بہادروں کو پاش کرتی ہے جو آزمائش کی بھٹی سے تپ کر نکلے ہوں - یہ آزمائش کبھی زہر کا پیالہ بن جاتی ہے اور کبھی کربلا کا میدان - یہ سکول وہ تربیت گاہ ہے جہاں ہم اپنے آپ کو ہر آزمائش کے لیے تیار کر رہے ہیں -

ہمارا مقصد حنیف ہے کہ ہم پاک سرحدوں کے پاک اور پاک نظر محافظ بنیں اور وہ طوفان ہوں جن سے دریاؤں کے دل دہل جاتے ہیں - ہماری آرزو ہے کہ ہم اپنی ٹھوکر سے صحرا اور دریا کو دو نیم کرنا سیکھیں -

ہماری دعا ہے کہ ہمارے دلوں میں صرف ایک خوف ہو - اللہ کا خوف، ہمارے دلوں میں صرف امنگ ہو، اسلام کی صداقتوں پر جان سے شہادت دینے کی امنگ -

حاضرین گرامی قدر!

مسلمان کی زندگی کی ابتدا جہاد ہے اور انتہا شہادت -

انطونی کی تقریر

شیکسپیئر کے مشہور ڈرامہ جولیس سیزر میں بروٹس کے ہاتھوں سیزر کے قتل کے بعد سیزر کے ایک دوست سینیٹر مارک انطونی نے جو معرکۃ الآرا تقریر کی وہ اپنی تاثیر اور جوہر خطابت کے لحاظ سے دنیا کی بہترین تقریروں میں شمار ہوتی ہے۔ سیزر کے خون آلودہ تابوت کے سامنے کھڑے ہو کر انطونی اس طرح شروع ہوتا ہے۔

Friends, Romans, Countrymen, lend me your ears

دوستو! روم کے فرزندو! ہم وطنو! میں آپ کی سماعت کا طالب ہوں میں سیزر کو دفن کرنے آیا ہوں نہ کہ اس کی تعریف و توصیف کرنے آیا ہوں۔ انسانوں کی برائی ان کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ اور ان کی نیکی بسا اوقات ان کے ساتھ ہی دفن ہو جاتی ہے یہی حال سیزر کا ہے۔ عالی مرتبت بروٹس نے تمہیں بتایا ہے کہ سیزر حریص تھا۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ گناہ عظیم ہے اور سیزر کو اس کی شدید سزا مل چکی ہے۔ یہاں میں بروٹس کی اجازت سے جو مرد شریف ہے اور دوسروں کی اجازت سے کہ سب کے سب شریف ہیں۔ میں سیزر کے جنازے پر تقریر کرنے آیا ہوں۔ وہ میرا دوست تھا۔ وفا شعاری اور انصاف کا مجسمہ، لیکن بروٹس کہتا ہے کہ وہ حریص تھا اور بروٹس شریف آدمی ہے۔ سیزر ہزاروں قیدی روم لایا جن کے تاوان سے خزانہ معمور ہوا کیا یہ بات اس کے حریص ہونے کی گواہی دیتی ہے۔

صرف یہی نہیں جب بھی غریب روئے ہیں تو سیزر کی آنکھوں سے بھی سیلاب غم جاری ہوا ہے۔ حریص اور جاہ طلب شخص تو شقی القلب ہوتا ہے تاہم بروٹس کہتا ہے کہ وہ حریص تھا اور بروٹس شریف آدمی ہے۔

تم سب نے دیکھا تھا کہ میں نے بوپر کیلیا کی عید پر سیزر کو تین مرتبہ تاج شاہی پیش کیا

اور اس نے تینوں دفعہ ٹھکرا دیا۔ کیا حریص ہونا اس کو کہتے ہیں لیکن بروٹس کہتا ہے کہ وہ حریص تھا اور بروٹس شریف آدمی ہے۔ جو کچھ بروٹس نے کہا ہے میں اس کی تردید نہیں کرنا چاہتا میں تو صرف وہ بات کہہ رہا ہوں جس کا مجھے سو فی صد علم ہے۔ تم سب کبھی اس کے شیدائی تھے اور اس کی معقول وجہ بھی تھی۔ تو پھر وہ کون سی بات ہے جس کی وجہ سے تم اس کے ماتم میں شریک نہیں ہو؟ معاف کرنا مجھے اپنی طبیعت پر قابو نہیں رہا۔ میرا دل تابوت میں سیزر کے پاس ہے اور جب تک وہ لوٹ نہ آئے میں ذرا دم لینا چاہتا ہوں۔

حق نواز کیانی شہید ستارۂ جرأت

مہمان خصوصی اور سامعین گرامی۔

لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی شہید ستارۂ جرأت (دو بار) کا شمار اس ملک کے ہیروز میں ہوتا ہے۔ کشمیر کی دو جنگوں میں ان کے کارنامے پاکستان کی عسکری تاریخ میں سونے کے حروف میں لکھے جائیں گے۔

آج ۶ ستمبر یوم دفاع کے موقع پر میں پاکستان کے اس عظیم فرزند کی زندگی اور کارناموں پر کچھ روشنی ڈالنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

کرنل حق نواز کا نسلی تعلق گکھڑوں کے قدیم جنگجو قبیلے سے تھا۔ اسی نسلی نسبت سے وہ اپنے آپ کو کیانی لکھتے تھے۔ ان کا آبائی گاؤں مونہ ہے جو شہر جہلم سے پنڈی کی طرف چند میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ حق نواز کیانی ۱۰ جنوری ۱۹۲۶ء کو اسی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان

کے والد کا نام صوبیدار اللہ دتہ تھا۔

حق نواز کیانی ۱۹۳۹ء میں ملٹری کالج میں ساتویں درجے میں داخل ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں وہ کالج کے ہیڈ بوائے کے عہدے تک پہنچے۔ کالج کی تعلیم کے زمانے میں انہوں نے کھیلوں میں بڑا نام پیدا کیا۔ خاص طور پر ہاکی اور باکسنگ میں، وہ بہت کامیاب ہیڈ بوائے تھے۔ یہ فخر انہی کو حاصل ہے کہ انہوں نے ایک دن کمانڈانٹ کے طور پر کام کیا اور کالج کا سارا نظم و نسق نہایت کامیابی سے چلایا۔

کرنل کیانی نے او۔ٹی۔ایس مہو سے ۱۹۴۵ء میں کمیشن حاصل کیا۔ ۱۹۴۸ء میں کشمیر کی لڑائی میں حصہ لیا اور پانڈو فیچر پر کامیاب کارروائیاں کیں۔ ۱۹۶۱ء میں سیالکوٹ جموں بارڈر پر انڈیا نے جو محاذ آرائی کی تھی۔ اس کے جواب میں پاکستان کا جو بریگیڈ بریگیڈیئر شاہ نواز کی کمان میں صف آرا ہوا تھا۔ اس میں کرنل کیانی کی کمپنی بھی شامل تھی۔ اس معرکہ میں کرنل کیانی نے دشمن کے عین سامنے پوری کمپنی کے ساتھ جمعہ کی نماز ادا کی۔ اور دشمن کو ششدر کر دیا۔ کرنل کیانی جذبہ جہاد ہی سے نہیں جذبہ شہادت سے بھی سرشار تھے۔ عام لوگ تو لڑائی میں جان بچانے کی فکر میں رہتے ہیں، وہ جان دینے کی دعائیں مانگتے تھے۔ یہ کیفیت ان پر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں طاری تھی۔ جب انہوں نے کشمیر میں کمانڈو کارروائیاں کیں۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں، ان کا یادگار کارنامہ وہ کمانڈو ایکشن تھا جو انہوں نے دشمن کی ایک پلٹن ۸ کمایوں کے خلاف کیا تھا۔ ۸ انڈین کمایوں رجمنٹ کے کمانڈنگ افسر بلیرا نے اپنی پلٹن کے دربار میں پاکستان کے خلاف توہین آمیز الفاظ استعمال کیے کرنل بلیرا نے اپنے فوجیوں سے اپنے ریسٹ ہاؤس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ بھارت ایک بہت بڑا ریسٹ ہاؤس ہے اور پاکستان تو اس ریسٹ ہاؤس کے غسل خانے سے بھی چھوٹا ہے اور اسی طرح اور بہت سی زبان درازیاں کرتا رہا۔ یہ باتیں کرنل کیانی کے ٹو۔آئی۔سی میجر قاضی جان چرواہے کے لباس میں پاس کے کھیت میں چھپے سن رہے تھے۔ جب یہ اطلاع

حق نواز کو پہنچی کہ بلیرا نے یہ کہا ہے تو وہ اپنے کمانڈو کیمپ میں عشاء کی نماز پڑھ کے کھانا کھا رہے تھے۔ یہ سنتے ہی انہوں نے ہاتھ کا لقمہ وہیں چھوڑا اور غصے سے کہا۔ جب تک میں اس گستاخ کو اس گستاخی کا مزہ نہ چکھالوں، مجھ پر کھانا پینا حرام ہے۔ چنانچہ وہ اسی وقت اپنے مخصوص جانباز دستے کے ساتھ چل پڑے۔ اور بلیرا کو اس کے ریسٹ ہاؤس میں جالیا۔ اتفاق سے وہ اس وقت ریسٹ ہاؤس کے غسل خانے میں تھا۔ حق نواز نے اسے وہیں ٹھنڈا کیا اور کہا:

گستاخ تمہاری موت غسل خانے میں ہی آئی ہے۔

اس کمانڈو ایکشن میں ۸ کمپنیوں کی پوری پلٹن تباہ کر دی گئی۔ اس ایکشن کے لیے انہیں ستارۂ جرأت کا اعزاز عطا ہوا۔ لیکن وہ یہی کہتے تھے مجھے ستارۂ جرأت کی نہیں، شہادت کی تلاش تھی۔

مئی ۱۹۷۲ء میں کرنل حق نواز کیانی نے لیپا ویلی میں بیروالی ناڑ کے معرکے میں ہندو سورماؤں سے ٹکر لی۔ اس بار ان کے مقابل کرنل چنگیا پا تھا۔ وہ مشرقی پاکستان کے محاذ سے آیا تھا اور فتح کے نشہ میں چور تھا اور پاکستان اور پاکستانی فوج کو خاطر میں لانے کے موڈ میں نہیں تھا کرنل کیانی نے اس کی ساری اکڑ بھی نکال دی اور چاننار ج کو فتح کر کے پاکستانی فوج کا سکہ پھر جما دیا اور اس بظاہر ناممکن مہم کو کامیابی سے سر کر کے ثابت کر دیا کہ نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔

اس معرکے کے دوران کیانی نے سر سے کفن باندھ رکھا تھا۔ اسی حالت میں شہید ہوئے۔ یہ واقعہ ۵ مئی ۱۹۷۲ء کا ہے۔ اس معرکے کے لیے بھی انہیں ستارۂ جرأت دیا گیا۔

حق نواز کیانی اسلام، پاکستان اور کشمیر کے عاشق تھے۔ شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے۔

شہید اعظم

شہید عربی کا لفظ ہے اور شہادت سے نکلا ہے۔ شہادت کے ایک معنی گواہی کے ہیں جو کسی حقیقت پر شہادت دے اسے شاہد کہتے ہیں۔ حق پر ایک شہادت زبان سے ہوتی ہے اور ایک جان سے۔ خدا کا وہ بندہ، وہ مرد خود آگاہ جو حق کی صداقت پر اپنی زبان سے نہیں اپنی جان سے گواہی دے، اسے شہید کہتے ہیں۔ شہید خالص اسلامی تصور ہے یہی وجہ ہے کہ شہید کا ہم معنی لفظ دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملتا۔

حق پر جان سے گواہی دینے والوں کی اسلام میں کبھی کمی نہیں رہی وہ سب شہید ہیں لیکن امام حسین رضہ نہ صرف شہید ہیں بلکہ شہید اعظم رح۔ آخر حسین رضہ کی شہادت میں وہ کون سی بات تھی جس نے انہیں یہ رتبہ دیا کہ حضرت معین الدین چشتی اجمیری رح نے کہا:

حقا کہ بنائے لا الہٰ است حسین رضہ

حضرت امام حسین رضہ کے سامنے جو مسئلہ درپیش تھا وہ بنیادی نوعیت کا تھا۔ اسلامی سیاست میں جو اساسی تبدیلی یزید کی جبری خلافت اور ملوکی طرز حکومت سے پیدا ہو رہی تھی وہ اسلام کی روح کے سراسر منافی تھی۔ حضرت امام حسین رضہ کی تربیت نبوت کے گہوارے میں ہوئی تھی وہ نظر میں یکتا تھے۔ اور اذان سحر میں بھی، چنانچہ انہوں نے ہر قسم کی قربانی دے کر حق کی خاطر ایک اصولی معاملے میں یزید سے مفاہمت کرنے سے انکار کر دیا۔

اس طرح حق پر اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان نچھاور کر دی۔ چونکہ یہ ایک عظیم اصول کے لیے ایک عظیم قربانی تھی، اس لیے وہ شہید اعظم رح کہلائے۔ انہوں نے حق و صداقت کی راہ میں وہ چراغ روشن کیا تھا جو تا ابد روشن رہے گا۔

دُعا

(بحضور رب المشرقین و المغربین قبلہ اوّل مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی پر)

خدائے بزرگ و برتر،

ملت بیضا، امت مسلمہ پر مصائب پہلے بھی آئے تھے، کبھی وسط ایشیا سے فتنہ تاتار

اٹھا تھا اور دجلہ کے پانیوں کو مسلمانوں کے خون سے رنگین کر گیا تھا۔ ہمیں صلیبیوں کا سیلاب بلاخیز بھی یاد ہے جس کی یلغار کو ہم نے اپنی ہڈیوں کی دیوار سے روکا تھا۔ اندلس میں ہمارا گلستاں اجڑنے کی المناک داستان ہمارے حافظے سے محو نہیں ہوئی، کبھی پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کا خون بھی بہا تھا۔ سرنگاپٹم میں ٹیپو کی تلوار بھی ٹوٹی تھی۔ بالاکوٹ میں سید احمد شہید کا خون بھی بہا تھا۔ اور خاندان تیموری کا آخری شہنشاہ رنگون میں بے کسی کی موت بھی مرا تھا اور اس صدی کے شروع میں خلافت کا شیرازہ بھی بکھرا تھا اور عثمانیوں پر کوہِ غم بھی ٹوٹا تھا قوم حجازیوں ہی موج حوادث سے ٹکراتی رہی ہے ۔ تند آندھیاں آتی رہی ہیں لیکن چراغِ حرم جلتا ہی رہا ہے۔

لیکن اے رب جلیل و عظیم!

اس بار تو عہد گل ختم ہوا ٹوٹ گیا ساز چمن

اے موسیٰؑ اور ہارون کے معبود!

اے علیم و خبیر!

تو خوب جانتا ہے کہ یہ صرف عربوں اور یہودیوں کی جنگ نہیں، قبرص میں عیسائیوں اور ترکوں کا معرکہ نہیں۔ ہندوستان میں صرف ایک اقلیت پر ظلم نہیں ہو رہا۔ یہودیوں ہندوؤں اور نصرانیوں کے سینے میں مسلمان نہیں کھٹکتے اسلام کھٹکتا ہے۔

اے الٰہ العالمین!

یوں تو دنیا میں اشتراکی بھی ہیں اور غیر اشتراکی سرمایہ دار بھی۔ سفید فام، سیاہ فام۔ ایسی قیامت تو کبھی نہیں آئی تھی اس بار آگ کے شعلے قبلہ اوّل تک پہنچ گئے انبیاءؑ کی سرزمین یعقوب، اسحاق اور شعیب کے مرقدوں کی سرزمین ہم سے چھن گئی۔ وہ مسجد اقصیٰ جو رسول پاکؐ کے مبارک قدموں سے سرفراز ہوئی تھی۔ وہ مسجد اقصیٰ جسے معراج نبویؐ میں منزل اوّل ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا، وہ مسجد اقصیٰ جو سراپا حرمت تھی بے حرمت ہوگئی

زرد فام اور ان میں باہم آویزش بھی ہے۔ رنگ، نسل، وطن، مذہب کے جھگڑے بھی، لیکن یہ سب ایک ہیں، توحید پرستوں کے خلاف، تیرے رسولؐ کو ماننے والوں کے خلاف قرآن کو سینے سے لگانے والوں کے خلاف

اے وحدۂ لاشریک!

ہم کب تک بلبل کے نغمے سنیں اور ہمہ تن گوش رہیں؟ کب تک ہم پر برق گرتی رہے گی۔

اے رب کعبہ!

صرف تجھی کو اللہ اور محمدؐ کو تیرا رسول ماننے والے آج ایک نئے دوراہے پر کھڑے ہیں ایک نئی آزمائش سے دوچار ہیں۔ ان کو اندر سے ڈسے جانے کا خطرہ ہے اور باہر سے آگ کا ایک دریا ان کی طرف انڈا چلا آرہا ہے۔ تو ان کی مدد فرما۔

اے قادر و قیوم!

ہم گمراہ و گنہگار ضرور ہیں لیکن تیرے نام لیوا بھی تو ہیں ہمیں اپنی بے پایاں رحمت کے سائے میں لے لے۔

اے رب العالمین!

اس بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل، اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے رفعت میں مقاصد کو ہمدوش ثریا کر۔

خودداری ساحل دے آزادی دریا دے

اے خالق کونین!

تو ہمیں ابوبکرؓ کا صدق، فاروقؓ کا فقر، عثمانؓ کا غنا اور حیدرؓ کا زور عطا کر۔

اے مالک یوم الدین!

آج ہم ہر سو یزیدوں میں گھرے ہوئے ہیں تو ہمیں حسینؓ کے نقش قدم پر چلنے کی

توفیق عطا فرما۔

اے خالقِ ارض وسما! کہیں مفلسی ہمارے لیے عذاب بن گئی ہے اور کہیں دولت سانپ بن کر ڈس رہی ہے تو ہمیں فقرِ بوذر و بایزید عطا فرما۔

اے خداوندوں کے خدا!

آج ہماری دینی غیرت کو اغیار نے للکارا ہے آگ ہے اور اولادِ ابراہیم ہے تو ہمارے بچے بچے کو صلاح الدین بنا دے، ہماری سانس سانس کو تلوار کر دے۔

اے ذوالجلال والاکرام!

انبیاء کی سرزمین ناپاک قدموں تلے ہو اور ہم خاموش تماشائی ہوں، قبلۂ اوّل کی بے حرمتی ہو اور ہم یہ دیکھنے کے لیے زندہ رہیں۔

اے رب المشرقین والمغربین!

گنبدِ خضرا کی قسم، حجرِ اسود کی قسم ہم پر ایسی زندگی حرام ہے، حرام ہے، حرام ہے، اے میرے مولا! اے میرے مالک، میری آرزو ہے، راہِ حق میں میری آواز نہیں میرا خون شامل ہو۔ آمین

باب ششم مینارۂ نور
قرآن حکیم اور ہماری زندگی

صدر : معزز حاضرین!
قرآن حکیم اور ہماری زندگی کے سلسلہ میں آج کے مذاکرے کا موضوع ہے۔ تقویٰ تقوے سے کیا مراد ہے؟ اور اسلام میں اسے کیا اہمیت حاصل ہے؟ میں نسیم سے درخواست کروں گا کہ وہ بحث کا آغاز کریں۔

نسیم : تقویٰ کے لفظی معنی انتہائی احتیاط اور نگہداشت کرنے کے ہیں۔ لیکن شریعت کی اصطلاح میں اس سے مراد ہے زندگی، اس احتیاط سے بسر کرنا کہ وہ ہر طرح کی گمراہی سے محفوظ رہے، تقویٰ حقیقت میں اس قلبی کیفیت کا نام ہے جو تعلق باللہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جب بندہ از خود منشائے الٰہی کو پہچاننے لگتا ہے اور شوق سے سیدھے راستے پر چلنے لگتا ہے، افراط و تفریط سے بچ کر از خود اعتدال کو اختیار کرتا ہے۔

صدر : کچھ آپ فرمایئے۔

شمیم : اس میں کوئی شک نہیں کہ تقویٰ تمام نیکیوں کی جڑ اور تمام بھلائیوں کی اصل و بنیاد ہے۔ تقویٰ کے ایک معنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے بھی ہیں، بندہ جب اپنے رب سے ڈر کے چلتا ہے تو ہر اس بات سے پرہیز کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے ٹکراتی ہو، وہ ہر برائی سے بچنے لگتا ہے اور ہر آلودگی سے بیزار رہتا ہے۔

نعیم : بجا فرمایا آپ نے تقویٰ کے معنی خوف الٰہی کے بھی ہیں لیکن یہ خوف وہ خوف نہیں جو خطرے کی وجہ سے ہوتا ہے جس سے انسان بھاگتا ہے اور جو نفرت کا سبب بنتا ہے۔ تقوے کا خوف محبت اور احساس شکر گزاری سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کی مثال اس خوف سے دی جا سکتی ہے جو سعادت مند بچوں کے دل میں اپنے والدین کے

لیے ہوتا ہے۔ چونکہ وہ ان سے محبت کرتے ہیں اور دل سے عزت کرتے ہیں۔ اس لیے ہر وقت ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں کوئی ایسا کام نہ ہو جائے، کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکل جائے جو ان کی ناراضگی کا سبب بنے۔ اسی طرح نیک بندے کو اپنے رب کی محبت اس کی مرضی کے خلاف نہیں چلنے دیتی۔ مالک کی ناراضگی کا ڈر اسے سیدھے راستے پر رکھتا ہے۔ اسی خوف الٰہی کا نام تقویٰ ہے۔

نسیم : اسی وجہ سے تقوے کی مثال خار دار جھاڑیوں سے گزرنے کی ہے کہ گزرنے والا کانٹوں سے دامن اُلجھنے نہ دے اور اپنا دامن کانٹوں کی زد سے بچا کر چلے برائیوں سے بچنے اور احتیاط و اعتدال سے زندگی گزارنے کا نام تقوای ہے۔

سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

"اے دعوت ایمانی کے قبول کرنے والو! تقوے سے چلو۔ یعنی اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔"

صدر : یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تقوٰی صرف برائیوں سے بچنے اور احتیاط کرنے کا نام ہے۔

نعیم : تقوای صرف برائیوں سے بچنے تک محدود نہیں بلکہ یہ تو پہلی منزل ہے۔ متقی برائیوں سے بچتا اور اچھے کاموں کی طرف شوق سے بڑھتا ہے۔ سورۂ بقرہ کی وہ آیت کہ "نیکی محض یہ نہیں کہ تم اپنا رخ کبھی مشرق کی طرف کر لو اور کبھی مغرب کی طرف۔" بڑی معنی خیز ہے۔ اس آیت سے متقی کی جو امیج یا تصویر ابھرتی ہے وہ ایک فعال اور ذمہ دار بندے کی ہے۔

اس بحث کے آخر میں نسیم سے درخواست کروں گا کہ وہ یہ بتائیں کہ اسکول کی زندگی میں تقوے کا اطلاق کیسے ہو گا۔ کیا ایک طالب علم متقی ہو سکتا ہے۔

نسیم ہو سکتا ہے۔ کیوں نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایک طالب علم کے لیے تقوٰی کا انداز ذرا مختلف ہو گا۔

صدر : کیسے ؟

نسیم : طالبعلم کا تقویٰ یہی ہے کہ نماز روزے کے ساتھ ساتھ اسکول کے قواعد و ضوابط کی پابندی کرے، ڈسپلن کو ٹھیک رکھے، دل لگا کر پڑھے۔

شمیم میرا خیال ہے کہ اسکول میں کلاس روم میں، کھیل کے میدان میں، بہت سے مقام ایسے آتے ہیں جہاں تقویٰ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ایک لڑکا جھوٹ نہ بولے، بد دیانتی نہ کرے، محبت اور ہمدردی سے کام لے، دوسرے لڑکوں کی راحت و آرام کا خیال رکھے، ان کے ساتھ انصاف کرے، بلکہ ایثار و احسان کا رویّہ اختیار کرے، یہی اس کا تقویٰ ہے۔

صدر شکریہ۔ یہ مذاکرہ یہاں ختم ہوتا ہے۔

قرآن حکیم اور غور و فکر

میزبان معزز مہمان خصوصی اور محترم سامعین!

کہا جاتا ہے کہ آج کا دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے اور سائنس کی بنیاد مشاہدہ اور تجربہ پر ہے، غور و فکر پر ہے، تعقل و تفکر پر ہے۔ قرآن حکیم بھی ہمیں تعقل و تفکر اور تدبر کی تعلیم دیتا ہے۔ اس اہم موضوع پر بحث کا آغاز کرنے کے لیے میں حامد صاحب کو دعوت دیتا ہوں۔

حامد اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن حکیم نے بار بار تفکر و تدبر کی تعلیم دی۔ فرمایا ہے۔

کتب انزل الیك مبرك تبدبروا آیته

یہ بابرکت کتاب ہم نے آپ (رسول اللہ صلعم) پر اس لیے اتاری، کہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں۔

اسی طرح دوسری جگہ اللہ جل شانہٗ نے فرمایا ہے:

ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نازل کیا کہ لوگوں کے واسطے جو مضامین اترتے ہیں آپ ان کو لوگوں پر کھول کر بیان کر دیں۔ تاکہ وہ ان پر غور و فکر کریں۔

ان آیات سے جن کا حوالہ میں نے ابھی دیا ہے۔ یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ تدبر و تفکر مذہبی فریضے کی حیثیت رکھتا ہے جس کا حکم قرآن حکیم میں واضح طور پر دیا گیا ہے۔

میزبان محمود آپ کا کیا خیال ہے؟

محمود میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں قرآن حکیم نے "توہم" کو نہیں تفکر کو ابھارا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں۔ افلا تعقلون، تفکرون اور تدبرون کے الفاظ بار بار آتے ہیں۔ غور و فکر کرنے پر اسی تاکید کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے سوشل اور نیچرل سائنسوں کی تحصیل، تعلیم و ترویج میں ایک عبادت کے طور پر دلچسپی لی۔ تاریخ جغرافیہ، ہیئت، طبیعات، کیمیا، طب، ریاضیات، غرض جدید علوم و فنون کے ہر شعبہ میں مسلمانوں نے نئے چراغ جلائے۔

میزبان اب میں مسعود کو اظہار خیال کی دعوت دیتا ہوں۔

مسعود قرآن حکیم نے ایمان لانے کے لیے بھی غور و فکر کی دعوت دی ہے۔

ان فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف الیل والنھار لاٰیات لاولی الباب

"بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے ادل بدل میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں"

مسلمان اہل عقل و دانش نے اس دعوت فکر کو قبول کیا اور کائنات کا مطالعہ شروع ہوا جس سے مختلف علوم و فنون وجود میں آئے۔ ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اور اسی کا کام رات دن کو ادلنا بدلنا ہے۔ کیا تم لوگ غور نہیں کرتے قرآن حکیم کی اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے مشاہدے، معائنے اور

پیمائش کے جدید سائنسی طریقوں کی بنیاد ڈالی جن سے یونانی بھی واقف نہ تھے۔ اسپین کے راستے سے یہ روشنی یورپ میں پہنچی۔ مسلمانوں کی تحقیقات اور تصنیفات کا سلسلہ آٹھویں صدی سے تیرھویں صدی تک جاری رہا۔

میزبان آخر میں مشتاق سے کہوں گا کہ وہ بحث پر تبصرہ کریں۔

مشتاق میں صرف یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ اس امر پر بھی غور و فکر کرنا چاہیے کہ غور و فکر کے یہ سوتے خشک کیوں ہوگئے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی ہماری میراث تھی، کن اسباب نے ہمیں اس سے بیگانہ کر دیا۔

میزبان غور و فکر کی اس دعوت کے ساتھ یہ مذاکرہ ختم ہوتا ہے۔ مقررین اور سامعین آپ سب کا بے حد شکریہ۔

برکاتِ قرآن حکیم

صدر : آنحضرت نے ایک مرتبہ شعبان کی آخری تاریخ کو صحابہ کرام رض سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے لوگو! تم پر ایک ایسا مہینہ شروع ہونے والا ہے جو بڑا مبارک مہینہ ہے۔ اس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بڑھ کر ہے۔

سورۃ القدر میں قرآن نے اسی رات کو لیلۃ القدر کہا ہے۔

شب قدر بھی اسی رات کو کہتے ہیں اور یہ رمضان المبارک کے آخری دنوں میں کسی طاق رات کو کہتے ہیں اور یہ رمضان المبارک ستائیسویں رات لیلۃ القدر ہے اسی رات قرآن مجید نازل ہونا شروع ہوا تھا۔

اس بابرکت موقع پر ہم نزول قرآن کی تقریب منعقد کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں چونکہ تلاوت قرآن حکیم مطالعہ قرآن حکیم کی پہلی منزل ہے اس لیے آج ہمارے مذاکرہ کا موضوع تلاوت قرآن حکیم ہی ہے۔

سب سے پہلے میں اپنے محترم استاد شمیم صاحب سے درخواست کروں گا۔ کہ وہ بحث کا آغاز فرمائیں۔

شمیم ایک حدیث ہے سب سے اچھا وہ ہے جس نے قرآن پڑھا اور دوسروں کو پڑھایا اس لیے کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

صدر اللہ تعالیٰ کے کلام ہونے کا پورا مطلب کیا ہے؟

شمیم اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک کا ہر لفظ، اوّل تا آخر ہر لفظ اللہ تعالیٰ کا اپنا کلام ہے۔ جو بالکل ان ہی الفاظ میں رسول اللہؐ پر نازل ہوا۔ یا اترا۔ قرآن پاک ایک ایسی آسمانی کتاب ہے جو بغیر کسی ردوبدل کے، بغیر کسی تبدیلی کے مکمل طور پر جوں کی توں دنیا میں موجود ہے اور تاابد اسی طرح موجود رہے گی۔ اس کی حفاظت کا ذمہ خدا تعالےٰ نے خود لیا ہے۔

صدر لیکن نزول قرآن کی ترتیب وہ تو نہیں تھی۔ جو ترتیب اب اس کی ہے۔

شمیم یہ صحیح ہے کہ بعینہٖ قرآن حکیم اس ترتیب سے نہیں اترا تھا جو ترتیب موجودہ صحیفے کی ہے۔ لیکن موجودہ ترتیب بھی منشا الٰہی کے مطابق ہے۔ اس کو رسول اللہ نے وحی کی روشنی میں ترتیب دیا تھا۔

صدر اب میں اپنے استاد حافظ صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ تلاوت کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالیں۔

استاد تلاوت قرآن، خدا تک پہنچنے کا سب سے آسان اور یقینی راستہ ہے۔ ناظرہ بھی اور ترجمے کے ساتھ سمجھ کر بھی۔

صدر : ترجمے کے ساتھ سمجھ کر تلاوت کی افادیت تو سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن بغیر سمجھے ناظرہ پڑھنے کی افادیت کیا ہے؟ اور اگر ثواب ہے تو ثواب کا پہلو کیسے نکلتا ہے؟ اگر بے ادبی نہیں تو اس کا جواب دیجیے؟

استاد ؛ اصل میں تو قرآن خود قرآن کے اپنے الفاظ میں تعقل اور تفکر کے لیے ہی ہے۔ آیات الٰہی یعنی خدا کی نشانیوں پر غور کرنا اور ہدایت پانا ہی اس کے مطالعہ کا مقصد وحید ہے لیکن ناظرہ پڑھنا بھی روحانی فوائد سے خالی نہیں۔ تفصیل اس امر کی یہ ہے کہ قرآن پاک کا عربی متن منزل من اللہ عربی ہے، عام عربی نہیں۔ قرآن کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے اپنے الفاظ ہیں۔ ان الفاظ کو سچے دل سے بغیر سمجھے دہرانا یا ناظرہ پڑھنا بھی ایک کیمیائی اثر رکھتا ہے۔ لگن سے قرآن پڑھنے سے انسان روحانی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ یوں پڑھنے والے کا قلب روشن ہونے لگتا ہے خدا اس کو نور ہدایت دیتا ہے اور اس کے دل کو وہ طاقت و توانائی اور وہ سکون ملتا ہے جسے قرآن نے سکینتہ القلب کہا ہے۔

صدر اب میں اپنے پرنسپل صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ کچھ ارشاد فرمائیں۔

پرنسپل قرآن شریف کی تلاوت و قرات کی فضیلت میں بہت سی حدیثیں ہیں۔ صحیح مسلم میں ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا۔ قرآن پڑھا کرو۔ کیونکہ یہ قیامت کے روز اپنے پڑھنے والوں کی شفاعت کرائے گا۔ صحیح بخاری میں حضرت عثمان رض نے رسول اللہ سے روایت کیا ہے تم میں سے سب سے اچھا وہ ہے جس نے قرآن پڑھا۔ پھر دوسروں کو پڑھایا۔ اس میں کوئی شک نہیں، قرآن کے الفاظ میں ایک ایسی تاثیر ہے جو کسی اور کتاب میں نہیں۔ قرآن کا پڑھنا ثواب اسی لیے ہے کہ اس سے ہدایت کا راستہ کھلتا ہے۔ یہ متقیوں کے لیے ہدایت ہے ھدًی للمتقین

قرآن اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت ہے۔ دوسری بہت سی نعمتیں جسم کے لیے ہیں۔ یہ جان کے لیے، روح کے لیے ہے، زندگی خواہ ایک فرد کی ہو یا قوم کی اس کی کامیابی ترقی، فلاح اور ہر قسم کی سعادت کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعا سکھلائی اس میں ہے۔ یا الٰہی مجھ کو قرآن مجید اور اس کا علم عطا فرما اور اس کو میرے رگ وپے میں جاری وساری کر۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی توفیق ہی سے انسان کو بار بار قرآن تلاوت کرنے کی سعادت نصیب ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام کے الفاظ سے محبت ہونے کے بعد ہی اس کے معانی تک رسائی ہو سکتی ہے۔

مسلمان کے لیے دین اور دنیا کی فلاح کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ قرآن کا راستہ ہے۔ قرآن کی ناظرہ تلاوت اس راستہ میں پہلا بابرکت قدم ہے۔ دوسری منزل اس کے مطالب پر غور وفکر کرنا ہے۔ تیسری منزل اور اصل مقصود اس کی ہدایت کے مطابق زندگی بسر کرنا ہے۔

توحید اور تنظیم

تنظیم کا لفظ Integration کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے دیکھنا یہ ہے کہ توحید کے تصور سے ذات کی تنظیم میں اور معاشرے کی تنظیم میں کیا راہنمائی ملتی ہے جدید ماہرین نفسیات کردار کی تعمیر میں مختلف جذبوں اور جبلتوں کی تنظیم پر بہت زور دیتے ہیں۔ یعنی شخصیت کی نشوونما ایک وحدت کے طور پر ہو۔ ذات مختلف جذبوں کی آویزش کا شکار نہ ہو۔ بلکہ مختلف جذبے تعمیر خودی کے بنیادی جذبے کے تابع ہوں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ مثبت کردار کی تربیت کے لیے ضروری ہے کردار کو ایک اکائی سمجھا جائے توحید پر ایمان لانے سے وحدت کا رجحان پیدا ہوتا ہے چنانچہ ایک سچا مسلمان کبھی کسی نفسیاتی انتشار کا شکار نہیں ہو سکتا۔ نفسیاتی انتشار ہمیشہ ذہنی بدنظمی کا نتیجہ ہوتا ہے جو وحدت کی نفی ہے توحید پر ایمان نفسیاتی انتشار اور ذہنی بدنظمی سے کس طرح بچا لیتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام میں زندگی گزارنے

جو انداز سکھایا گیا ہے وہ انسان کے تمام نفسیاتی تقاضوں کو پورا کرتا ہے، جسمانی تقاضوں کو بھی اور روحانی تقاضوں کو بھی۔ انفرادی تقاضوں کو بھی اور اجتماعی تقاضوں کو بھی جذبات کی ترتیب و تنظیم میں، افراط یا تفریط سے شخصیت میں بدنظمی کی کیفیت رونما ہوتی ہے۔ اسلام کی بنیادی قدر، عدل ہے جو توازن کا دوسرا نام ہے جو شخص جذباتی یا جبلتی افراط و تفریط کا شکار نہیں ہو گا وہ نفسیاتی خلفشار سے بھی محفوظ ہو گا۔

ڈسپلن کا جدید تصور یہ ہے کہ ڈسپلن یہ کام کرنے یا وہ کام نہ کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ شخصیت، کی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کی تنظیم اور تالیف اور ان کی تربیت کا نام ہے ڈسپلن کا لفظ Disciple سے نکلا ہے اس کے لفظی معنی سیکھنے کے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمارے سارے مذہب کا مقصد ہی یہ سکھانا ہے کہ زندگی کو بہتر سے بہتر طریقے سے کس طرح گزارا جائے۔

توحید کے تصور سے زندگی میں وحدت پیدا ہوتی ہے جو نفسیاتی سکون اور طمانیت کا سرچشمہ ہے اور کردار کی بہتر تعمیر کا ذریعہ بھی۔

بیشتر مذاہب میں مادہ اور روح کو، دین اور دنیا کو، مایا اور آتما کو، الگ الگ ایک دوسرے کی ضد سمجھا گیا ہے۔ اسلام میں بنیادی تصور ہی توحید ہے۔ اسی توحیدی نقطہ نظر کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام میں مادے اور روح کو ایک دوسرے کا حریف نہیں بلکہ حلیف بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ مومن کے تصور میں دینی اور دنیاوی صفات کا امتزاج ملتا ہے اور دین اور سیاست ہمارے یہاں علیحدہ علیحدہ نہیں ہیں۔ چنانچہ توحید پر ایمان ہی اسلامی ملت اور ساری قوم کی تالیف Integration کی بنیاد ہے جو معاشرہ توحید پر مبنی ہو اس میں افتراق اور انتشار کی گنجائش ہی نہیں رہتی بلکہ توحید عالمگیر اخوت کی ضامن ہے جب خالق مطلق ایک ہے تو مخلوق بھی ایک ہے۔ نہ صرف ایک ہے بلکہ برابر بھی ہے جس

طرح ایک باپ کی اولاد ایک دوسرے سے خون کے رشتے سے بندھی ہوتی ہے اور ایک دوسرے سے کئی اعتبار سے مختلف ہونے کے باوجود برابر کے حقوق رکھتی ہے حالی نے جو یہ لکھا ہے :

یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

یہ توحید کے تصور کی صحیح ترجمانی ہے۔

اُسوۂ حسنہ

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

معزز مہمان خصوصی اور محترم خواتین و حضرات !

میں بصد عجز و نیاز، بہ ہزار ادب و احترام، اسوۂ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

خواتین و حضرات !

آج جبکہ ہم اس ملک میں جو اسلام کے نام پر بنایا گیا تھا۔ اسلام کو عملی طور پر نافذ کرنے کے جہاد اکبر میں مصروف ہیں۔ نہایت ضروری ہے کہ ہم ہر قدم پر اور ہر منزل پر اسوۂ رسول کریم کو چراغ راہ بنائیں تاکہ اس کی روشنی میں ہم دنیا اور آخرت کے حسنات سے بہرہ ور ہو سکیں۔

خواتین و حضرات !

اسوۂ رسول کریمؐ کو چراغ راہ بنانے کی جو فلسفیانہ توجیہہ اقبال نے پیش کی ہے وہ بھی قابل غور ہے۔ اپنے انگریزی خطبات میں علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

اسلام بحیثیت دین، خدا کی طرف سے ظاہر ہوا لیکن بحیثیت سوسائٹی یا ملت رسول کریمؐ

کی شخصیت کا مرہونِ منت ہے۔

لوح بھی تو قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ، تیرے محیط میں حباب

صاحبِ نظر سامعین!

نفسیاتی اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو انسان کی دماغی اور قلبی تربیت کے لیے نہایت ضروری ہے کہ ان کے عقیدے کی رو سے زندگی کا جو بہترین نمونہ ہو، وہ ہر وقت ان کے سامنے رہے۔ رحمتِ دو عالم، محمد رسول اللہ سے بڑھ کر زندگی کا کامل نمونہ کون ہو گا جن کے حسنِ اخلاق کی گواہی ان کے بدترین دشمنوں نے بھی دی۔ جو ان کے عقائد کو تو جھٹلاتے تھے لیکن خود ان کو صادق و امین کہتے تھے۔ ہم مسلمانوں کے لیے تو وہ عین قرآن اور عین اسلام ہیں:

نگاہِ عشق و مستی میں، وہی اوّل، وہی آخر
وہی قرآن، وہی فرقاں، وہی یٰسین، وہی طٰہٰ

خود اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے احمد مجتبیٰ، محمد مصطفیٰ کو صاحبِ خلقِ عظیم کہا ہے۔

وانک لعلیٰ خُلُقٍ عظیم۔

قرآن مجید، فرقان حمید میں بار بار اطاعتِ رسول کا حکم دیا گیا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِن رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ ہم نے جو رسول بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے پھر اسی سورۂ نساء میں ایک جگہ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"پس نہیں اے محمد! تمہارے رب کی قسم، یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ اپنے اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں۔ بلکہ بخوشی قبول کر لیں۔"

خواتین و حضرات!

آج جبکہ ہم پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانے کی کوششوں میں مصروف ہیں، وقت کا

اہم ترین تقاضا ہے کہ خاص طور پر نوجوان طلبا، بقول اقبال، محمد سے وفا کریں۔ مقام مصطفٰے کو سمجھیں اور معارفِ مصطفٰے سے اپنی راہوں کو روشن کریں۔

بہ مصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

شکریہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بحیثیت مُعلّم

امجد : خواتین و حضرات!

اب ایک مذاکرہ پیش کیا جاتا ہے۔ عنوان ہے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ حیثیت معلم

میں بشیر سے درخواست کروں گا کہ وہ گفتگو کا آغاز کریں۔

بشیر : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب منصب نبوت سے سرفراز ہوئے تو آپ نے اپنی بعثت کا مقصد خود ~~بنایا~~ بتایا

انما بعثت معلماً؛ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں اور پھر تعلیم کے بارے میں فرمایا انما بعثت لمکارم الاخلاق میں بھیجا گیا ہوں تا کہ بہترین اخلاق کی تکمیل کروں۔

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ افضل العلم اخلاق ہے گویا تعلیم کا سب سے بلند مقصد بہترین اخلاق کی تعمیر و تکمیل ہے۔

ہم طلبا کے لیے بھی اس میں ایک اشارہ ہے۔ تعلیم کا مقصد صرف کتابی معلومات کو جمع کرنا ہی نہیں بلکہ افضل تر مقصد کردار و اخلاق کی تعمیر و تکمیل ہے۔

سلیمان : اگر اسلامی لحاظ سے تعلیم کا افضل تر مقصد بہتر اخلاق و کردار کی تعمیر و تکمیل ہے تو ہمارے معاشرے میں صرف ڈگری یافتہ کو تعلیم یافتہ کیوں کہا جاتا ہے۔

شبیر : اس کا جواب میں عرض کرتا ہوں کہ جیسا کہ ایک روز ہمارے استاد نے فرمایا تھا۔ایسٹ انڈیا کمپنی کی غلامی کے دور سے ایک سازش کے تحت تعلیم کے مقاصد بدل دیئے گئے۔ جب منزلیں بدلیں تو راہیں بھی بدل گئیں رفتہ رفتہ صورت حال یہ ہو گئی کہ تعلیم کا رشتہ اخلاق سے کٹ گیا۔

عثمان : رسول اللہ کے معلم اخلاق ہونے کے بارے میں قرآن حکیم میں صراحت سے موجود ہے۔تیسرے پارے میں ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۳-۱۶۴)

بے شک اللہ نے مومنوں پر احسان کیا جب کہ ان میں ان ہی میں سے رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیات سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اس آیت کریمہ سے رسول صلعم کی معلمی کے چار مقاصد متعین ہوتے ہیں۔

پہلا : اللہ کی آیات پڑھ کر سنانا۔یعنی اللہ کا کلام اور پیغام بعینہٖ لوگوں تک پہنچانا۔

دوسرا : اللہ کے کلام کی تشریح کرنا زبان سے اور عمل سے۔

تیسرا : حکمت کی تعلیم دینا۔

چوتھا : تزکیہ کرنا۔یعنی انسانوں کی ذہنی وجذباتی تربیت اس طرح کرنا کہ ان کا کردار ڈسپلن اور تقوے کی صورت اختیار کرلے۔

گویا تزکیہ رسول اللہ کے منصب معلمی کا لازمی جزو ہے

امجد : شاہنواز! کچھ آپ بھی روشنی ڈالیئے

شاہنواز : قرآن حکیم میں ہمیں علم کے بارے میں جو دعا سکھائی گئی وہ ہے رب زدنی علماً

اے میرے رب، میرے علم میں اضافہ فرما۔

یہ دعا بہت معنی خیز ہے اس میں مسلسل حصول علم کی ترغیب ہے۔ حصول علم کی کوئی انتہا نہیں، علم کی ہر منزل کے بعد بھی منزلیں ہوتی ہیں ارشاد خداوندی ہے

وَفَوقَ کُلِّ ذِی عِلمٍ عَلِیم اور ہر علم والے سے بڑھ کر ایک علم والا ہے۔

تورہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول

امجد یہاں یہ مجلس برخاست ہوتی ہے۔

علم اور حصولِ علم

مہمان خصوصی اور حاضرین گرامی!

آج یوم نزول قرآن کے مبارک موقع پر میں "علم" کے موضوع پر قرآن حکیم اور چند احادیث نبوی کے حوالے سے کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

جناب والا!

قرآن حکیم میں حکمت کو خیر کثیر کہا گیا ہے۔ یعنی علم و حکمت سے بھلائی اور بہتری کے بہت سے پہلو نکلتے ہیں۔ اس میں کیا شک ہے کہ حکمت خیر کثیر ہے۔ قرآن حکیم ہی میں خود اللہ تعالیٰ جل شانہ، نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو دعائیں مانگنے کو کہا ان میں ایک یہ بھی ہے کہ رب زدنی علماً اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تحصیل علم ایک مسلسل عمل ہے اس لیے اس میں ہر دم اضافے کی دعا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ علم و حکمت کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ وفوق کل ذی علم علیم ہ ہر علم والے سے بڑھ کر ایک علم والا ہے۔

علم اور تعلیم کے شرف و عظمت کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا ایک مقصد تعلیم دینا بھی ٹھہرایا اور اپنے آپ کو معلم کہا حدیث نبوی ہے۔ انما بعثت معلماً۔ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

اسلام روشنی کا داعی، روشنی کا پیامبر ہے۔ طلب علم کو اسلام میں ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت حاصل ہے مشہور حدیث ہے۔ طلب العلم فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَۃٍ یعنی علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے اور اس میں عمر کی بھی قید نہیں۔ ایک نہیں بہت سی احادیث ایسی ہیں جن سے علم کی اور حصول علم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے ایک مرتبہ آپ نے فرمایا۔

جو شخص علم کی تلاش میں کسی راستے پر چلتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔ ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

جو شخص علم کی طلب میں نکلتا ہے تو وہ لوٹتے وقت تک اللہ کے راستے میں ہوتا ہے ایک اور حدیث میں عابد و زاہد پر عالم کو ترجیح دی گئی ہے۔

جناب والا!

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علم میں صرف دینی علوم شامل ہیں یا فنی اور سائنسی علوم بھی؟ اسلام میں دین و دنیا، مادہ اور روح کی تفریق نہیں، قرآن میں سیر فی الارض اور اللہ کی آیات یعنی نشانیوں کے مطالعے و مشاہدے اور تفکر و تدبر کی تلقین کی گئی ہے افلا تتفکرون اور افلا تدبرون کے فقرے بار بار آتے ہیں۔ اسلام کے اسی تعلیمی و تحقیقی نقطہ نظر سے تحصیل علم و حکمت کی وہ عظیم اور ہمہ گیر تحریک اٹھی جس نے گیارہویں اور بارہویں صدی میں بغداد اور اندلس کو دنیا کا روشن ترین خطہ بنا دیا تھا۔ جدید مغرب کی علمی و تحقیقی سرگرمیوں کے سوتے مسلم اسپین ہی سے پھوٹے۔ یہ ساری دنیا کو معلوم ہے کہ دنیا کا سب سے پہلا انسائیکلو پیڈیا مسلمانوں ہی نے دسویں صدی عیسوی میں اخوان الصفا کے نام سے مرتب کیا تھا۔

جناب والا!

آخر میں، میں ایک معروف حدیث کی طرف اشارہ کروں گا۔ یعنی علم حاصل کرو چاہے

نہیں چین تک جانا پڑے۔

جناب والا!

اس حدیث کے بغور مطالعہ سے تین نکتے نکلتے ہیں۔ اوّل یہ کہ حصول علم کے لیے جتنی زحمت و مشقت اٹھانی پڑے، اٹھانا چاہیئے۔ چین اس زمانے کی معلوم دنیا کا بعید ترین ملک تھا۔ جہاں تک پہنچنا مشکل ترین مسئلہ تھا اس کے باوجود چین تک جانے کی ہدایت کی گئی۔

دوسرے یہ کہ اس میں غیر مذہبی سائنسی اور فنی علوم کے حصول کو اتنی اہمیت دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن و حدیث کا مرکز تو مکہ مدینہ تھے اگر حصول علم کے لیے چین تک جانے کو کہا گیا ہے۔ تو یقیناً یہ علم محض دینی علم نہیں ہو سکتا۔

غور فرمایئے، چین اس وقت تک اسلام کی روشنی سے فیض یاب نہیں تھا۔ وہاں کی زبان بھی عربی نہیں تھی۔ وہاں کے استاد بھی مسلمان نہیں ہو سکتے تھے۔ اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ یہی کہ سائنسی و فنی علوم کا مطالعہ کرنا غیر ملکی زبان سیکھنا، غیر مسلم استادوں سے پڑھنا اور غیر مسلموں کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھنا سب جائز بلکہ نہایت ضروری ہے۔

حاضرین گرامی!

آج اس مبارک تقریب کے موقع پر اس حدیث پر غور کرنا ضروری ہے تاکہ تحصیل علم کو ہم ایک عبادت سمجھیں، ہمارا اسکول ہی ہمارا چین ہے جو خوش قسمتی سے قریب بھی ہے اور آرام دہ بھی، آخر میں آپ کو علامہ اقبال کا وہ قول یاد دلاؤں گا جو انھوں نے لندن میں ۱۹۳۲ء میں مسلم طلباء سے کہا تھا کہ علم حاصل کرو اور علم پیدا بھی کرو۔

شکریہ

ہمسائے کے حقوق احادیث کی روشنی میں

(ایک مکالمہ)

شاگرد: حدیث کی ایک کتاب میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ ایسا شخص جس کے شر سے اس کے پڑوسی محفوظ نہ ہوں جنت میں داخل نہیں ہوگا میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ہم طلبا کے لیے اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟

استاد: ہمارے لیے اس حدیث میں ہدایت کی روشنی ہے مثلاً وہ طلبا ہی جو ایک ساتھ ہوسٹل میں رہتے ہیں ایک دوسرے کے پڑوسی نہیں بلکہ سارے اسکول کے لڑکے ایک دوسرے کے بھائی اور پڑوسی ہیں۔ اسی مضمون کی ایک اور حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے بھی روایت کی گئی ہے، وہ حدیث یہ ہے کہ رسول اکرم نے فرمایا:

"خدا کی قسم وہ ایمان نہیں رکھتا، خدا کی قسم وہ ایمان نہیں رکھتا۔"

پوچھا گیا۔

یارسول اللہ کون ایمان نہیں رکھتا۔

فرمایا

"وہ جس کا پڑوسی اس کی ایذا رسانی سے بچا ہوا نہ ہو۔"

شاگرد: شر سے محفوظ ہونے یا ایذا رسانی سے بچنے کا کیا مطلب ہے؟

استاد: اسکول کے حوالے سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعض لڑکے دوسرے لڑکوں کو تنگ کرتے ہیں۔ ان کے خلاف جھوٹی شکایتیں کرتے ہیں یا دوسروں کے بُرے بُرے نام رکھتے ہیں، یا ان کی کسی خامی یا ناکامی کا مذاق اڑاتے ہیں یا ان کے والدین پر طنز کرتے ہیں۔ یہ سب ایذا رسانی کی مثالیں ہیں۔ ایسا لڑکا جو اپنے ساتھیوں کو تکلیف پہنچائے، ان کا دل دکھائے یا ان پر جھوٹا الزام لگائے یا کسی کی

تمہیں چین تک جانا پڑے۔

جناب والا!

اس حدیث کے بغور مطالعہ سے تین نکتے نکلتے ہیں۔ اوّل یہ کہ حصول علم کے لیے جتنی زحمت و مشقت اٹھانی پڑے، اٹھانا چاہیئے۔ چین اس زمانے کی معلوم دنیا کا بعید ترین ملک تھا۔ جہاں تک پہنچنا مشکل ترین مسئلہ تھا اس کے باوجود چین تک جانے کی ہدایت کی گئی۔

دوسرے یہ کہ اس میں غیر مذہبی سائنسی اور فنی علوم کے حصول کو اتنی اہمیت دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن و حدیث کا مرکز تو مکہ مدینہ تھے اگر حصول علم کے لیے چین تک جانے کو کہا گیا ہے۔ تو یقیناً یہ علم محض دینی علم نہیں ہو سکتا۔

غور فرمایئے، چین اس وقت تک اسلام کی روشنی سے فیض یاب نہیں تھا۔ وہاں کی زبان بھی عربی نہیں تھی۔ وہاں کے استاد بھی مسلمان نہیں ہو سکتے تھے۔ اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ یہی کہ سائنسی و فنی علوم کا مطالعہ کرنا غیر ملکی زبان سیکھنا، غیر مسلم استادوں سے پڑھنا اور غیر مسلموں کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھنا سب جائز بلکہ نہایت ضروری ہے۔

حاضرین گرامی!

آج اس مبارک تقریب کے موقع پر اس حدیث پر غور کرنا ضروری ہے تاکہ تحصیل علم کو ہم ایک عبادت سمجھیں، ہمارا سکول ہی ہمارا چین ہے جو خوش قسمتی سے قریب بھی ہے اور آرام دہ بھی، آخر میں آپ کو علامہ اقبال کا وہ قول یاد دلاؤں گا جو انہوں نے لندن میں ۱۹۳۲ء میں مسلم طلباء سے کہا تھا کہ علم حاصل کرو اور علم پیدا بھی کرو۔

شکریہ

ہمسائے کے حقوق احادیث کی روشنی میں

(ایک مکالمہ)

شاگرد : حدیث کی ایک کتاب میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ ایسا شخص جس کے شر سے اس کے پڑوسی محفوظ نہ ہوں جنت میں داخل نہیں ہوگا میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ہم طلبا کے لیے اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟

استاد : ہمارے لیے اس حدیث میں ہدایت کی روشنی ہے مثلاً وہ طلبا ہی جو ایک ساتھ ہوسٹل میں رہتے ہیں ایک دوسرے کے پڑوسی نہیں بلکہ سارے اسکول کے لڑکے ایک دوسرے کے بھائی اور پڑوسی ہیں۔ اسی مضمون کی ایک اور حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے بھی روایت کی گئی ہے، وہ حدیث یہ ہے کہ رسول اکرم نے فرمایا:

"خدا کی قسم وہ ایمان نہیں رکھتا، خدا کی قسم وہ ایمان نہیں رکھتا۔"

پوچھا گیا۔

یارسول اللہ کون ایمان نہیں رکھتا۔

فرمایا

"وہ جس کا پڑوسی اس کی ایذارسانی سے بچا ہوا نہ ہو۔"

شاگرد : شر سے محفوظ ہونے یا ایذا رسانی سے بچنے کا کیا مطلب ہے؟

استاد : اسکول کے حوالے سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعض لڑکے دوسرے لڑکوں کو تنگ کرتے ہیں۔ ان کے خلاف جھوٹی شکایتیں کرتے ہیں یا دوسروں کے بُرے بُرے نام رکھتے ہیں، یا ان کی کسی خامی یا ناکامی کا مذاق اڑاتے ہیں یا ان کے والدین پر طنز کرتے ہیں۔ یہ سب ایذارسانی کی مثالیں ہیں۔ ایسا لڑکا جو اپنے ساتھیوں کو تکلیف پہنچائے، ان کا دل دکھائے یا ان پر جھوٹا الزام لگائے یا کسی کی

کاپی یا کتاب غائب کرے یا جان بوجھ کر دوسروں کو آرام نہ کرنے دے یا پڑھنے کے وقت پڑھنے نہ دے ایسا لڑکا خدا اور رسولؐ کی نافرمانی کرتا ہے وہ دنیا اور آخرت میں نقصان اٹھائے گا۔ آخرت کی پاداش کے بارے میں تو صاف حدیث موجود ہے۔ عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن جن دو آدمیوں کا مقدمہ سب سے پہلے پیش ہوگا۔ وہ دو پڑوسی ہوں گے۔

یعنی وہ ساتھی ہمسائے جنھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہو یا کوئی حق مارا ہو، جس کا ہمسایہ اس کے شر سے محفوظ نہ ہو، اس کی عبادت بھی بیکار جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بہت واضح حدیث بھی ہے۔

شاگرد کون سی؟

استاد حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی پاک کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا یا رسول اللہ ایک عورت بہت زیادہ نفل پڑھتی ہے، نفلی روزے رکھتی ہے اور صدقہ کرتی ہے اور اس لحاظ سے وہ بہت مشہور ہے لیکن اپنے ہمسائے کو زبان سے تکلیف پہنچاتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ اس آدمی نے پھر عرض کیا:

یا رسول اللہؐ ایک عورت کے بارے میں مشہور ہے کہ کم نفل پڑھتی ہے کم نفلی روزے رکھتی ہے، صرف پنیر کے کچھ ٹکڑے بطور صدقہ دیتی ہے لیکن اس کے پڑوسی اس کی زبان سے محفوظ ہیں۔

آپ نے فرمایا ایسی عورت جنت میں جائے گی۔

اس حدیث سے صاف ظاہر ہوا کہ جو شخص بندوں کے حقوق ادا نہ کرے۔

اس کی عبادت بھی قبول نہیں ہوتی۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرتؐ نے ہمسائے یعنی ساتھی کے ساتھ احسان کا رویہ اختیار کرنے کی سخت تاکید کی ہے۔ رسول کریمؐ نے فرمایا:

جس شخص کو یہ پسند ہو کہ خدا اور اس کے رسولؐ اس سے محبت کریں۔ تو اسے چاہیئے کہ وہ بولے تو سچ بولے، امانت میں خیانت نہ کرے اور اپنے پڑوسیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے۔

شاگرد لیکن بُرے ہمسائے یا ساتھی کو دنیا میں سزا کیسے ملے گی؟

استاد بُرا ہمسایہ یا ساتھی وہ ہوتا ہے جو خود غرض ہو، تنگ دل ہو، کم نظر ہو جو انصاف نہ کر سکے، جو احسان نہ کر سکے، جس میں ہمدردی کی کمی ہو، جو دوسروں کو نقصان یا تکلیف پہنچا کر خوش ہوتا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسے آدمی یا لڑکے کی نہ کوئی عزت کرے گا۔ نہ محبت کرے گا، نہ ہمدردی کرے گا جب وہ خود کسی کے کام نہیں آتا تو کوئی اور کیا اس کے کام آئے گا اس کی برائی، خود غرضی، تنگ دلی دیر سویر خود اس کو لے ڈوبے گی۔ یہی اس کی سزا ہے۔ سچ ہے کہ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

رمضان کا پس منظر

رمضان کے روزے ہجرت کے دوسرے سال مدینہ میں فرض ہوئے۔ روزوں کی فرضیت کا موقع بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مسلمان تعداد میں کم تھے، بے سروسامان تھے، مادی وسائل سے محروم تھے، لیکن بہت جلد انہیں غیر اسلامی قوتوں سے ٹکرانا تھا اور اسلامی قدروں کو دنیا میں پھیلانا تھا۔ قیادت اور امامت کے اس اصلاحی مشن کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کو مضبوط اور ناقابل تسخیر بنایا جائے چونکہ اصل طاقت اخلاقی ہوتی ہے اور

اصل مضبوطی کردار کی مضبوطی ہوتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزوں کے ذریعے سے مسلمانوں کو اخلاقی اعتبار سے مضبوط اور توانا بنایا۔ سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے انسان کا سب سے بڑا دشمن اس کا نفس ہے۔ روزہ اندرونی شیطان کو زیر کرنے کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ ضبط نفس کی تربیت کے لیے روزے سے بڑھ کر اور کوئی تربیت نہیں ہے۔ روزے کے لیے عربی کا لفظ صوم ہے۔ جس کے لفظی معنی کسی شئے سے رک جانے اور اس کو ترک کر دینے کے ہیں۔ عرب میں گھوڑوں کو بھوک، پیاس اور تیز ہوا کا عادی بنایا جاتا تھا اس کو بھی صوم کہتے تھے۔ روزہ سخت کوشی اور جفاکشی کی تربیت حاصل کرنے کی سب سے قدیم صورت ہے۔ اور یہ سخت کوشی زندگی میں فلاح اور سرفرازی کی کنجی ہے اقبال کا شعر ہے۔

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

روزہ اور احادیث نبوی ؐ

شعبان کی آخری تاریخ رسول اللہ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

"اے لوگو! ایک بڑی عظمت والا، بڑی برکت والا مہینہ قریب آگیا ہے وہ ایک مہینہ ہے جس کی ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ میں روزہ رکھنا فرض قرار دیا ہے اور اس مہینے کی راتوں میں تراویح پڑھنا سنت کر دیا ہے یہ صبر کا مہینہ ہے جس کا بدلہ جنت ہے یہ حاجت مندوں کی امداد کرنے کا مہینہ ہے۔

صحیح بخاری اور مسلم میں ہے کہ آنحضرت ؐ نے فرمایا:

روزہ ڈھال ہے اور جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو وہ اپنی زبان سے بری بات نہ نکالے، گالی نہ دے، ہنگامہ بدتمیزی نہ کرے اور لڑائی جھگڑے سے پرہیز کرے۔"

حضرت ابوہریرہ رضہ سے صحیح بخاری میں روایت ہے کہ رسول صلعم نے فرمایا:
"جو شخص روزے کے باوجود بُری باتیں کرنے سے باز نہ آئے تو اللہ کو اس کے بھوکا پیاسا رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"
روزہ ڈھال ہے، شیطان کے اثر سے بچنے کے لیے، نفس کی ترغیبات کا مقابلہ کرنے کے لیے۔

روزے کے اثرات جسم و جاں پر

صدرِ مجلس: حضرات!
بعض لوگ جو روزے کی حکمتوں سے واقف نہیں۔ اکثر یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ روزے سے انسان کی جسمانی اور ذہنی کارکردگی متاثر ہوتی ہے اس مذاکرے کا موضوع یہی مسئلہ ہے روزے کا اثر کارکردگی پر کیا ہوتا ہے بلکہ کیا ہونا چاہیے اگر روزے کو روزے کی طرح رکھا جائے۔
میں بشیر سے درخواست کروں گا کہ وہ بحث کا آغاز کریں۔

بشیر: کارکردگی یا الفی شنسی کا تعلق جسمانی توانائی سے بھی ہے اور ذہنی رویوں اور قدروں سے بھی، وہی شخص زیادہ کام اور بہتر کام کرسکتا ہے جو نہ صرف ضروری جسمانی توانائی اور ذہنی صلاحیت رکھتا ہو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ دل سے کام کرنا بھی چاہتا ہو اس کی قوت ارادی بھی اتنی مضبوط ہو کہ وہ رکاوٹوں اور خواہشوں کی پروا نہ کرتے ہوئے جم کر محنت سے کام کرسکے۔
روزہ ایک ایسی عبادت ہے جو تقوای، ضبط نفس اور صبر کی تربیت دینے کے لیے ہے۔ تقوای کا تعلق اخلاق و کردار سے ہے۔ تقوای سے ہی ضبط نفس کی کی تربیت ملتی ہے اور جسمانی صحت، تاب و توانائی کا تعلق بھی بڑی حد تک

ضبطِ نفس سے ہے جسے اپنے نفس پر قابو ہوگا اس کی جسمانی اور ذہنی صحت یقیناً بہتر ہوگی اس میں زیادہ توانائی اور قوتِ برداشت ہوگی اور جس میں زیادہ توانائی اور قوتِ برداشت ہوگی وہ زیادہ کام کر سکے گا۔ چونکہ روزے سے رویئے اور قدریں بہتر ہوتی ہیں اس لیے ایسے آدمی کا کردار اخلاق بھی بہتر ہوگا تو اصولاً روزہ کو روزے کی طرح رکھنے سے انسان کی کارکردگی بڑھنی چاہیئے۔

صدرِ مجلس: لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ روزہ رکھنے سے انسان کی جسمانی قوت میں کچھ کمی آجاتی ہے۔

بشیر دیکھئے کسی دوا یا تربیت یا ریاضت، کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے وقتی اثرات و نتائج سے نہیں بلکہ مستقل اور پائدار، دیرپا اثرات سے لگایا جاتا ہے۔

روزے کی افادیت یا مضرت کا انحصار صرف اس بات پر نہیں کہ روزے کا اثر رمضان کے مہینے میں انسان پر کیا ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ روزے رکھنے کا اثر سال کے باقی گیارہ مہینوں میں کیا ہوتا ہے بلکہ ساری زندگی پر کیا ہوتا ہے۔ روزے کو روزے کی طرح رکھا جائے تو اس ضبطِ نفس اور تقوے کی تربیت و ریاضت سے روزے دار کی تمام زندگی سارے سال ضبط و نظم، توازن، اعتدال سے ہمکنار ہوگی۔ اس کی عادتیں بھی صالح ہوں گی۔ نتیجتہً روزہ دار کی کارکردگی بحیثیت مجموعی زیادہ بھی ہوگی اور بہتر بھی ہوگی۔ ضبط اور نظم کا پابند آدمی کام زیادہ بھی کرتا ہے اور اچھا بھی کرتا ہے کامیاب زندگی کا ایک بنیادی اصول ضبطِ نفس ہی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو اپنے ارادے کی لگام اپنے ہاتھ میں رکھنا سب سے زیادہ مشکل ہے اور یہ کام روزے سے آسان ہوتا ہے۔

صدرِ مجلس رفیق صاحب! آپ اس موضوع پر روشنی ڈالنا پسند کریں گے۔

رفیق روزے کے دنوں میں جسم کچھ متاثر ضرور ہوتا ہے لیکن عارضی طور پر اصل میں

صحیح روزے سے جسمانی صحت بہتر ہوتی ہے جس طرح بھٹی میں تپانے سے سونا کندن بنتا ہے اس طرح روزے سے جسم بھی نکھرتا اور سنورتا ہے۔

علیم
میں اس بات کی وضاحت کی اجازت چاہتا ہوں۔ روزے کے لیے عربی میں صوم کا لفظ ہے۔ یہ لفظ ان گھوڑوں کیلئے بھی استعمال ہوتا تھا جن کو جوان ہونے پر جنگ کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ اس صوم کا طریقہ یہ تھا کہ بتدریج ان گھوڑوں کا چارہ پانی کم کیا جاتا اور آہستہ آہستہ انہیں صحرا کی تیز و تند ہواؤں کا عادی بنایا تھا۔ اس تربیت سے ان کے بدن بھاگ دوڑ کے لیے سبک نکل آتے اور وہ میدان جنگ اور صحرائی زندگی کی سختیوں، بھوک پیاس کی مشقتوں کو برداشت کرنے کے قابل ہو جاتے۔

ظاہر ہے کہ جنگی گھوڑوں کو صوم کی سختی سے اس لیے نہیں گزارا جاتا تھا کہ اس سے ان کی کارکردگی کم ہو جائے، اس کا واضح مقصد یہ تھا کہ ان کی تگ و تاز کی صلاحیت میں اضافہ ہو جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شروع میں تھان پر بندھے چارہ کھانے والے آرام کے عادی گھوڑوں پر اس تربیت کا فوری اثر اچھا نہیں ہوتا تھا۔ چربی اتر جاتی تھی بظاہر وہ کمزور نظر آتے تھے اور قدرے کمزور ہو بھی جاتے تھے۔ لیکن تربیت دینے والے کی نظر تو اس تربیت کے دوررس نتائج پر ہوتی تھی۔

نعیم
یہی صوم وہ روزہ ہے جو اسلام نے مسلمانوں کی ظاہری اور باطنی تربیت کے لیے فرض کیا ہے اس سے ان کی صلاحیت کار کو کم کرنا مقصود نہیں بلکہ اس کا مقصد ان کی کارکردگی کو صبر اور تقوی کی بنیاد پر زیادہ سے زیادہ مستحکم کرنا ہے۔ تاکہ ان کی جسمانی قوت برداشت اور قوت ارادی مضبوط ہو۔ ان کا دل توانا اور روح بالیدہ ہو اور وہ جہاد زندگانی اور جہاد فی سبیل اللہ

کے لیے پوری طرح تیار ہو جائیں۔

صدر مجلس: بہت خوب۔ آپ نے بہت اچھے نکتے پیدا کیے۔ گویا روزہ ایک ذریعہ ہے ایک اعلیٰ تر مقصد کے حصول کا، خود مقصود بالذات نہیں اور وہ مقصد ہے صبر و تقویٰ کی زندگی۔ جہاد زندگانی اور جہاد فی سبیل اللہ کیلئے تیاری۔ اب میں نسیم سے درخواست کروں گا کہ وہ اس موضوع پر اظہار خیال کریں۔

نسیم: روزے کا مقصود کام ہے، کام سے بچنا نہیں، ایک حدیث ہے کہ ایک بار حضور اکرمؐ مدینے سے کسی سفر پر نکلے۔ رمضان کے دن تھے کچھ دور جا کر پڑاؤ کیا۔ کچھ صحابی کام کاج میں لگ گئے اور کچھ چھاؤں تلے بیٹھ کر آرام کرنے لگے۔ آپ نے پوچھا یہ کیوں بیٹھے ہیں؟ جواب ملا روزے سے ہیں۔ آپ نے فرمایا: آج کے دن بے روزے دار، روزے داروں سے بڑھ گئے۔ سفر میں روزہ مباح تھا۔ لیکن کام فرض، اس سے ظاہر ہوا کہ روزے کی آڑ لے کر اپنے فرض میں کوتاہی کرنا جائز نہیں۔

اسی طرح ایک سفر کے موقع پر ایک شخص بدحال ہو کر گر پڑا اور اس کے گرد لوگ جمع ہو گئے۔ نبی کریم صلعم نے یہ دیکھ کر دریافت فرمایا۔ کیا معاملہ ہے؟ عرض کیا گیا کہ یہ شخص روزے سے ہے آپ نے ارشاد فرمایا بہتر تھا کہ یہ روزہ نہ رکھتا تاکہ دشمن سے لڑنے میں کمزوری لاحق نہ ہوتی۔

ان حدیثوں اور روایتوں سے ظاہر ہوا کہ روزہ ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے، مقصد بالذات نہیں۔ اصل چیز جہاد زندگانی ہے۔

روزہ یا صوم ضبط نفس کی ریاضت ہے، تقوے کی تربیت ہے۔ صحیح رویوں اور قدروں کو مستحکم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ روزے سے بحیثیت مجموعی انسان کی کارکردگی بڑھتی ہے گھٹتی نہیں۔ جہاد زندگانی میں یہ مومن کی آبدار شمشیر ہے۔

پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں

(صحاح ستّہ پر مذاکرہ)

س : صحاح ستّہ سے کیا مراد ہے؟

ج : صحیح کی جمع صحاح ہے۔ ستّہ، چھ۔

حدیث کی چھ مستند کتابیں صحاح ستہ کہلاتی ہیں۔

س : ان کے نام کیا ہیں؟

۴ ج : بخاری، مسلم، ترمذی، ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ۔

حدیث کی کتابوں کے یہ نام ان کے مؤلفوں کے نام پر ہیں اور ان میں سے ہر کتاب کو احتراماً شریف کے لفظ کے ساتھ پکارا جاتا ہے جیسے بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف وغیرہ۔

س : ان میں کچھ فرق ہے؟

ج : ان چھ میں سے بخاری اور مسلم کو زیادہ اہمیت حاصل ہے ان کو صحیحین کہا جاتا ہے۔

س : صحیحین کا کیا مطلب ہے۔

ج : دو صحیح کتابیں۔

س : کوئی اور فرق بھی ہے۔

ج : بہت نازک فرق ہے۔ مثلاً ایک اصول ترتیب کے لحاظ سے ہے بخاری و مسلم حدیثوں کا بنیادی ذخیرہ ہیں۔ ان کے ماخذ اور راوی زیادہ مستند اور معتبر ہیں۔ حدیثوں کے باقی چار مجموعے فقہی مسائل کے لحاظ سے ترتیب دیئے گئے ہیں انہیں سنن کہتے ہیں۔

س سنن سے کیا مراد ہے؟

ج : سنن، سنت کی جمع ہے۔ ترمذی شریف کو سنن ترمذی اور ابوداؤد کو سنن ابوداؤد کہتے ہیں۔ اسی طرح سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ۔

س : حدیث کسے کہتے ہیں۔

ج : حدیث کے لفظی معنی بات کے ہیں۔ اصطلاح میں حدیث ان باتوں کو کہتے ہیں جو حضور نے خود کیں اور دوسروں کو کرنے کا حکم دیا۔ صحابہ کو جو کچھ کرتے دیکھا اور اسے پسند فرمایا۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضور کا ہر فعل سنت ہے اور ہر قول حدیث۔

س : کچھ بخاری شریف کے بارے میں بتائیے۔

ج : بخاری شریف کے مؤلف کا نام امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل تھا۔ ۸۱۰ء میں بخارا میں پیدا ہوئے۔ اسی نسبت سے امام بخاری کہلاتے ہیں اور ان کی ترتیب دی ہوئی حدیث کی کتاب کا نام بخاری شریف ہے۔ یہ دو جلدوں میں ہے۔ امام بخاری نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے چند ہزار حدیثیں چھانٹ کر اپنی کتاب میں جمع کی ہیں۔ خود امام بخاری نے اپنی کتاب کا نام الجامع الصحیح رکھا تھا۔

س : بخاری شریف کی دو ایک حدیثیں سنائیے۔

ج : بہادر وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔

سب سے پسندیدہ شخص وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں۔

شرم و حیا ایمان کا حصہ ہے۔

س : کچھ مسلم شریف کے بارے میں بتائیے۔

ج : مسلم شریف کے مرتب کا نام امام مسلم ہے۔ یہ خراسان کے شہر نیشاپور میں ۸۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ ۳ لاکھ حدیثوں میں سے ۴ ہزار منتخب کیں۔

بخاری اور مسلم کو ملا کر صحیحین کہا جاتا ہے اور ایسی حدیث کو جو دونوں میں ہو متفق

علیہ کہتے ہیں۔

س : کوئی متفق علیہ حدیث سنائیے :

ج : مثلاً غصے کو ضبط کرنے کی فضیلت کے بارے میں حدیث دونوں میں ہے۔ اسے متفق علیہ کہا جائے گا۔

س : مسلم شریف کی کوئی خاص حدیث سنائیے ؛

ج : جو شخص نیک مثال قائم کرے گا اسے اپنا اجر بھی ملے گا اور اس مثال پر عمل کرنے کی نیکی بھی۔ اسی طرح گناہ کے نتائج کا معاملہ ہے۔

س : کوئی اور حدیث

ج : اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو

س : ترمذی شریف کے بارے میں کچھ بتائیے :

ج : ترمذی کو سنن ترمذی کہتے ہیں۔ اس کے مؤلف کا نام امام ابو عیسےٰ محمد بن عیسےٰ ہے جو ۸۳۱ء میں ترمذ میں پیدا ہوئے۔ اس لیے کتاب کا نام سنن ترمذی مشہور ہوا۔

س : سنن ترمذی کی کوئی خاص حدیث سنائیے۔

ج : اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور جسموں کو نہیں دیکھتا۔ بلکہ اس کی نظر تمہارے دلوں اور نیتوں پر ہے۔ تب اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ؛ نیکی کا گھر یہ ہے۔ اسے آپ نے تین بار دہرایا سنن ابوداؤد پر کچھ روشنی ڈالیئے ؟

اس کے مؤلف کا نام سلیمان بن اشعث ہے۔ کنیت ، ابو داؤد ہے ۸۲۴ء میں سیستان میں پیدا ہوئے۔

س : سنن ابوداؤد کی کوئی حدیث ؟

ج : انسان کے کاموں کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

س : نسائی شریف کے بارے میں کچھ بتائیے۔

ج : سنن نسائی کے مؤلف کا نام احمد بن شعیب تھا۔ خراسان کے شہر نساء میں ۲۳۶ھ
میں پیدا ہوئے۔

س : نسائی شریف کی کوئی اہم حدیث؟

ج : مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

س : سنن ابن ماجہ کے بارے میں کچھ بتائیے؟

ج : سنن ابن ماجہ کے مؤلف کا نام ابو عبداللہ محمد بن یزید بن عبداللہ ابن ماجہ تھا۔ ماں کا
نام ماجہ تھا۔ اس لیے ابن ماجہ کہلائے۔

س کوئی خاص حدیث۔

ج : اے اللہ! مجھے جو کچھ علم دیا ہے، اسے نفع بخش بنا۔

یہاں یہ بھی یاد رہے کہ بعض عالموں نے امام مالک کی کتاب مؤطا کو حدیث کی چھٹی
مستند کتاب قرار دیا ہے۔ لیکن زیادہ کا اتفاق ابن ماجہ پر ہے۔

خطبۂ حجۃ الوداع

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری حج کے موقعہ پر فرمایا۔

۱۔ لوگو! تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں اسی طرح محترم ہیں جس طرح یہ
دن، اس مہینے میں، اس شہر میں محترم ہیں۔

۲۔ خبردار! میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔ تمہیں خدا کے
سامنے حاضر ہونا ہے۔ وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس کرے گا۔

۳۔ لوگو! جاہلیت کی ہر بات کو میں اپنے قدموں کے نیچے پامال کرتا ہوں۔ جاہلیت
کے تمام خون کے جھگڑے باطل کر دیئے گئے۔ سب سے پہلے (میں اپنے خاندان کے) ربیعہ
بن الحارث کا خون معاف کرتا ہوں۔

۴۔ جاہلیت کے زمانے کا سود ختم کر دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے میں اپنے خاندان کے
عباس بن عبد المطلب کا سود چھوڑتا ہوں۔
۵۔ عورتوں کے بارے میں خدا سے ڈرو۔ تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔
۶۔ لوگو! میں تم میں وہ چیزیں چھوڑ چلا ہوں کہ اگر تم اسے مضبوطی سے پکڑ لوگے تو کبھی
گمراہ نہ ہوگے، وہ اللہ کی کتاب اور میری سنت ہے۔
۷۔ لوگو! نہ میرے بعد کوئی پیغمبر ہے اور نہ کوئی امت۔
۸۔ خوب سن لو! تم اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔ پانچ وقت کی نماز ادا کرو۔ سال بھر
میں ایک ماہ کے روزے رکھو اور میرے احکام کی اطاعت کرو، تم اپنے رب کی جنت
میں داخل ہوگے۔
۹۔ لوگو! بلاشبہ تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر، سُرخ
کو سیاہ پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقویٰ کی بنا پر۔
۱۰۔ ہر قرض ادا کیا جائے۔ ادھار چیز واپس کی جائے، ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے۔
۱۱۔ اگر کوئی نک کٹا، سیاہ فام غلام بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے اور وہ تم کو خدا کی کتاب
کے مطابق لے چلے تو اس کی فرمانبرداری کرو۔

باب ہفتم

دانشکدہ

تقریر کا فن

قدیم یونان میں فن تقریر کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی۔ اس زمانے کے مشہور فلسفی سقراط، افلاطون اور ارسطو فن خطابت کے بھی ماہر تھے۔ قدیم رومیوں کی خطابت کے نمونے شیکسپیئر نے اپنے ڈرامے جولیئس سیزر میں محفوظ کر دیئے ہیں۔ عربوں نے بھی بڑے نامور خطیب پیدا کیے۔ انہیں اپنی خطابت پر اتنا ناز تھا کہ باقی سارے جہان کو عجم (گونگا) کہتے تھے۔ قانون دان، سیاست دانوں مصلحوں اور معلموں کے لیے ہمیشہ سے تقریر کے فن میں مہارت حاصل کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

سر سید احمد خان، ڈپٹی نذیر احمد، شبلی، مولانا محمد علی جوہر، ظفر علی خاں اور قائداعظم محمد علی جناح سب اعلیٰ درجے کے مقرر بھی تھے۔ پاکستان کے تصور کو ایک زبردست تحریک بنانے میں نواب بہادر یار جنگ جیسے مقرروں نے بڑا حصہ لیا۔ پاکستان کے پرجوش حامیوں کی تقریروں نے مسلمان، عوام کے دلوں میں آگ لگا دی اور پاکستان کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دینے پر انہیں آمادہ کیا۔

اگر کسی کو وکیل یا سیاسی لیڈر نہ بننا ہو تو بھی ایک مجمعے کے سامنے بغیر جھجکے، اعتماد کے ساتھ موثر انداز میں تقریر کر سکنا اور اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرنا اور دوسروں کو ہم خیال بنا سکنا بھی کم اہم نہیں۔

لیڈر شپ یا قیادت کے لیے تقریر کے فن میں مہارت حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ چونکہ لیڈر شپ یا قیادت کا راز یہ ہے کہ آپ دوسروں کو ہم خیال بنائیں۔ انہیں اپنے خیالات سے متاثر کریں اور اپنے جوش اور اعتماد سے ان کے اندر جوش اور اعتماد پیدا کریں۔ تاکہ وہ آپ کی قیادت میں صحرا و دریا کو اپنی ٹھوکر سے دو نیم کرنے پر تیار ہو جائیں۔ جنگ ہو یا امن الفاظ کم کام نہیں آتے۔ الفاظ کے

پیچھے خیالات ہوتے ہیں اور جذبات کی چنگاریاں ہوتی ہیں۔ اگر الفاظ سے مہارت اور ذہانت سے کام لیا جائے تو ان کی کاٹ تلوار سے زیادہ ہوتی ہے۔

بحیثیت طالب علم کے جہاں اور بہت سی چیزیں تمہیں سیکھنا ہیں ان میں سر فہرست اردو انگریزی میں تقریر کر سکنے کی تھوڑی بہت مشق ہے۔ تقریر ایک مشکل فن ہے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کے لیے خاص صلاحیت، شوق اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے فی الحال نہ تمہیں سیاستدان بننا ہے نہ پیشہ ور مقرر، تمہیں فن تقریر میں کچھ شُدبُد ہونی چاہیئے تاکہ بڑے ہو کر تعلیم یافتہ شہری کی حیثیت سے مختلف موقعوں پر تم اپنے خیالات کا اظہار بغیر جھجکے اعتماد سے اور خوش اسلوبی سے کر سکو۔ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھتے ہو، لکھ لینا آسان ہے۔ آپس میں باتیں کر لینا بہت آسان ہے لیکن دوسروں کے سامنے کسی موضوع پر منطقی انداز میں بغیر جھجکے موثر تقریر کر سکنا بہت مشکل کام ہے۔ لوگ اچھا خاصا لکھ پڑھ لیتے ہیں لیکن ان سے تقریر کرنے کے لیے کہا جائے تو ان کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔

اچھی تقریر کرنے کا تعلق مشق سے بھی ہے اور عادت سے بھی، بغیر مشق، مہارت اور اعتماد کے تقریر کرنا ممکن نہیں۔ تقریر سیکھنے کا صحیح وقت یہ ہے جس سے تم گزر رہے ہو۔ اگر تم نے ذرا سا جی لگا کر اور طبیعت پر زور ڈال کر تقریر کرنا سیکھ لیا تو زندگی بھر اس کا پھل کھاؤ گے اگر تم زندگی میں کوئی بھی اہم پوزیشن حاصل کرنا چاہتے ہو۔ خواہ سول میں ہو یا فوج میں اس میں تقریر کا ہنر بہت کام آئے گا اور تمہاری بہت سی کامیابیوں کی سیڑھی بن جائے گا۔

لیکن تقریر ایک پیچیدہ فن ہے۔ اس کے لیے شوق اور ریاضت چاہیئے۔ وسیع اور گہرے مطالعے کی عادت اور سوچنے اور فکر کرنے کی عادت چاہیئے۔ یہ بعد کی باتیں ہیں۔ خدا تمہیں حوصلہ اور توفیق دے یا کبھی ضرورت پیش آئے تو اس فن میں کمال حاصل کرنے کی کوشش بھی کر لینا۔ فی الحال تم فن تقریر کی الف، ب سیکھو۔ سیدھی اور بیضوی لکیریں تو کھینچو۔ تصویر بنانا بھی آجائے گا۔

تقریر کا اصل مزہ تو یہ ہے کہ خود سوچو، خود لکھو اور خود برجستہ بولو۔ اس طرح کہ سننے والوں کو ہنسانا چاہو تو ہنسا دو، رلانا چاہو تو رلا دو۔ ان کے خیالات کے دھارے کو بدلنا چاہو تو بدل دو۔ یہ بعد کی منزل ہے۔ فی الحال تم لکھی ہوئی تقریروں کو یاد کرکے صرف ادائیگی کی مشق کرو۔

اگر تمہیں بغیر جھجک اعتماد کے ساتھ موثر انداز میں لوگوں کے سامنے تقریر کرنا آجائے تو بہت ہے۔ یہ کام بھی اتنا آسان نہیں ہے۔ جتنا شروع میں نظر آتا ہے۔ اس کتاب کی تقریروں ہی کو بنیاد بنا کر بسم اللہ تو کرو۔

کسی کام میں بھی کامیابی حاصل کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس کام کی اہمیت اور افادیت کا پکا یقین ہونا چاہیئے۔ پھر پکا ارادہ ہونا چاہیئے۔ اس کام کو کرنے کا عزم اس کے بعد اپنے اوپر اعتماد کہ میں یہ کام کامیابی سے کر لوں گا۔ یہ تین درجے ذہنی تیاری اور آمادگی کے ہیں اب اگر تم واقعی تقریر کرنا چاہتے ہو تو تمہیں یقین ہونا چاہیئے کہ تقریر کا فن زندگی کی ہر منزل میں تمہارے بہت کام آئے گا۔ اس یقین کے بعد اس پختہ عزم سے قدم اٹھاؤ کہ تم تقریر کرنا سیکھ کر دم لوگے، پھر یہ بھی اعتماد رکھو کہ تمہارے اندر ایک اچھا مقرر بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ یاد رکھو مشق و محنت سے اوسط درجے کا طالب علم اچھا مقرر بن سکتا ہے۔ یاد رکھو تقریر ہو یا کوئی اور فن اس میں نکھار ریاض سے آتا ہے جو گانا تم دو منٹ میں سن لیتے ہو اور جھوم جاتے ہو اس کے لیے موسیقار نے برس ہا برس ریاض کیا ہو گا اور خاص اس گانے کے لیے کئی دن اور بیسیوں گھنٹے صرف کیے ہوں گے۔ یہی حال مصوری کا ہے۔ یہ بھی برسوں کی مشق کا کام ہے اس میں بھی رنگ خون جگر سے آتا ہے۔ تقریر کرنا سیکھنے کے لیے تم مسلسل اور متواتر مشق کے لیے تیار ہو جاؤ۔

۱۔ لکھے ہوئے مضمون کو بلند آواز سے پڑھنے کو تقریر نہیں کہتے پھر مضمون اور تقریر کی ساخت میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اصل تقریر تو برجستہ ہی ہوتی ہے۔ خیالات ذہن میں

ہوں اور الفاظ زبان پر، تم مبتدی ہو، تمھارے لیے پہلا قدم ہے کہ تم لکھی ہوئی تقریر کو زبانی یاد کرو۔

۲۔ یاد کرنے سے پہلے کسی ماہر زبان کو پڑھ کر سنا دو اور بہت توجہ سے تلفظ کی غلطیاں درست کر لو۔

۳۔ سیکھنے والے اچھے سے اچھے لڑکوں کی سب سے بڑی خامی یہ ہوتی ہے کہ وہ بہت تیز بولتے ہیں آواز کو بلند رکھو۔ لیکن اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر بولو۔ جس طرح تم روزانہ کی گفتگو کرتے ہو۔ باتیں کرتے ہوئے کوئی ریل نہیں چھوٹتا۔ تقریر کرتے ہوئے زبان کو قینچی نہ بناؤ۔ اس کی تدبیر یہ کہ جہاں کم دیر ٹھہرنا ہو وہاں ایک ایسا (/) نشان لگا دو۔ جہاں زیادہ دیر ٹھہرنا ہو وہاں (//) نشان لگا دو۔ اور تقریر میں جہاں نیا پیرا شروع ہوتا ہے وہاں تین ایسے (///) نشان لگا دو۔ کیونکہ وہاں کافی ٹھہرنا ہے۔ چونکہ نئے پیرے سے بات بھی نئی شروع ہوتی ہے اس لیے وہاں لب و لہجہ بھی بدلو۔ اور جناب صدر وغیرہ بہت آہستہ سے کہو۔

۴۔ تقریر کے دوران آواز کا اتار چڑھاؤ۔ تقریر کی کامیابی کے لیے بہت ضروری ہے آواز کا اتار چڑھاؤ اور لب و لہجہ کی رنگا رنگی کا خاص خیال رکھو۔ اس سے تقریر میں تاثیر اور دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ مصور جو کام مختلف رنگوں سے اور مختلف قسم کی لکیروں سے لیتا ہے وہ کام تمہیں آواز کے اتار چڑھاؤ اور لب و لہجہ کی رنگا رنگی سے لینا ہے۔ تمھاری آواز کی لہریں سیدھی نہ ہوں اونچی نیچی ہوں اس لیے آواز کو کنٹرول کرنا سیکھو۔

۵۔ کبھی تم نے پنسل سے تصویر بنائی ہے یا کسی کو بناتے دیکھا ہے۔ پنسل اسکیچ بناتے وقت کس طرح پنسل کہیں گہری ہو جاتی ہے کہیں ہلکی۔ کہیں کہیں پنسل سے شیڈ بھی کیا جاتا ہے جس سے تصویر چمک اٹھتی ہے۔ تمہیں اپنی آواز سے یہی کام لینا ہے۔ آواز کو گہرا ہلکا کرنا سیکھو پھر آواز سے شیڈ دینے کی مشق کرو۔ تقریر کے سب فقرے اہم نہیں ہوتے یا ایک ہی جملے کا ایک حصہ اہم ہوتا ہے اس کی ادائیگی زور دے کر کرنی چاہیئے۔ ایسے

فقرے کے نیچے دو لکیریں = کھینچ دینی چاہئیں اور جو فقرے آواز پر زور دیئے بغیر ادا کرنے ہیں ان کے نیچے ایک لکیر کھینچ لو۔

۶۔ تقریر کی روانی میں فرق نہ آئے لیکن ہر لفظ کی ادائیگی بالکل واضح ہو اس طرح جیسے موتیوں کے ہار میں ہر موتی علیحدہ بھی ہوتا ہے اور ساتھ پرویا ہوا بھی ہے۔ الفاظ چبانا ناقابل معافی غلطی ہے۔

۷۔ آواز بلند ہو تاکہ ہال میں بیٹھا ہوا ہر شخص بآسانی سن لے۔ لیکن اتنی نہیں کہ مقرر کے لیے غیر فطری معلوم ہو۔ جھٹکے کے ساتھ بولنا یا چیخ کر بولنا ناپسندیدہ عادت ہے۔

۸۔ تقریر میں سارا کھیل ہی جذبے اور احساس کا ہے۔ اس لیے تقریر کو ٹھوس مضمون نہیں بنانا چاہیئے۔ تقریر سچے جوش اور جذبے سے کرنی چاہیئے۔ اگر تم خود سپاٹ اور جذبہ سے عاری لب ولہجہ میں تقریر کرو گے تو دوسروں پر کیا خاک اثر ڈالو گے۔

۹۔ مقرر کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات سے سامعین وناظرین براہِ راست متاثر ہوتے ہیں۔ خیال رکھو کہ تمہارا لب ولہجہ اور تمہارے چہرے کے تاثرات تمہارے الفاظ کے مفہوم کے ساتھ ساتھ بدلتے رہیں۔ ہاتھ کی جنبش سے بھی کام لو۔ لیکن ان کو اس طرح بار بار حرکت نہ دو کہ ان کی طرف توجہ منتقل ہو جائے۔

۱۰۔ روسٹرم کے پیچھے باوقار انداز سے کھڑا ہونا چاہیئے۔ روسٹرم پر جھومنا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالنا۔ بار بار سر کے بال سنوارنا یا منہ صاف کرنا یا کوئی ایسی حرکت کرنا۔ جس سے سامعین کی توجہ تقریر سے ہٹ جائے ایک ایسی خامی ہے جس سے پرہیز لازمی ہے۔

۱۱۔ بار بار صدر کو خطاب کرنا۔ یا صدر کی کرسی کی طرف زیادہ رُخ کر لینا غیر ضروری ہوتا ہے۔ جناب صدر وغیرہ کے الفاظ سر کے ہلکے سے اشارے سے اور نسبتاً آہستہ سے کہنا کافی ہوگا۔

۱۲۔ تقریر کے وقت موزوں لباس اور معقول وضع بھی ہونی چاہیئے۔

۱۳۔ اچھی تقریر کا راز زیادہ سے زیادہ ریہرسلوں میں ہے ہر ریہرسل کے بعد غلطیوں کا جائزہ لینا چاہیئے۔ ایک مبتدی کے لیے کم از کم دس ریہرسلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

۱۴۔ سامعین سے نظر کا تعلق قائم رہے لیکن کسی سے آنکھیں نہ ملاؤ۔ کسی ایک چیز کو غور سے دیکھنے سے سارے ہال سے نظر کا رشتہ ٹوٹ جلئے گا اور تاثیر میں کمی آجائیگی۔

۱۵۔ تقریر کوئی مداری کا تماشا نہیں ہے۔ اس لیے اسٹیج پر ڈرامہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

۱۶۔ فن تقریر کے بعض ماہروں کا خیال ہے کہ آئینے کے سامنے ریہرسل کرنا بھی مفید ہوتا ہے۔ تم یہ بھی کر دیکھو۔ لیکن تقریر کے ہال میں یا ہال جیسی کسی کشادہ جگہ میں اپنے کسی دوست کے سامنے جو تقریر کے فن کو تھوڑا بہت جانتا ہو بار بار ریہرسل ضرور کرو۔ اور ریہرسل کے نوٹس بھی لو۔ یاد رکھو ہر فن کی طرح تقریر میں بھی محنت سے رنگ چوکھا آتا ہے۔

ڈرامہ کا فن

ڈرامہ کرنا بھی تمہاری تربیت کا ایک لازمی جز ہے۔ انگریزی اردو میں ڈرامہ کرنے کی مشق تمہیں ضرور کرنی چاہیئے۔ اس سے تفریح بھی ہوگی اور تربیت بھی ہوگی۔ اداکاری سے تمہاری شخصیت کو اپنے اظہار کا موقع ملے گا۔ مکالمہ بولنے سے تمہاری تقریر کی صلاحیت کو جلا ملے گی۔ تمہیں اپنی آواز کو کنٹرول کرنا اور اس سے حسب منشا کام لینا آ جائے گا اور ڈرامہ کرنے سے تمہاری جھجک بھی دور ہوگی۔ آہستہ آہستہ اعتماد پیدا ہوگا پھر ڈرامہ ایک فن بھی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تمہارے اندر تمثیل کاری کی فطری صلاحیت ہو اس مشغلے کو تم ہابی کے طور پر اختیار کر سکتے ہو۔ اس سے تمہیں تخلیقی خوشی ہوگی۔

ڈرامہ ایک مشکل فن ہے۔ اس میں کمال حاصل کرنے کے لیے فطری صلاحیت شوق اور ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہیں ڈرامے کو کیریر تو بنانا نہیں۔ اس لیے تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ناظرین اور سامعین کے سامنے بے جھجک، اعتماد کے ساتھ اوسط درجہ کی اداکاری کر لو۔ اور مکالموں کو کامیابی سے بول لو۔ ایسا کرنے سے کھیل کا مزہ آئے گا۔ اور شخصیت کی نشوونما بھی ہوگی۔

دنیا میں بڑے بڑے عظیم ڈرامے لکھے اور اسٹیج کیے گئے ہیں۔ ڈرامہ یونان سے شروع ہوا۔ اس زمانے کے دو مشہور ڈرامہ نگار سوفوکلیز اور یورو پیڈیز تھے۔ سنسکرت کا مشہور ڈرامہ نگار کالیداس ہے۔ انگریزی زبان کا سب سے بڑا ڈرامہ نگار شیکسپیئر ہے۔ جس نے بڑے معرکے کے ڈرامے لکھے۔ وہ خود بھی اداکاری کرتا تھا۔ انیسویں صدی میں ناروے کے ڈرامہ نگار ابسن نے بڑا نام پالیا اس کے بعد برنارڈشا ڈراموں کے لیے بہت مشہور ہوا۔ ابسن اور شا کے ڈراموں نے یورپ کی ذہنی فضا بدل دی۔

اردو میں ڈراموں کی ابتدا سوانگ اور نوٹنگی سے ہوئی۔ اس زمانے کے ڈراموں میں نقل کے ساتھ ناچ گانے بہت ہوتے تھے اور مشہور قصوں اور لوک کہانیوں کو ناٹک کے روپ میں پیش کیا جاتا تھا اور بیچ بیچ میں ڈھول کی تھاپ پہ ماہیے اور گیت چلتے رہتے تھے۔ اُردو ڈرامہ نگاروں میں سب سے مشہور نام آغا حشر کاشمیری کا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں ان کا انتقال ہوا اس سے پہلے بیس تیس سال ان کے ڈراموں کی بڑی دھوم رہی۔ اس زمانے میں سینما اتنا عام نہیں تھا۔ ڈرامے نوٹنکی ہی تفریح کا ذریعہ تھے۔ آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں میں سفید خون، یہودی کی لڑکی صید ہوس بہت ممتاز ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں امتیاز علی تاج نے مشہور ڈرامہ انارکلی لکھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اور بھی ریڈیائی اور اسٹیج ریڈیو اور ٹی وی کے لیے ڈرامے لکھے ہیں۔ بعض نے کتابی ڈرامے بھی لکھے ہیں۔

ڈرامہ اصل میں کہانی ہی ہے۔ جس کو سامنے کر کے دکھایا جاتا ہے۔ اس میں ایکشن کے ساتھ اداکار باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ یہ عام باتیں نہیں ہوتیں۔ اسٹیج کی ان باتوں کو مکالمہ کہتے ہیں۔ اسٹیج پہ اداکاری اور مکالمہ کاری کے کچھ اصول ہیں جو تمہیں جاننے چاہئیں۔

۱۔ اداکاری کا پہلا اصول یہ ہے کہ جو کردار تم کر رہے ہو۔ ذہنی طور پر تم ویسے ہی ہو جاؤ۔ تمہاری چال ڈھال بول چال اور اگر ہو سکے تو لباس بھی ویسا ہی ہو۔

۲- ایکشن میں زیادہ سے زیادہ حقیقت کا رنگ ہو اگر تم اپنے کردار کو اچھی طرح سمجھ چکے ہو تو اس کے مطابق عمل کرنا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ چیخ چیخ کر مکالمے بولنا اداکاری نہیں ایسا وہی کرتے ہیں جو اداکاری کے فن سے ناواقف ہو۔ اداکاری بغیر جوش وجذبے کے ممکن نہیں۔ پورے ولولے سے کردار ادا کرنا چاہیئے۔

۳- اداکار کو اپنے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات سے پورا کام لینا چاہیئے۔ اصل میں اداکاری کا نام ہی تاثرات کے اظہار کا ہے اداکاری میں تمہارے کھڑے ہونے یا بیٹھنے کا انداز ہاتھوں کی حرکت۔ سٹیج پر تیزی سے داخل ہونا۔ آہستہ سے تھکے انداز میں آنا۔ خاموشی سے باہر جانا یا بیزاری سے باہر جانا یا اسٹیج پر ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرنے کی رفتار اور زاویہ غرض ہر چیز کچھ نہ کچھ معنی اور اثر رکھتی ہے۔ ایکشن کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ لیکن ڈرامے میں مکالمے کی اہمیت بھی کم نہیں۔

مکالمہ کی ادائیگی میں آنکھوں اور چہرے کے تاثرات اور ہاتھ پیروں کی حرکات بھی کام آتی ہے لیکن اصل چیز آواز ہے آواز کے سلسلہ میں یہ بات خوب اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ آواز کو بغیر چیخے اتنا بلند ہونا چاہیئے کہ ہال کا ہر شخص اس کو اچھی طرح سن سکے۔ لفظوں کی ادائیگی واضح ہونا چاہیئے۔ تلفظ صحیح اور لب ولہجہ کردار اور صورت حال کے مطابق ہو۔ کردار کے بولنے کا ایک فطری انداز ہونا چاہیئے تمہیں اپنے کردار کو اپنی آواز حرکات وسکنات سے زندہ کرنا چاہیئے۔ کبھی تیز بولنا کام آتا ہے کبھی ایک دم چپ ہو جانا کبھی آواز کو چیخ کی حد تک اونچا کرنا ہوتا ہے اور کبھی بہت آہستہ کر دینا۔ بہر حال اپنی آواز سے پورا کام اور موقع محل کے اعتبار سے آواز کو بدلو تمہیں آواز سے وہ کام لینا ہے جو مصور رنگوں سے لیتا ہے۔

کچھ تکنیکی باتیں

گروپنگ

اسٹیج پر بیک وقت عموماً ایک سے زیادہ کردار ہوتے ہیں، ایک کو دوسرے کی نسبت

سے کہاں کھڑا ہونا یا بیٹھنا ہے اور کس پوائنٹ سے کس پوائنٹ تک حرکت کرنا ہے اس کو اصطلاح میں گروپنگ کہتے ہیں۔ پروڈیوسر کو ریہرسل سے پہلے گروپنگ کا نقشہ ذہن میں یا کاغذ پر بنا رکھنا چاہیئے۔ گروپنگ کا ایک عام اصول یہ ہے کہ مکالمہ میں مصروف دو اداکار ایک خط مستقیم میں کھڑے نہیں ہوتے جب وہ ایک دوسرے کے سامنے منہ کیے مکالمے بولیں گے تو ناظرین کو ان کی آنکھیں اور چہرہ صاف نظر نہ آئے گا۔ آواز صاف سنائی نہ دے گی، اس کا طریقہ یہ ہے بولنے والے اس پوزیشن میں ہوں کہ بات کرنے والا ذرا پیچھے ہٹے، سننے والا بے شک نمایاں نہ ہو۔

اسی طرح کی گروپنگ کا ایک اور بنیادی اصول یہی ہے کہ بولنے والے کی پیٹھ ناظرین کی طرف نہ ہو۔

اسٹیج کے سامنے کا حصہ جو ناظرین کے قریب ہوتا ہے ڈاؤن اسٹیج کہلاتا ہے اور اوپر والا حصہ اپ اسٹیج۔ اہم اداکاری اور مکالمے ڈاؤن اسٹیج پر ہونا چاہیئے تاکہ آڈئینس ڈرامے کو پوری طرح سمجھیں اور جب سمجھیں گے تو محظوظ ہوں گے۔ اسٹیج کے کونوں یا ونگز میں عمل موثر نہیں ہوتا۔

اسٹیج پر کردار کے داخل ہونے اور اسٹیج سے باہر جانے کی بڑی ڈرامائی اہمیت ہوتی ہے۔ کبھی تیزی سے آنا اور کبھی آہستہ آہستہ جانا بہت ڈرامائی اثر رکھتا ہے اگر کردار کو جاتے وقت کوئی اہم بات کہنی ہے تو اس کی بہترین جگہ دروازے کے قریب پہنچ کر بات کو ڈرامائی انداز میں کہہ کر ایک دم غائب ہو جانا ہے۔

اسکولی ڈراموں میں اسٹیج پر زیادہ ساز و سامان کا بکھیڑا نہیں کرنا چاہیئے۔ تھوڑا سامان ہو اور اس سے اشارتی کام لیا جائے۔ مثلاً درخت کی ٹہنی جنگل کے لیے، ریلوے اسٹیشن کا بورڈ اسٹیشن کے لیے یہی اصول کپڑوں اور میک اپ کے سلسلے میں اپنانا چاہیئے۔

کتابوں کی دنیا

انسانی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب بھی اور جہاں بھی معاشرہ کسی قدر منظم ہوا ہے اور انسان نے تہذیبی زندگی شروع کی ہے تو کتاب کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود رہی ہے۔ کتاب موجودہ صورت میں حال ہی کی ایجاد ہے۔ قدیم زمانے میں کتابیں درختوں کے پتوں، چھال سوتی اور ریشمی کپڑوں، مٹی کی ٹکیوں، تختیوں، چمڑے کے ٹکڑوں اور پیپرس پر لکھی جاتی تھیں۔

پیپرس ایک طرح کا کاغذ تھا قدیم مصری ایک خاص قسم کے سرکنڈے کے گودے کو کوٹ کر کاغذ بنایا کرتے تھے اور اس کو پیپرس کہتے تھے۔ موجودہ لفظ پیپر بھی اسی سے بنا ہے۔ یہ مخصوص سرکنڈہ جس سے مصری کاغذ بنایا کرتے تھے دریائے نیل کی وادیوں میں پایا جاتا تھا۔ کئی صدیاں گزرنے کے بعد جاپان اور چین میں بھی شہتوت کی لکڑی سے بھی کاغذ بنایا جانے لگا۔

قدیم مصر یا شام میں کتاب اس اینٹ، قرص یا مٹی کی اس تختی کو کہتے تھے جس پر کچھ علامتیں کندہ ہوتی تھیں۔ حضرت موسیٰ کی کتاب تورات بھی پتھروں پر کندہ کی گئی تھی۔ مصر میں لفظ کتاب نقشہ کی طرح لکڑی کی ڈنڈی پر لپیٹے ہوئے چرمی کاغذ کے لیے مستعمل تھا۔ جس پر عبارت لکھی ہوتی تھی۔ قدیم روم اور یونان میں بھی کتاب سے یہی مفہوم لیا جاتا تھا۔

سب سے قدیم کتب خانہ قدیم نینوا کے کھنڈرات سے برآمد ہوا ہے اس میں جو کتابیں ہیں وہ پہلے مٹی کی کچی تختیوں پر تحریر کی گئی تھیں۔ اور پھر ان تختیوں کو پکایا گیا تھا۔ مصر کے ٹالمی عہد میں سکندریہ میں دو عظیم الشان کتب خانوں کی بنیاد رکھی گئی۔ لیکن وہ زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ پہلے کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔ مطبوعہ کتابیں اگرچہ پندرھویں صدی عیسوی میں یورپ میں رائج ہوئی تھیں لیکن طباعت کی ایجاد کا سہرا چینیوں کے سر ہے

قدیم ترین کتاب ۱۱ مئی ۸۶۸ ء کو چھاپی گئی اس کی ابتدا ٹھپے کی چھپائی سے ہوئی۔ ساٹھ ستر سال پہلے چین کے صوبہ کانوں میں یہ کتاب ملی اس کتاب کو "وانگ چی ایہہ" نے مفت تقسیم کرنے کے لیے چھاپا تھا۔ کتاب چھاپنے کا مقصد یہ تھا کہ اس کے والدین کی یاد کو دوام حاصل ہو۔ حروف کی چھپائی بھی چین میں شروع ہوئی۔ ایک شخص پی تنگ اس کا موجد تھا۔ جس نے ۱۰۴۱ء سے ۱۰۴۹ء تک ٹائپ میں چھپائی کا کام جاری رکھا۔

اس کے بعد کتاب کی تاریخ، طباعت یا پریس کی تاریخ ہے۔ جب تک پریس کے ذریعہ طباعت کا رواج نہیں ہوا تھا۔ کتب کی فراہمی پر بے اندازہ روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ کاغذ کی ایجاد اور طباعت کے رواج نے کتابوں کو نسبتاً ارزاں کر دیا۔ جیسا کہ کہا گیا یورپ میں مطبوعہ کتابیں پندرویں صدی عیسوی میں رائج ہو گئی تھیں لیکن برصغیر پاک و ہند میں طباعت کی ابتدا سترھویں صدی میں ہوئی۔

مغل بادشاہ اگرچہ ہر نئی چیز کا خیر مقدم کرتے تھے لیکن انہوں نے طباعت میں کوئی خاص دلچسپی نہ لی کہا جاتا ہے کہ "اکبر" کے دربار میں جو یورپی مسیحی علماء موجود تھے۔ انہوں نے چھپائی کے کچھ نمونے بادشاہ کے سامنے پیش کیے لیکن اکبر نے جو دیدہ زیب قلمی نسخوں کا عادی تھا بھدے ٹائپ کی طباعت کو نظر انداز کر دیا۔ طباعت کا فروغ نہ ہونے کی اصل وجہ یہ تھی کہ علمی اور ادبی شہ پاروں کی مانگ بہت محدود تھی۔ اس زمانے میں کتابیں علمی، ادبی اور مذہبی بس تین موضوعات پر ہوا کرتی تھیں۔ اگر کتابوں کی مانگ زیادہ ہوتی تو طباعت کو بھی تیزی سے فروغ ہوتا۔

اگرچہ برصغیر میں سترھویں صدی کے وسط میں چھاپہ خانہ قائم ہو گیا تھا لیکن انگریزوں نے اپنا پہلا چھاپہ خانہ ۱۶۷۴ء میں نصب کیا۔ کاغذ اور ٹائپ کا بہت سا سامان مہیا کیا جلد ہی فارسی اور بنگالی کے ٹائپ ایجاد ہو گئے اور کتابیں چھپنے لگیں۔

۱۸۳۶ء میں لیتھو کی طباعت شروع ہوئی چونکہ یہ ٹائپ کے مقابلہ میں ارزاں تھی اس لیے بہت جلد مقبول ہو گئی۔ اب تو طباعت میں کمپیوٹر کا استعمال عام ہو گیا ہے۔ آجکل

بازاروں میں ہر قسم کی کتابوں کی ریل پیل ہے۔ ہر سائز اور ہر رنگ میں ہر موضوع پر کتابیں مل سکتی ہیں۔ لیکن ہر کتاب، کتاب نہیں ہوتی اور نہ ہی ہر کتاب کا ہر شخص کے لیے پڑھنا مفید ہو سکتا ہے۔ آسانی کے لیے کتابیں کو چار قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) سنجیدہ کتابیں (۲) نیم سنجیدہ کتابیں (۳) غیر سنجیدہ کتابیں۔ تفریح ادب (۴) چوتھے نمبر پر وہ نام نہاد کتابیں نظر آتی ہیں۔ جنہیں اصولاً تو کتابیں نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ صورت و شکل سے وہ ضرور کتابیں نظر آتی ہیں۔

سنجیدہ کتابوں کے قاری بہت کم نظر آتے ہیں۔ نیم سنجیدہ کتابوں کے قاری نسبتاً زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کتابوں میں بھی سنجیدہ حصے کم اور غیر سنجیدہ حصے زیادہ پڑھے جاتے ہیں۔

آج کل سب سے زیادہ مانگ غیر سنجیدہ کتابوں میں تفریحی ادب کی ہے۔ چھپنے والی کتابوں کی زیادہ تعداد ان ہی کتابوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ کتابیں وقت کاٹنے یا نیند بلانے کے کام آتی ہیں۔

چوتھی قسم کی کتابیں جیسا کہ کہا گیا ہے بالکل فضول قسم کی ہوتی ہیں۔ نہ لکھنے والے ان پر فخر کر سکتے ہیں اور نہ ہی پڑھنے والے ان کا نام کھلے بندوں لے سکتے ہیں۔

جب کہا جاتا ہے کہ کتابیں پڑھنی چاہئیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے سنجیدہ کتابیں پڑھنی چاہئیں منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کبھی کبھار غیر سنجیدہ کتابیں بھی پڑھی جا سکتی ہیں۔ لیکن صرف انہی کتابوں کو اپنے مطالعے کا مرکز بنائے رکھنا سخت بدذوقی بلکہ بدنصیبی ہوگی۔ عظیم کتابوں کی عظیم روشنی سے اپنے آپ کو محروم رکھنا بدنصیبی نہیں تو کیا ہے۔ ہر چھپی ہوئی چیز پڑھنے کے قابل نہیں ہوتی بلکہ بعض کتابیں (رسالے اور ڈائجسٹس) انتہائی مہلک اثرات رکھتی ہیں بعض انسان دشمن رائٹرز اور حریص اور مظالم پبلشرز صرف پیسہ کمانے کے لیے زہر سے بھرے لٹریچر کو تصویروں وغیرہ سے مزین کر کے بڑے خوبصورت کورز میں چھاپتے رہتے ہیں

گھٹیا کتابوں کے بارے میں "آواز دوست میں" مختار مسعود نے لکھا ہے:

صرف رزق ہی سے نہیں۔ بعض کتابوں سے بھی پرواز میں کوتاہی آتی ہے۔اشارہ اقبال کے اس شعر کی طرف ہے۔

اے طاہر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو، پرواز میں کوتاہی

کتابوں کے بارے میں انگریزی کا مشہور انشاپرداز فرانسس بیکن Bacon. لکھتا ہے۔

Some books are to be tasted, others to be swallowed and some few to be chewed and digested.

ہر موضوع کی کتاب کا الگ اثر ہوتا ہے۔اس سلسلہ میں بیکن کہتا ہے۔

Histories make men wise, poets, witty, mathematics subtle, natural philosophy (Sciences) deep, morals grave, logic and rehetoric, able to contend.

کتابوں کی قدر وقیمت کے بارے میں ملٹن ایجوکیشن پر اپنے مقالہ میں لکھتا ہے۔

A good book is the precious life blood of a master spirit embalmed and treasured up on purpose to a life beyond life.

اچھی کتابیں پڑھنا کیوں ضروری ہے:

یوں تو علم انسان اپنے تجربے اور مشاہدے سے بھی حاصل کرتا ہے۔لیکن ذہین سے ذہین انسان بھی صرف اپنے تجربے سے زندگی بھر بھی سیکھتا رہے تو وہ علم کے اس سمندر کے قطرہ کے برابر بھی نہ ہوگا جو صدیوں بلکہ ہزاروں سال سے ہزاروں لاکھوں ذہین ترین انسانوں نے ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اب تک لاتعداد کتابوں کی شکل میں ہمارے لیے چھوڑا ہے۔اس لیے کتابیں پڑھنا گویا دنیا کے بہترین دماغوں کے بہترین تجربات سے براہ راست استفادہ کرنے کے مترادف ہے۔عظیم کتابیں دنیا کے عظیم انسانوں کی طرح ایک نعمت خداوندی کی حیثیت رکھتی ہیں۔اس لیے اچھی کتابیں پڑھنے کی عادت سے بڑھ کر کوئی اچھی عادت نہیں ہوسکتی کتابیں علم ہی کا نہیں تفریح کا بھی ایک ذریعہ ہوتی

ہیں۔ کتاب کو انسان کا بہترین دوست بھی کہا گیا ہے۔

لیکن کتابوں کو Reproductive انداز میں نہیں دکہ جو کچھ پڑھا اس پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیا۔ اور اس کو امتحان میں یا امتحان کے کمرے سے باہر دھرا دیا۔ بلکہ Creative انداز میں پڑھنا چاہیے کہ ذہن کے دریچے کھلے رہیں۔ جو پڑھا ہے اس کو پرکھا بھی جائے۔ سمجھا بھی جائے۔ اس کا تجزیہ بھی کیا جائے۔ اس کو Interpret کیا جائے بلکہ اس کو Challenge بھی کیا جائے۔

اقبال نے طلبار کو مشورہ دیا تھا کہ علم حاصل کرو اور علم پیدا بھی کرو۔ مکھی پر مکھی مارنے سے رٹنے رٹانے سے یعنی Convergent Thinking سے علم پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ علم Divergent Thinking سے پیدا ہوتا ہے۔

کتب خانے :

آج تک ہونے والی تحقیق کے مطابق سب سے قدیم کتب خانہ نینوا (موجودہ عراق) کے کھنڈرات سے برآمد ہوا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے علمی عروج کے زمانہ میں بڑے بڑے کتب خانے قائم کیے۔ اندلس کی لائبریریوں سے یورپ نے خوشہ چینی کی۔ بغداد کی مرکزی لائبریری اتنی بڑی تھی کہ جب ۱۲۶۱ عیسوی میں ہلاکو خان نے بغداد کو تاراج کیا تو لائبریری کی قلمی کتابوں کی سیاہی سے دجلہ کا پانی سیاہ پڑ گیا تھا۔

زمانہ حال کی بڑی بڑی لائبریریوں میں روم میں پاپائے اعظم کی لائبریری سب سے بڑی اور مشہور سمجھی جاتی ہے۔ جو ۱۵۸۸ء میں موجودہ عمارت میں آئی۔ لندن کا برٹش میوزیم پیرس کی قومی لائبریری، نیویارک کی اسٹنور لائبریری اور ماسکو کی لینن لائبریری میں بہت بڑے بڑے کتب خانے ہیں۔ پاکستان میں مرکزی حکومت کا کتب خانہ اور مرکزی عجائب گھر، لیاقت لائبریری کراچی، لاہور میں پنجاب یونیورسٹی، لائبریری، پبلک لائبریری، عجائب گھر کی لائبریری اور محکمہ آثار قدیمہ کی لائبریری، قائد اعظم لائبریری اعلیٰ درجے کے کتب خانے ہیں۔

گورنمنٹ کالج لاہور دیال سنگھ کالج اور کے، ای میڈیکل کالج لاہور کے کتب خانے بھی اچھے کتب خانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے علم دوست اور صاحب ذوق حضرات کے اپنے ذاتی کتب خانے بھی ہیں۔

جو طالب علم، صحیح معنوں میں علم کا طالب ہوتا ہے وہ کتابوں کی شکل میں علم کے خزانے کو ضرور جمع کرتا ہے۔ اس خزانے سے بڑھ کر کوئی خزانہ نہیں۔

اُردو کی چند قابل مطالعہ کتابیں

(۱) باغ و بہار — میر امن
(۲) طلسم ہوشربا (انتخاب) — از حسن عسکری
(۳) فسانۂ آزاد (انتخاب) — از رئیس احمد جعفری
(۴) مضامین سرسید (انتخاب)
(۵) خطوط غالب
(۶) توبۃ النصوح — نذیر احمد
(۷) مسدس حالی — حالی
(۸) سیرت النبی — شبلی نعمانی
(۹) قصص ہند — محمد حسین آزاد
(۱۰) واردات — پریم چند
(۱۱) سیپارۂ دل — خواجہ حسن نظامی
(۱۲) تذکرہ — ابوالکلام آزاد
(۱۳) بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم — اقبال

(۱۴) گنجہائے گرانمایہ	رشید احمد صدیقی
(۱۵) شاہنامہ اسلام	حفیظ جالندھری
(۱۶) خطبات و تقاریر قائداعظم رح	قائداعظم رح
(۱۷) جدوجہد آزادی	ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
(۱۸) دنیا کی کہانی	ڈاکٹر مجیب
(۱۹) کمپنی کی حکومت	باری علیگ
(۲۰) جہانِ دانش	احسان دانش
(۲۱) درسِ زندگی	پطرس بخاری
(۲۲) پاکستان کی نظریاتی بنیادیں	ڈاکٹر وحید قریشی
(۲۳) آبِ کوثر، موجِ کوثر، رودِ کوثر	شیخ محمد اکرام
(۲۴) آوازِ دوست	مختار مسعود
(۲۵) شہاب نامہ	قدرت اللہ شہاب
(۲۶) اُردو کا انشائی ادب	انتخاب از ڈاکٹر وحید قریشی
(۲۷) اقبال کے حضور میں	نذیر نیازی

دنیا کی عظیم کتابیں

کتابوں کے بارے میں کارلائل لکھتا ہے۔

All that mankind has done, thought or gained, is lying as in magic preservation in the pages of books. They are the chosen possession of man.

دنیا میں چھپی ہوئی کتابیں تو بے شمار ہیں ان میں سے سو عظیم کتابوں کا تعارف دنیا کی عظیم کتابیں نامی کتاب میں ستار طاہر نے کرایا ہے۔ جس کے شروع میں والٹیئر کا یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

آپ کو اس حقیقت کا شعور ہونا چاہیئے کہ جب سے دنیا بنی ہے وحشی نسلوں کو چھوڑ کر دنیا پر کتابوں نے حکمرانی کی ہے۔

اس کتاب میں جن سو عظیم کتابوں کی نشاندہی کی گئی ہے وہ یہ ہیں؛

(۱) القرآن (۲) صحیح بخاری (۳) عہدنامہ عتیق (۴) عہدنامہ جدید (۵) گیتا (۶) اقوال۔ کنفیوشش (۷) دھماپد (۸) گرنتھ صاحب (۹) ایلیڈ ـــــ ھومر (۱۰) کلیلہ دمنہ (۱۱) کہانیاں ـــــ ایسپ (۱۲) الف لیلیٰ (۱۳) کنٹربری ٹیلز، چاسر (۱۴) ایڈی پس ـــــ سموکلیز (۱۵) الیکٹرا ـــــ یوری پیڈیز (۱۶) شکنتلا ـــــ کالی داس (۱۷) فیدرا ـــــ راسین (۱۸) ہیملٹ ـــــ شیکسپیئر (۱۹) فاوسٹ ـــــ گوئٹے (۲۰) اے ڈالز ہاؤس ـــــ ابسن (۲۱) ڈیکمرون ـــــ بوکیچیو (۲۲) ڈیوائن کامیڈی ـــــ دانتے (۲۳) فصوص الحکم ـــــ ابن عربی (۲۴) کشف المحجوب علی ہجویری (۲۵) شاہنامہ ـــــ فردوسی (۲۶) گلستان ـــــ سعدی (۲۷) مثنوی ـــــ رومی (۲۸) دیوان ـــــ حافظ (۲۹) یوٹوپیا ـــــ مور (۳۰) نیو اٹلانٹس ـــــ بیکن (۳۱) پرنسپیا ـــــ نیوٹن (۳۲) اصل الانواع ـــــ ڈارون، (۳۳) مقدمہ ـــــ ابن خلدون (۳۴) ڈیکلائن اینڈ فال آف رومن ایمپائر۔ ـــــ گبن (۳۵) اے سٹڈی آف ہسٹری ـــــ ٹائن بی (۳۶) لیویا تھن ـــــ ہابز، (۳۷) ٹریکیس تھیالوجیکو پولیٹیکس ـــــ اسپینوزا (۳۸) ری پبلک ـــــ افلاطون (۳۹) سیاسیات ـــــ ارسطو (۴۰) میڈی ٹیشنز ـــــ ڈیکارٹ (۴۱) تنقید برعقل محض ـــــ کانٹ (۴۲) فلاسفیکل ڈکشنری ـــــ والٹیر (۴۳) پرنس ـــــ میکاولی (۴۴) معاہدِ عمرانی ـــــ روسو (۴۵) ورلڈ ایزول اینڈ آئیڈیا ـــــ شوپنہار، (۴۶) بینگ اینڈ نتھنگیس ـــــ سارتر (۴۷) ایستھیٹک ـــــ کروچے، (۴۸) پرنسپلز آف سوشیالوجی ـــــ سپنسر (۴۹) اور زرتشت نے کہا ـــــ نطشے۔

(۵۰) کونیسپٹ آف دی ڈریڈ ــــــ کرکیگارڈ

(۵۱) کرئیٹیو ایولیوشن ــــــ برگساں

(۵۲) لوجک ــــــ ہیگل

(۵۳) رائٹس آف مین ــــــ پین

(۵۴) داس کیپٹل ــــــ مارکس

(۵۵) سائیکوانالسز ــــــ فرائیڈ

(۵۶) میموریز ــــــ ڈریمز ری ملیکشنز ــــــ ژونگ

(۵۷) پلگرمز پراگریس ــــــ بنین

(۵۸) جیسٹن ــــــ ڈی سیڈ

(۵۹) لامزرابیلز ــــــ ہیوگو

(۶۰) سکارلٹ لیٹر ــــــ ہاتھیورن

(۶۱) ڈیڈ سولز ــــــ گوگول

(۶۲) انکل ٹام کیبن ــــــ ہیربٹ سٹود

(۶۳) ددرنگ ہائیٹس ــــــ ایملی برونٹے

(۶۴) فادرا اینڈ سنز ــــــ ترگنیف

(۶۵) ہیرو آف آدر ٹائمز ــــــ لرمنتوف

(۶۶) ریڈ اینڈ دی بلیک ــــــ ستاں دال

(۶۷) ریمبرینس آف تھنگز پاسٹ ــــــ پروست

(۶۸) دی ٹرائل ــــــ کافکا

(۶۹) مادام بوواری ــــــ فلوبیئر

(۷۰) ماں ــــــ گورکی۔

(۷۱) فرام ارتھ ٹو دی مون ـــــ ورن

(۷۲) برادرز کرامازوف ـــــ دوستوفسکی

(۷۳) ڈیوڈ کاپر فیلڈ ـــــ ڈکنز

(۷۴) دی نیبٹرسن ـــــ رائٹ

(۷۵) ڈاکٹر جیکل اینڈ مسٹر ہائیڈ ـــــ سٹونسن

(۷۶) رابنس کروسو ـــــ ڈیفو

(۷۷) موبی ڈک ـــــ میلول

(۷۸) گلیورز ٹریولز ـــــ سوئفٹ

(۷۹) کونٹ آف مانٹی کرسٹو ـــــ ڈوما

(۸۰) ہیومن کامیڈی ـــــ بالزاک

(۸۱) وار اینڈ پیس ـــــ ٹالسٹائی

(۸۲) ڈان کیخوٹے ـــــ سروانٹیز

(۸۳) یولیسز ـــــ جوائس

(۸۴) نظمیں ـــــ پوشکن

(۸۵) بدی کے پھول ـــــ بودیلیئر

(۸۶) رباعیات ـــــ عمر خیام

(۸۷) لیوز آف گراس ـــــ وہٹمین

(۸۸) اے سیزن ان دی ہل ـــــ راں بو

(۸۹) ایلجیز ـــــ رلکے

(۹۰) ویسٹ لینڈ ـــــ ایلیٹ

(۹۱) کینٹوز ـــــ پونڈ

(۹۲) جاوید نامہ ـــــــ اقبال

(۹۳) فیری ٹیلز ـــــــ اینڈرسن

(۹۴) چھوٹی بڑی کہانیاں ـــــــ چیخوف

(۹۵) منتخب کہانیاں ـــــــ او ہنری

(۹۶) کہانیاں ـــــــ موپساں

(۹۷) والڈن ـــــــ تھوریو

(۹۸) سینچریز ـــــــ نوسٹراڈامس

(۹۹) تشکیل انسانیت ـــــــ رابرٹ بریفالٹ

(۱۰۰) شاخ زریں ـــــــ فریزر

اقبال کی چار نظمیں اور ان کے مأخذ

پڑھنے پڑھانے کے دو طریقے ہیں۔ایک کو Reproductive کہتے ہیں یعنی جو کچھ کتاب میں لکھا ہے اس کی گہرائی میں جائے بغیر اس پر ضروری تحقیق کیے بغیر اس کو اوپر اوپر سے پڑھا یا پڑھایا جائے اور رٹ رٹا کر امتحان پاس کر لیا جائے دوسرا طریقہ تخلیقی Creative انداز سے پڑھنے یا پڑھانے کا ہے یعنی مصنف کے بارے میں اس کتاب کے بارے میں جس میں سے وہ سبق لیا گیا ہے۔ اس ماحول کے بارے میں جس میں وہ لکھا گیا پڑھا اور پڑھایا جائے پھر اس سلسلہ میں ڈکشنری، انسائیکلو پیڈیا، حوالے کی کتابیں دیکھی جائیں اور پھر اسے گہرائی میں جا کر پڑھایا جائے اس دوسرے طریقے میں وقت ضرور زیادہ لگتا ہے، محنت بھی یقیناً بہت زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ لیکن علم حاصل کرنے کا طریقہ اس کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔

مثال کے طور پر اگر اقبال کی نظم بچہ کی دعا، پڑھانی ہے تو پہلے اس کے مأخذ کا کھوج

بھی لگانا چاہیئے۔ یعنی یہ کہ یہ نظم کس نظم کو سامنے رکھ کر یا کس نظم سے متاثر ہو کر لکھی تھی پھر دونوں کا موازنہ اور مقابلہ کیا جائے۔ اس کے بعد دونوں نظموں کے معانی اور مطالب پر گہرائی میں جا کر غور کیا جائے۔ تاکہ ان نظموں کے مطالعہ سے طلبا کو وہ روشنی ملے جس سے ان کی زندگی کی راہیں روشن ہوں اور ان کے علم میں صحیح معنوں میں اضافہ ہو۔

نمونے کے طور پر اقبال کی چار نظمیں۔ بچہ کی دعا ہمدردی، ماں کا خواب ایک آرزو کے ماخذ (اقبال پر ڈاکٹر اکبر حسین قریشی کی تحقیقی کتاب بعنوان مطالعہ تلمیحات واشارات اقبال) نقل کیے جاتے ہیں۔

بچے کی دعا (ماخوذ)

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری

زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے

ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت!

جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب

علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا

دردمندوں سے، ضعیفوں سے محبت کرنا

میرے اللہ! بُرائی سے بچانا مجھ کو

نیک جو راہ ہو، اس راہ پہ چلانا مجھ کو

اقبال کی نظم "بچے کی دعا" میٹلڈا بیتھم ایڈورڈز (Matilda Betham-Edwards) کی نظم A Child's Hymn سے ماخوذ ہے۔

A Child's Hymn

God make my life a little light,
Within the world to glow,
A little flame that burneth bright,
Wherever I may go.

God make my life a little flower
That giveth joy to all,
Content to bloom in native bower,
Although the place be small.

God make my life a little song;
That comforteth the sad;
That helpeth others to be strong
And makes the singer glad.

God make my life a little staff
Whereon the weak may rest,
That so what health and strength I have
May serve my neighbours best

God make my life a little hymn,
Of tenderness and praise,
Of faith that never waneth dim
In all His wondrous ways.

ہمدردی

(ماخوذ از ولیم کوپر)

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا   بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی   اڑنے چگنے میں دن گزارا
پہنچوں کس طرح آشیاں تک   ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سن کر بلبل کی آہ و زاری   جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے   کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری   میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل   چمکا کے مجھے دیا بنایا

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

اقبال کی نظم ہمدردی، ولیم کوپر کی نظم The Nightingale and Glow-Worm سے ماخوذ ہے۔ انگریزی نظم زیادہ مفصل اور متنوع ہے اور اس میں معانی و مطالب بھی زیادہ آگئے ہیں۔ اقبال کی نظم نسبتاً مختصر ہے، گو اصل انگریزی نظم کا ماحصل پورے طور پر اس میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اقبال نے اس نظم کے ماحصل کی بنا پر اس کا نام "ہمدردی" تجویز کیا ہے۔ اس نظم سے جو سبق ملتا ہے، وہ عین اقبال کے تجویز کردہ عنوان سے مطابقت رکھتا ہے۔ اقبال نے اختصار کے ساتھ "بلبل اور جگنو" کا ماحصل پیش کیا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ ماحصل اقبال نے بڑی خوبی اور خوبصورتی سے اپنے مخصوص آب و رنگ کے ساتھ بیان کیا ہے۔

THE NIGHTINGALE AND GLOW WORM

A Nightingale, that all day long
Had cheer'd the village with his song,

Nor yet at eve his note suspended,
Nor yet when eventide was ended,
Began to feel, as well he might,
The keen demands of appetite;
When, looking eagerly around,
He spied far off upon the ground,
A something shining in the dark,
And knew the glow-worm by his spark,
So stooping down from hawthorn top,
He thought to put him in his crop;
The worm, aware of his intent,
Harangued him thus right eloquent,

Did you admire my lamp, quoth he,
As much as I your minstrelsy,
You should abhor to do me wrong,
As much as I to spoil your song;
For 'twas the self-same pow'r divine

Taught you to sing, and me to shine;
That you with music, I with light,
Might beautify and cheer the night.
The songster heard his short ovation,
And warbling out his approbation
Released him as my story tells,
And found a supper somewhere else
Hence jarring sectaries may lern
Their real interest to discern;
That brother should not war with brother,
And worry and devour each other;
But sing and shine by sweet consent,
Till life's poor transient night is spent,
Respecting in each other's case
The gifts of Nature and of grace.
Those Christians best deserve the name
Who studiously make peace their aim;
Peace, both the duty and the prize.
Of him that creeps and him that flies.

The Poetical works of William Cooper
Routledge, Warne and routledge, London, 1863 p 168-169.

ماں کا خواب

(ماخوذ)

میں سوئی جو اک شب تو دیکھا یہ خواب | بڑھا اور جس سے مرا اضطراب
یہ دیکھا کہ میں جا رہی ہوں کہیں | اندھیرا ہے اور راہ ملتی نہیں
لرزتا تھا ڈر سے مرا بال بال | قدم کا تھا دہشت سے اٹھنا محال
جو کچھ حوصلہ پا کے آگے بڑھی | تو دیکھا قطار ایک لڑکوں کی تھی
زمرد سی پوشاک پہنے ہوئے | دیئے سب کے ہاتھوں میں جلتے ہوئے
وہ چپ چاپ تھے آگے پیچھے رواں | خدا جانے جانا تھا ان کو کہاں
اسی سوچ میں تھی کہ میرا پسر | مجھے اس جماعت میں آیا نظر
وہ پیچھے تھا اور تیز چلتا نہ تھا | دیا اس کے ہاتھوں میں جلتا نہ تھا
کہا میں نے پہچان کر میری جاں | مجھے چھوڑ کر آ گئے تم کہاں؟
جدائی میں رہتی ہوں میں بے قرار | پروتی ہوں ہر روز اشکوں کے ہار
نہ پروا ہماری ذرا تم نے کی | گئے چھوڑ، اچھی وفا تم نے کی
جو بچے نے دیکھا مرا پیچ و تاب | دیا اس نے منہ پھیر کر یوں جواب
رلاتی ہے تجھ کو جدائی میری | نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی مری

یہ کہہ وہ کچھ دیر تک چپ رہا دیا پھر دکھا کر یہ کہنے لگا

سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اسے
ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے

"ماں کا خواب" ولیم بارنس (William Barnes) کی نظم The Mother's Dream سے ماخوذ ہے۔

THE MOTHER'S DREAM

I'd a dream to-night
As I fell asleep,
Oh I the touching sight
Makes me still to wee;
Of my little lad,
Gone to leave me sad,
Aye, the child I had,
But we not to keep,
As in heaven high,
I my child did seek,
There, in twain, came by
Children fair and meek,
Each in lily white,
With a lamp slight;
Each was clear to sight,
But they did not speak,
Then, a little sad,
Came my child in turn,
But the lamp he had,
Oh! It did not burn;
He, to clear my doubt,
Said, half turned about,
Your tears put it out;
Mother, never mourn.

اقبال کی نظم میں نسبتاً تفصیلات زیادہ ہیں۔ سوز و گداز کا عنصر تو

دونوں نظموں میں موجود ہے، لیکن چونکہ اقبال کی نظم ہمارے ماحول سے قریب تر ہے اور اس کے لہجے میں زیادہ اپنائیت ہے، اس لیے اس کا تاثر زیادہ گہرا اور فوری (immediate) ہے۔

ایک آرزو

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں، دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقدیر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر، یہ آرزو ہے میری
آزاد فکر سے ہوں، عزلت میں دن گزاروں
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو!
لذت سرود کی ہو، چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو

ہو ہاتھ کا سرہانا، سبزہ کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت، خلوت میں وہ ادا ہو
مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لیے، سنہری ہر پھول کی قبا ہو
راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
امید ان کی، میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو
بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے
جب آسماں پہ ہر سُو بادل گھرا ہوا ہو
پچھلے پہر کی کوئل، وہ صبح کی مؤذن
میں اس کا ہمنوا ہوں، وہ میری ہمنوا ہو
کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو
اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر درد مند دل کو رونا مرا رُلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں، شاید انہیں جگا دے

اقبال کی نظم "ایک آرزو" میں انگریزی کے نسبتاً غیر معروف شاعر سموئل راجرس Samuel Rogers کی ایک نظم A Wish کا عکس صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔

A WISH

Mine be a cot beside the hill;
A bee-hive's hum shall soothe may ear;
A willowy brook, that turns a mill,
With many a fall shall linger near,

The swallow, oft beneath may thatch,
Shall twitter from her clay-built nest,
Oft shall the pilgrim lift the latch,
And share my meal, a welcome guest,

Around my ivy'd porch shall spring
Each fragrant flower that drinks the dew;
And Lucy, at her wheel, whall sing
In russet gown and apran blue,
The village-church, Among the trees,
Where first our marriage-vows were given,
With merry peals shall swell the breeze,
And point with taper spire to heaven.

اقبال بیت بازی کا پہلا سیٹ

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر — فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

رفعت میں مقاصد کو ہمدوش ثریا کر — خودداریٔ ساحل دے، آزادیٔ دریا دے

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے — ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کو تو — کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا — کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

نگہ بلند سخن دل نواز جاں پرسوز — یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

نہیں ہے یہ شان خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو — کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیب گلو کر لے

یہ ہے مقصد گردش روزگار — کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

روز حساب جب میرا پیش ہو دفتر عمل — آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت — معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا — سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں — یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے — جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند — بہار ہو یا خزاں لا الہ الا اللہ

ہوس نے کر دیا ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو — اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ — ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر — ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی — تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے — جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

یوں تو سیّد بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو — تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا — یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں — نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آذرانہ

ہر درد مند دل کو رونا مرا رلا دے — بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

یہ کاروانِ ہستی ہے تیز گام ایسا — قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے — مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

یا رب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے — جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم — جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

نہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ حسن میں رہیں شوخیاں — نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

نظارے رہے وہی فلک پر — ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر

رہتے ہیں ستم کش سفر سب — تارے، انسان، شجر، حجر سب

بے لوث محبت ہو بے باک صداقت ہو — سینوں میں اجالا کر دل صورتِ مینا دے

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی — ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر — نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر

رفعت میں مقاصد کو ہمدوشِ ثریا کر — خودداریٔ ساحل دے آزادیٔ دریا دے

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی — اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی — کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام بادشاہی

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں — یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہرِ یک دانہ — یک رنگی و آزادی اے ہمتِ مردانہ!

یہ شعر دوبار لکھا گیا

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

اقبال بیت بازی کا دوسرا سیٹ

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

یہ ہند کے فرقہ سازِ اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ بھی تو کھیتی بھی تو، باراں بھی حاصل بھی تو

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اوروں کا ہے پیام اور مرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے

یوں تو روشن ہے مگر سوزِ دروں رکھتا نہیں
شعلہ ہے مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ترا

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
جو دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

یقیں محکم عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آذرانہ

ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگزر

راہ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلماں سے معراج کی رات

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزار ہستی میں — تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے
یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی — ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی
یہ پیام دی گئی ہے مجھے باد صبح گاہی — کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام بادشاہی
یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی — اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی
یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے — جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے — جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے
یہ موج نفس کیا ہے؟ تلوار ہے — خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے

اقبال بیت بازی کا تیسرا سیٹ

اس بیت بازی کی خاص شرط یہ ہے کہ یہ بھی بتایا جائے کہ شعر کہاں سے لیا گیا ہے اور بند پورا پڑھا جائے۔

بال جبریل سے رباعی حاضر ہے:

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے — مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق — کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

جواب میں بال جبریل کی ہی رباعی سنیئے:

یہی آدم ہے سلطاں، بحر و بر کا؟ — کہوں کیا ماجرا، اس بے بصر کا
نہ خود بیں، نے خدا بیں، نے جہاں بیں — یہی شہ کار ہے تیرے ہنر کیا

بال جبریل کا قطعہ ہے۔

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے — شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست — یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

بال جبریل سے رباعی پیش ہے۔

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے
تری پرواز لولاکی نہیں ہے

یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری
تری آنکھوں میں بے باکی نہیں ہے

بانگ درا کی نظم طلوع اسلام کا شعر ہے :

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا

اسی نظم کا شعر ہے

ابھی تک آدمی صید زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انسان نوع انساں کا شکاری ہے

اسی نظم میں ہے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

طلوع اسلام ہی کا شعر ہے

یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

خضر راہ کا شعر ہے۔

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو، مانند خاک رہ گزر

بانگ درا کا شعر ہے

رفعت میں مقاصد کو ہمدوش ثریا کر
خودداری ساحل دے آزادی دریا دے

بانگ درا کا ہی شعر ہے سنیئے

یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

آپ نے جو شعر پڑھا ہے وہ نظم فاطمہ بنت عبداللہ کا ہے اسی نظم کا شعر جواباً عرض ہے۔

یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر / ہے جسارت آفریں شوق شہادت کس قدر

بانگ درا کا شعر ہے۔

رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی / فلسفہ رہ گیا، تلقین غزالی نہ رہی

آپ نے جو شعر پڑھا ہے وہ شکوے کے ایک بند کا دوسرا شعر ہے قاعدے کے لحاظ سے پورا بند پڑھیئے۔ پورا بند تو یاد نہیں فاطمہ بنت عبداللہ سے ایک شعر پڑھتا ہوں۔

رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے / ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

بانگ درا کی نظم بزم انجم کا شعر ہے۔

یہ کاروان ہستی ہے تیز گام ایسا / قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں

بانگ درا سے ایک قطعہ پیش ہے۔

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے / مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی
جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں / کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی
کٹی ہے رات تو ہنگامہ گستری میں تری / سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی

بانگ درا کی نظم تصویر درد کا شعر سنیئے:

یہ خاموشی کہاں تک، لذت فریاد پیدا کر / زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

اسی نظم کا اگلا شعر ہے:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو / تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اسی نظم تصویر درد کا مطلع ہے۔

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری / خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

اس سے اگلا شعر ہے۔

یہ کیسا دستور زبان بندی تیری محفل میں / یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

اس نظم کا ایک شعر مجھ سے بھی سنیئے۔

یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو
تجھے بھی چاہیئے مثل حباب آبجو رہنا

تصویر درد ہی کا شعر ہے۔

اجاڑا ہے تمیز ملت و آئین نے قوموں کو
میرے اہل وطن کے دل میں کچھ فکر وطن بھی ہے

بال جبریل کی ایک غزل کا شعر ہے:

یہ مشت خاک یہ صرصر، یہ وسعت افلاک
کرم ہے یا کہ ستم، تیری لذت ایجاد

ارمغان حجاز کی نظم بڈھے بلوچ کی نصیحت کا شعر ہے۔

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

اسی نظم کا شعر ہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

اسی نظم کا ایک اور شعر مجھ سے سنیئے:

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

ضرب کلیم کی ایک غزل کا آخری شعر

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذان لا الہ الا اللہ

جواب شکوہ کا بند ہے۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے؟ رہرو منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

بال جبریل کا شعر ہے:

نہ تھا اگر تو شریک محفل قصور میرا ہے یا کہ تیرا
مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ

اسی غزل کا مقطع ہے۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

بال جبریل کا شعر ہے

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

ارمغان حجاز کی ایک غزل کا شعر ہے۔

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

نہ تخت و تاج میں، نے لشکر و سپاہ میں ہے جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

ضرب کلیم سے ایک قطعہ سنیئے عنوان ہے صبح

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود ہوتی ہے بندہ مومن کی اذاں سے پیدا

بانگ درا کا شعر ہے۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

بزم انجم کا شعر ہے۔

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

بال جبریل کی ایک غزل میں ہے۔

نگاہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

ضرب کلیم کی مشہور غزل لا الہ الا اللہ کا شعر ہے۔

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ

ضرب کلیم ہی کی ممتاز نظم نما غزل مرد مسلمان میں ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

بال جبریل کی ایک نظم نوجوان کے نام میں یہ شعر ہے۔

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے۔

نہ ہو نومید نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے		امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

بالِ جبریل کی نظم روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے کا شعر ہے۔

ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے		پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے

نظم مردِ مسلمان کا شعر ہے۔

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن		قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

مسجدِ قرطبہ میں مومن کی صفات میں ایک شعر ہے۔

بزمِ دم گفتگو گرم دمِ جستجو		رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

خضرِ راہ میں ہے۔

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ		جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
یہ کارواں ہستی ہے تیز گام ایسا		قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواداری میں

بالِ جبریل ہی کی غزل کا ایک دلکش شعر ہے۔

نہ بادہ ہے نہ صراحی نہ دورِ پیمانہ		فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزمِ جانانہ

خضرِ راہ میں ہے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام		جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری

بالِ جبریل کی ایک غزل کا مطلع ہے۔

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی		کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

بالِ جبریل کا شعر ہے۔

نہیں بہشت بھی ہے حور و جبریل بھی ہے		تری نگہ میں ابھی شوخیٔ نظارہ نہیں

بانگِ درا کی ایک غزل کا شعر ہے۔

نرالا سارے جہاں سے اسکو عرب کے معمار نے بنایا		بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

بانگِ درا ہی کی ایک غزل کا شعر ہے۔

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا		بچا کے دامن بتوں سے اپنا، غبارِ راہِ حجاز ہو جا

بالِ جبریل کی ایک غزل کا مقطع ہے :

اگر ہو عشق، تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو، تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

بالِ جبریل کی نظم ذوق و شوق کا ایک شعر ہے۔ جو غالباً فلسطین میں لکھا گیا۔

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

سلطان ٹیپو کی نصیحت کا مطلع ہے۔

تو رہ نوردِ شوق ہے، منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

ضربِ کلیم کی نظم بعنوان جاوید سے کا شعر ہے۔

لیکن یہ دورِ ساحری ہے
انداز ہیں سب کے جادوانہ

اسی کتاب کی نظم شاعر کا مقطع ہے۔

ہر لحظہ ہے نیا طور، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

بالِ جبریل کا شعر ہے

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آذرانہ

اسی مجموعے کا شعر ہے

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ

مسجدِ قرطبہ کے ایک شعر کا دوسرا مصرعہ ہے۔

غالب و کار آفریں، کار کشا، کار ساز

جس کا پہلا مصرعہ ہے :

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

بالِ جبریل کی غزل کا شعر ہے۔

غواصِ محبت کا اللہ نگہباں ہو
ہر قطرۂ دریا میں، دریا کی ہے گہرائی

لوح بھی تُو قلم بھی تو

لوح بھی تُو، قلم بھی تُو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم، تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید، تیرا جمال بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز چمکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں
جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں
وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئے دکان فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو قرآن کے سیپاروں میں
ہیں کرنیں اک ہی مشعل کی بوبکرؓ عمرؓ عثمانؓ علیؓ
ہم مرتبہ ہیں یارانِ نبیؐ کچھ فرق نہیں ان چاروں میں

(مولانا ظفر علی خان)

سلام

سلام اے آمنہ کے لال اے محبوب سبحانی
سلام اے فخر موجودات، فخر نوع انسانی

سلام اے ظل رحمانی، سلام اے نور یزدانی
ترا نقش قدم ہے زندگی کی لوح پیشانی

سلام اے سر وحدت اے سراج بزم ایمانی
زہے یہ عزت افزائی، زہے تشریف ارزانی

ترے آنے سے رونق آگئی گلزار ہستی میں
شریک حال قسمت ہوگیا پھر فضل ربانی

تیری صورت تیری سیرت، تیرا نقشہ تیرا جلوہ
تبسم، گفتگو، بندہ نوازی، خندہ پیشانی

زمانہ منتظر ہے اب نئی شیرازہ بندی کا
ترے پرتو سے مل جائے ہر اک ذرے کو تابانی

حفیظ بے نوا بھی ہے گدائے کوچۂ الفت
عقیدت کی جبیں تیری مروت سے ہے نورانی

تیرا در ہو میرا سر ہو، میرا دل ہو ترا گھر ہو
تمنا مختصر سی ہے، مگر تمہید طولانی

سلام، اے آتشیں زنجیر باطل توڑنے والے!
سلام اے خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

(حفیظ جالندھری)

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناحؒ

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح — ملت ہے جسم، جاں ہے محمد علی جناحؒ
تصویر عزم، جانِ وفا، روحِ حریت — ہے کون؟ بے گماں ہے محمد علی جناحؒ
لگتا ہے ٹھیک جا کے نشانے پہ جس کا تیر — ایسی کڑی کماں ہے محمد علی جناحؒ
ملت ہوئی ہے زندہ پھر اس کی پکار سے — تقدیر کی اذاں ہے محمد علی جناحؒ
غیروں کے دل بھی سینے کے اندر دہل جائیں — مظلوم کی فغاں ہے محمد علی جناحؒ
اے قوم، اپنے قائدِ اعظمؒ کی قدر کر — اسلام کا نشاں ہے محمد علی جناح

(میاں بشیر احمد)

گہنا گیا وہ چاند مگر اس کے نور سے

گہنا گیا وہ چاند مگر اس کے نور سے — دیوار و در وطن کے ہیں تاباں اسی طرح
مرجھا گیا وہ پھول مگر اس کے رنگ سے — قوسِ قزح ہے صحنِ گلستاں اسی طرح
چپ ہو گیا وہ ساز مگر اس کے سوز سے — نغمے ہیں وادیوں میں پر افشاں اسی طرح
لہرا چکی وہ برق مگر اس کی تاب سے — ذروں میں زندگی ہے غزل خواں اسی طرح
وہ نقش مٹ گیا مگر اس کے طلسم سے — صرفِ چمن ہے فصلِ بہاراں اسی طرح
وہ شمع بجھ گئی مگر اس کے فروغ سے — قندیلِ آرزو ہے فروزاں اسی طرح
دیکھو تو اس کے کوکبِ اقبال کا عروج — سہمی ہوئی ہے گردشِ دوراں اسی طرح

بالیدہ ہے زمینِ وطن کی نمو میں وہ
مضطر ہے مثلِ شعلہ ہمارے لہو میں وہ

(عابد علی عابد)

اِک کرن، مسکراتی ہوئی اک کرن

اک کرن مسکراتی ہوئی اک کرن — جو دریچے سے نیچے اتر آئی تھی
اک کرن جگمگاتی ہوئی اک کرن — جو اجالے سے پہلے نظر آئی تھی
ایک تحریک کی رہبری کر گئی — رات کی مانگ میں روشنی بھر گئی

اک کرن مسکراتی ہوئی اک کرن

اک دیا اپنے دل کا لہو چاٹ کر — رات کو آنچ دیتا رہا رات بھر
وہ جو قائدؔ تھا وہ آج بھی زندہ ہے — وہ دیا اب بھی سینوں میں تابندہ ہے

اک کرن مسکراتی ہوئی اک کرن

(ساقی فاروقی)

تیرے خیال سے ہے دل شادماں ہمارا

تیرے خیال سے ہے دل شادماں ہمارا — تازہ ہے جاں ہماری، دل ہے جواں ہمارا
تیری ہی ہمتوں سے آزاد ہم ہوئے ہیں — خوشیاں ملی ہیں ہم کو دل شاد ہم ہوئے ہیں
تجھ سے ہی لہلہایا یہ گلستاں ہمارا — تیرے خیال سے ہے دل شادماں ہمارا
ہم سو رہے تھے تو نے آکر ہمیں جگایا — پھرتے تھے ہم بھٹکتے رستہ ہمیں دکھایا
تو رہنما ہمارا تو پاسباں ہمارا — تیرے خیال سے ہے دل شادماں ہمارا
تیرے ہی حوصلے سے طاقت ملی ہے ہم کو — تیری ہی آبرو سے عزت ملی ہے ہم کو

چمکا ہے تیرے دم سے قومی نشاں ہمارا
تیرے خیال سے ہے دل شادماں ہمارا

(صوفی تبسم)

خدا کرے سدا یہ روشنی رہے!

زمین کی گود رنگ سے، اُمنگ سے بھری رہے
خدا کرے
سدا یہ روشنی رہے
دلوں میں کوئی خواب تھا بسا ہوا
نظر میں اک گلاب تھا چھپا ہوا
عجب بہار میں کھلا
وہ پھول ماہتاب کا
یہ تازگی، یہ زندگی، یہ چاندنی
خدا کرے
سدا یہ چاندنی رہے
حسین تر ہو پیرہن بہار کا
بلند تر ہو نام اس دیار کا
یہ راستے سجے رہیں
یہ پھول بن کھلے رہیں
یہ مدھ بھری، کلی کلی، یہ زندگی
خدا کرے

سدا ہری بھری رہے
خدائے مہرباں کی یہ نشانیاں
رواں دواں یہ رنگ رنگ بدلیاں
وہ بدلیوں کی اوٹ سے
پکارتی ہے کہکشاں
یہ بدلیاں، یہ آسماں، یہ کہکشاں
خدا کرے
یہ کہکشاں سجی رہے

(اسد محمد خاں)

میرے وطن کے نوجواں

وطن کے گیت گائے جا   وطن کے گیت گائے جا
بڑھا قدم، اٹھا نظر   ترے لیے ہے بحر و بر
جہانِ نو کے پاسباں   میرے وطن کے نوجواں
وطن کے گیت گائے جا
وطن کے گیت گائے جا

بہار بن کے مسکرا   رباب زندگی اٹھا
رواں دواں ہے کارواں   میرے وطن کے نوجواں
وطن کے گیت گائے جا
وطن کے گیت گائے جا

بلندیوں کی سمت چل   کہ آندھیوں کا رُخ بدل
میرے وطن کے نوجواں   تیرے زمین و آسماں
وطن کے گیت گائے جا
وطن کے گیت گائے جا

(بینش سلیمی)

چاند میری زمیں، پھول میرا وطن

چاند میری زمیں، پھول میرا وطن
میرے کھیتوں کی مٹی میں لعلِ یمن
چاند میری زمیں پھول میرا وطن

میرے ملاح لہروں کے پالے ہوئے!
میرے دہقاں پسینوں کے ڈھالے ہوئے
میرے مزدور اس دور کے کوہکن
چاند میری زمیں پھول میرا وطن

میرے فوجی جواں جراُتوں کے نشاں
میرے اہلِ قلم عظمتوں کی زباں
میرے محنت کشوں کے سنہرے بدن
چاند میری زمیں پھول میرا وطن

میری سرحد پہ پہرہ ہے ایمان کا
میرے شہروں پہ سایہ ہے قرآن کا
میرا اک اک سپاہی ہے خیبر شکن
چاند میری زمیں پھول میرا وطن

میرے دہقاں یونہی ہل چلاتے رہیں
میری مٹی کو سونا بناتے رہیں
گیت گاتے رہیں میرے شعلہ بدن
چاند میری زمیں پھول میرا وطن

(ساقی جاوید)

سوئے منزل چلے، اور بیک دل چلے

سوئے منزل چلے اور بیک دل چلے
آج سب منچلے سوئے منزل چلے

سبز پرچم بکف
ہر قدم صف بہ صف
زندگی کی طرف

یوں رواں ہیں کہ گویا ستارے چلے
سوئے منزل چلے اور بیک دل چلے
آج سب منچلے سوئے منزل چلے

راہ کے پیچ و خم
لاکھ روکیں قدم
کس میں اتنا ہے دم

بڑھ کے روکے ہمیں آسماں کے تلے
سوئے منزل چلے اور بیک دل چلے
آج سب منچلے، سوئے منزل چلے

نعرۂ حق نغمہ خواں
دین کا کارواں
ہے ازل سے رواں

جیسے تاروں کی جھرمٹ میں چندا چلے
سوئے منزل چلے اور بیک دل چلے
آج سب منچلے سوئے منزل چلے

(حمایت علی شاعر)

میرے وطن میں کیا نہیں

ترقیوں کا دور ہے
مسرتوں کا طور ہے
سکوں فزا ہے زندگی
مرے وطن میں کیا نہیں

ہیں لہلہاتی کھیتیاں
ہیں گنگناتی ندیاں
چمن چمن ہے تازگی
مرے وطن میں کیا نہیں

چمک رہے ہیں بام و در
ہے جلوہ ریز ہر نظر
قدم قدم ہے روشنی
مرے وطن میں کیا نہیں

شکوہ دیں، وقار بھی
یقیں و اعتبار بھی
فلاح و خیر و برتری
مرے وطن میں کیا نہیں

(صادق نیازی)

میری پاک زمیں، میری پاک زمیں

میری پاک زمیں ، میری پاک زمیں
میرانم میرادم ، میری جان ہے تو ، میری ہت میری چھت میری چھاں ہے تو
سدا سُکھ جیوے ، سدا خوش تھیوے ، میری پاک زمیں ، میری پاک زمیں
ہر قطرہ خون پسینے کا ، عنوان بنے گا جینے کا
تیرے گوٹھ گراؤں شہروں کو ، تری نہروں کو تری لہروں کو
چُپ رستوں گم میدانوں کو ، ان کھیتوں ان کھلیانوں کو
گیتوں گجروں سے بھر دیں گے
تجھے جگمگ جگمگ کر دیں گے ، میرانم میرادم ، میری پاک زمین
ہل جوتیں پتھر توڑیں گے ، فولاد سے شہد نچوڑیں گے
تری ریت سے کھیت سجالیں گے ، ترے سنگ سنگ سنگ اچھالیں گے
تری نوبت دھم دھم باجے گی ، ترے سوئے کھیت جگالیں گے
ترے نام کا میلہ بھر دیں گے
تجھے جگمگ جگمگ کر دیں گے ، میرانم میرادم ، میری پاک زمیں

گونجیں گے راگ مشینوں کے، ابھریں گے خواب زمینوں کے
تری صبحیں اور رتیاں ہوں گی، تری کلیاں اور رواں ہوں گی
ترے پنگھٹ اور حسیں ہوں گے، تری شامیں اور جواں ہونگی
تری مانگ گلوں سے بھر دیں گے
تجھے جگمگ جگمگ کر دیں گے، میرا نم میرا دم، میری پاک زمیں

پھولوں کو صبا مل جائے گی، خوابوں کو فضا مل جائے گی!
ترے دھندلے رنگ نکھاریں گے، ترے الجھے بال سنواریں گے
ہر بام پہ سورج چمکے گا، ہر صحن میں چاند اتاریں گے
تجھے روشنیوں سے بھر دیں گے
تجھے جگمگ جگمگ کر دیں گے، میرا نم میرا دم، میری پاک زمیں

تو وارث پاک اجالوں کی، تو دھرتی شیر جیالوں کی!
تری خوشبو کو چھلکائیں گے، ترے پیار کی جگنی گائیں گے
ترے بھٹی، راشد اور سرور، تری عزت پہ مر جائیں گے
لیکن تجھے زندہ کر دیں گے
تجھے جگمگ جگمگ کر دیں گے، میرا نم میرا دم، میری پاک زمیں

(سید ضمیر جعفری)

اللہ پاکستان رہے

اللہ پاکستان رہے
جب تک سورج چاند ہیں باقی جب تک باقی جہان رہے
اللہ پاکستان رہے

پاکستان کا گوشہ گوشہ گلی گلی آباد رہے
پاکستان کا بچہ بچہ شاد رہے آزاد رہے
آنکھیں ہوں خوابوں سے روشن سینوں میں ایمان رہے
اللہ پاکستان رہے

اس کے پہاڑوں دریاؤں پر، میدانوں صحراؤں پر
اس کے بھرے پُرے شہروں پر، ہر قریے ہر گاؤں پر
تیری رحمت کی بارش ہو، تیرا کرم ہر آن رہے
اللہ پاکستان رہے

اس کے طفل و جوان کو جنوں دے عرفان و آگاہی کا!
یارب ان کو ڈھنگ سکھا دے دلوں کی شہنشاہی کا
علم، محبت، محنت دے دے، عام ترا فیضان رہے
اللہ پاکستان رہے

پاکستان میں بسنے والے اپنی آپ نظیر رہیں
دل و دماغ و دست و بازو مصروفِ تعمیر رہیں
تو ہے ازل سے ابد تک قائم، قائم ترا نشان رہے
اللہ پاکستان رہے

(ضیا جالندھری)

اے وطن کی زمین

تجھ سے بہتر نہیں
کوئی بھی سرزمیں
بے گماں بالیقیں
اے وطن کی زمیں

تیرے کوہ و دمن
ہیں چمن در چمن
حسنِ مہرِ مبیں
اے وطن کی زمیں

ہمت بے کراں
قوتوں کے امیں
یہ جیالے جواں
اے وطن کی زمیں

تو ہے فخرِ زماں
تو ہے جنت نشاں
تو ہے بالانشیں
اے وطن کی زمیں

تو ہے جانِ جہاں
تو ہے جائے اماں
تو ہے دل میں مکیں

اے وطن کی سرزمیں

تجھ سے اسلام کا
بول بالا ہوا
تجھ سے زندہ ہے دیں
اے وطن کی زمیں

ایسے کوہ و دمن
ایسے سرو وسمن
ہم کو ملتے نہیں
اے وطن کی زمین

تیری تدبیر میں
تیری تعمیر میں
ہے یقیں ہی یقیں
اے وطن کی زمین

تو خدا کا کرم
تو ارم در ارم
تو ہے فخرِ زمیں
اے وطن کی زمین

تیرے شمشیر زن
بے مثالِ زمن
بالیقیں بالیقیں
اے وطن کی زمین

تو سلامت رہے
با کرامت رہے
فخرِ دنیا و دیں
اے وطن کی زمیں

(طاہر قریشی)

جاگ رہا ہے پاکستان

اپنی قوت اپنی جان   لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
ہر پل ہر ساعت ہر آن   جاگ رہا ہے پاکستان

نکلے ہیں مردانِ حق   سینوں میں لے کر قرآن
ہم سے رہے باطل ہشیار   ہم ہیں اک چڑھتا طوفان

اپنی قوت اپنی جان   لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
ہر پل ہر ساعت ہر آن   جاگ رہا ہے پاکستان

ہم ہیں قاسم کی آواز   ہم ہیں خالد کی للکار
ہم ہیں طارق کا بازو   ہم ہیں ٹیپو کی تلوار

اپنی قوت اپنی جان   لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
ہر پل ہر ساعت ہر آن   جاگ رہا ہے پاکستان

پرچمِ نصرت ہم سے کھلا   رسمِ شجاعت ہم سے چلی
ہم ہیں جوہرِ تیغِ حسین   ہم ہیں زورِ دستِ علی

اپنی قوت اپنی جان   لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
ہر پل ہر ساعت ہر آن   جاگ رہا ہے پاکستان

فاتح ہیں تو غازی ہیں　　دین پہ مٹ جائیں تو شہید
نعرہ اپنا ہے اسلام　　کلمہ اپنا ہے توحید
اپنی قوت اپنی جان　　لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
ہر پل ہر ساعت ہر آن　　جاگ رہا ہے پاکستان

(محشر بدایونی)

جیوے جیوے پاکستان

جیوے جیوے پاکستان
جیوے جیوے پاکستان
پاکستان
جیوے پاکستان

مہکی مہکی روشن روشن پیاری پیاری نیاری
رنگ برنگے پھولوں سے اک سجی ہوئی پھلواری
پاکستان
پاکستان
جیوے جیوے پاکستان

بکھرے ہوؤں کو بچھڑے ہوؤں کو اک مرکز پہ لایا
کتنے ستاروں کے جھرمٹ میں سورج بن کر آیا
پاکستان
پاکستان
جیوے جیوے پاکستان

من پنچھی جب پنکھ ہلائے کیا کیا سُر بکھرائے
سننے والے سنیں تو ان میں ایک ہی دھن لہرائے
پاکستان
پاکستان
جیوے جیوے پاکستان

جھیل گئے دکھ جھیلنے والے اب ہے کام ہمارا
ایک رکھیں گے، ایک رہے گا ایک ہے نام ہمارا
پاکستان
پاکستان
جیوے جیوے پاکستان

(جمیل الدین عالی)

یہ وطن

یہ وطن

تیرا وطن

میرا وطن

ایمان والوں کا وطن

اس نے جس کی رحمتوں کی حد نہیں

تجھ کو بخشی مجھ کو بخشی یہ زمین

یہ زمین پاک جس کی خاک میں سو سو چمن

یہ وطن

تیرا وطن میرا وطن

ایمان والوں کا وطن

کتنی شمعوں کتنے پروانوں کی آن

کتنے رنگوں کتنی خوشبوؤں کی جان

خوش جمال و بے مثال ولازوال اک انجمن

یہ وطن

تیرا وطن میرا وطن

ایمان والوں کا وطن

سانحات و حادثات و مشکلات

جھیل ہی لیتا ہے اے روح حیات

ارض پاکستان کے محنت کشوں کا بانکپن

یہ وطن

تیرا وطن میرا وطن

ایمان والوں کا وطن (جمیل الدین عالی)

پاکستان ہمارا ہے پاکستان ہمارا ہے

پاکستان ہمارا ہے پاکستان ہمارا ہے
اپنے وطن کا ذرہ ذرہ ہم کو جان سے پیارا ہے

یہ پھولوں کی بستی ہے یہ نکہت و رنگ کا مسکن ہے
اس کی ہر اک راہ چراغاں، کوچہ کوچہ ایمن ہے
اس کے ہر ذرے میں روشن ایک ہلال اک تارا ہے

پاکستان ہمارا ہے پاکستان ہمارا ہے
اپنے وطن کا ذرہ ذرہ ہم کو جان سے پیارا ہے

ہم نے اپنا خون جلا کر اس کا روپ اجالا ہے
کتنے چاند ستارے کھوئے تب یہ سورج ڈھالا ہے
آج اسی کے دم سے ہمارے تن من میں اجیارا ہے

پاکستان ہمارا ہے پاکستان ہمارا ہے
اپنے وطن کا ذرہ ذرہ ہم کو جان سے پیارا ہے

(حمایت علی شاعر)

جس دیس کی دھرتی میں

جس دیس کی دھرتی میں
خوشبو ہے بہاروں کی
وہ دیس ہمارا ہے   وہ دیس ہمارا ہے
جس دیس کی مٹی سے   اٹھا ہے خمیر اپنا

جس دیس کے نغموں سے　　جاگا ہے ضمیر اپنا!

جس دیس کے ذروں میں　　رونق ہے ستاروں کی

وہ دیس ہمارا ہے.... وہ دیس ہمارا ہے

جس دیس نے توڑا ہے　　زنجیر غلامی کو

آتی ہیں نئی صبحیں　　اب جس کی سلامی کو

وہ جس کی ہواؤں میں　　ٹھنڈک ہے پھواروں کی

وہ دیس ہمارا ہے.... وہ دیس ہمارا ہے

لکھی ہے محبت کی　　تاریخ نئی جس نے

روکے ہیں اندھیروں کے　　طوفان کئی جس نے

جو شان بڑھائے گا　　ساحل کے نظاروں کی

وہ دیس ہمارا ہے.... وہ دیس ہمارا ہے

(قتیل شفائی)

دائم آباد تیری حسین انجمن

اے وطن..... اے وطن

تیرے کھیتوں کا سونا سلامت رہے

تیرے شہروں کا سکھ تا قیامت رہے

تا قیامت رہے یہ بہار چمن........ اے وطن اے وطن

تیری آباد گلیاں مہکتی رہیں

تیری راہیں فضائیں چمکتی رہیں

مسکراتے رہیں تیرے کوہ و دمن...... اے وطن اے وطن

تیرے بیٹے تیری آبرو کے لیے
یوں جلائیں گے اپنے لہو کے دیئے
پھوٹ نکلے گی تاریکیوں سے کرن ..... اے وطن اے وطن
دائم آباد تیری حسیں انجمن
(احمد فراز)

اے وطن میرے وطن، پیارے وطن

اے وطن میرے وطن، پیارے وطن
کس قدر شاداب ہیں تیرے چمن
اے وطن میرے وطن پیارے وطن

تیرا ہر موسم خوشی کا راز دان
تیرے جھونکوں میں حیات جاوداں
تجھ کو حاصل ہیں بہار بے خزاں

تا ابد مہکیں تیرے سرو چمن
اے وطن میرے وطن، پیارے وطن
کس قدر شاداب ہیں تیرے چمن
اے وطن میرے وطن، پیارے وطن

لوگ جتنے بھی یہاں آباد ہیں
تیرے خوشحالی پہ وہ دلشاد ہیں
ان کے دل ہر خوف سے آزاد ہیں

تو کہے تو باندھ لیں سر پہ کفن
اے وطن، میرے وطن، پیارے وطن
کس قدر شاداب ہیں تیرے چمن
اے وطن، میرے وطن، پیارے وطن

تیری عزت کے لیے کٹ جائیں گے
تیرا پرچم ہر کہیں لہرائیں گے
تیری عظمت کے ترانے گائیں گے

دل سے جائے گی نہ اب تیری لگن
اے وطن، میرے وطن، پیارے وطن
کس قدر شاداب ہیں تیرے چمن
اے وطن، میرے وطن، پیارے وطن

(قتیل شفائی)

یہ اپنی زمیں، یہ اپنا وطن

یہ اپنی زمیں یہ اپنا وطن سورج کی طرح روشن روشن
یہ اپنی زمیں یہ اپنا وطن
تاروں سے بھری اسکی گلیاں پھولوں سے بھرے اس کے آنگن
سورج کی طرح روشن روشن یہ اپنی زمیں، یہ اپنا وطن
ہم اس کی حفاظت کی خاطر رہتے ہیں ہمیشہ سر بہ کفن
سورج کی طرح روشن روشن
یہ اپنی زمیں یہ اپنا وطن (شبنم رومانی)

یہ وطن، یہ وطن

یہ وطن یہ وطن!
اس پہ سب کچھ فدا
اپنا تن اپنا من
یہ وطن یہ وطن

ہم ہیں اس کے لیے یہ ہے اپنے لیے
اپنی آنکھوں میں رنگین سپنے لیے
ہر قدم رہنما
یہ وطن یہ وطن
اس پہ سب کچھ فدا
اپنا تن اپنا من

اس کا پرچم اسی طرح اڑتا رہے
اس کے لب پر گل افشاں رہیں قہقہے
مسکرائے فضا
یہ وطن یہ چمن
اس پہ سب کچھ فدا
اپنا تن اپنا من
یہ وطن یہ چمن

اس کی راہیں رہیں روشن کہکشاں
اس کے سر پر رہیں مہر و مہ ضوفشاں

پھیلے اس کی ضیا
یہ وطن یہ چمن
اس پہ سب کچھ فدا
اپنا تن اپنا من
یہ وطن یہ وطن

(حمایت علی شاعر)

ہاں ہاں یہ منزل مراد ہے

ہاں ہاں
یہ پاک سرزمین ہے
ہاں ہاں
یہ منزل مراد ہے

اسی دلہن کے لیے
ہزار امتحان دیئے
بہت کٹھن تھے مرحلے
مگر وہ ہم نے طے کیے
گزر گیا جو وقت وہ تمام ہم کو یاد ہے

ہاں ہاں
یہ منزل مراد ہے
ہاں ہاں
یہ پاک سرزمین ہے
ہاں ہاں
یہ منزل مراد ہے

ہے کامیابیوں کا باب
عوام ہی کا انتخاب
ہراک سوال کا جواب
یہ سرزمین انقلاب
جو ہر قدم یقین ہے جو ہر قدم جہاد ہے

ہاں ہاں
یہ منزل مراد ہے

(جمیل الدین عالی)

پاکستان کو سمجھو لوگو

پاکستان کو سمجھو لوگو
پاکستان خدا کا ہے

نام محمدؐ کی تاثیر
کاٹ گئی اک اک زنجیر
اس کا تصور اس کا خمیر
ایمان اور وفا کا ہے
پاکستان خدا کا ہے

اس پر آنکھ جو اٹھی ہے
خود برسوں تک روئی ہے
یاں ہر فرد سپاہی ہے
اور جانباز بلا کا ہے
پاکستان خدا کا ہے

اے وطن تو نے پکارا تو لہو کھول اٹھا

جس کے سائے سے جہاں دار بھی کتراتے ہیں
پھر فضاؤں میں علم آج وہ لہراتے ہیں
اے وطن تو نے پکارا تو لہو کھول اٹھا
تیرے بیٹے تیرے جانباز چلے آتے ہیں
تیری بنیاد میں ہے لاکھوں شہیدوں کا لہو
ہم تجھے گنج دو عالم سے گراں پاتے ہیں
اپنا معیار شرافت ہے خموشی لیکن
بات کرتے ہیں تو ہم بات پہ مر جاتے ہیں
ہم ہیں جو ریشم و کمخواب سے نازک تر ہیں
ہم ہیں جو آہن و فولاد سے ٹکراتے ہیں
ہم نے روندا ہے بیابانوں کو صحراؤں کو
ہم جو بڑھتے ہیں تو پھر بڑھتے چلے جاتے ہیں
کسی منزل پہ بھی رکتا نہیں رہوار اپنا
راستے گرد کی مانند اڑے جاتے ہیں

ہم سے واقف ہیں یہ دریا یہ سمندر یہ پہاڑ
ہم نئے رنگ سے تاریخ کو دہراتے ہیں

(سیف الدین سیف)

میرے نغمے تمہارے لیے ہیں

اے وطن کے سجیلے جوانو
میرے نغمے تمہارے لیے ہیں

سرفروشی ہے ایمان تمہارا
جرأتوں کے پرستار ہو تم
جو حفاظت کرے سرحدوں کی
وہ فلک بوس دیوار ہو تم

اے شجاعت کے زندہ نشانو
میرے نغمے تمہارے لیے ہیں

بیٹوں، ماؤں، بہنوں کی نظریں
تم کو دیکھیں تو یوں جگمگائیں
جیسے خاموشیوں کی زباں سے
دے رہی ہوں وہ تم کو دعائیں

قوم کے اے جری پاسبانو
میرے نغمے تمہارے لیے ہیں

تم پہ جو کچھ لکھا شاعروں نے
اس میں شامل ہے آواز میری

اے وطن ہم تیرے نغمہ خواں

اے وطن ہم تیرے نغمہ خواں
جانِ جاں
جانِ جاں
ہم نئی نسل کے کارواں
ہم قدم، تازہ دم ضو فشاں!
جانِ جاں
جانِ جاں
اے وطن ہم تیرے نغمہ خواں
جانِ جاں
جانِ جاں

(جمیل الدین عالی)

راہیں، روشن روشن ہیں

راہیں
روشن روشن ہیں
کلیاں
دامن دامن ہیں
منزل ہے مستقبل

بڑھتے جائیں، چلتے جائیں
جسم وطن کو قوت دے کر
روح وطن میں ڈھلتے جائیں
منزل ہے مستقبل!

(جمیل الدین عالی)

جو نام وہی پہچان

جو نام وہی پہچان
جو نام وہی پہچان
ہمارا دیس ہے پاکستان
ہمارا دیس ہے پاکستان
لوگو اپنے نام کو سمجھو اس میں عجب افسانہ ہے
معنی و مطلب پوچھ رہے ہیں کب ان میں ڈھل جانا ہے
پاکستان کو جان اور دل سے پاکستان بنانا ہے
کر دینا ہے پاکستان پہ جان اور دل قربان
کر دینا ہے پاکستان پہ جان اور دل قربان
جو نام وہی پہچان
جو نام وہی پہچان
ہمارا دیس ہے پاکستان
ہمارا دیس ہے پاکستان

(جمیل الدین عالی)

کبھی بھول کر نہ آنا

کبھی بھول کر نہ آنا مری سرحدوں کی جانب
مری سرحدوں کی جانب کبھی بھول کر نہ آنا
بڑی پاک سرزمین ہے یہاں سنتری کھڑے ہیں
کوئی دشمنوں سے کہدے یہاں غزنوی کھڑے ہیں
یہاں بدر کا ہے عالم یہاں حیدری کھڑے ہیں
کبھی بھول کر نہ آنا میری سرحدوں کی جانب
مری سرحدوں کی جانب کبھی بھول کر نہ آنا
فقط اک خدا کو سجدہ ہے نشان سرفرازی
مرا نام ہے مجاہد میری آن ہے نمازی
گئی جان تو شہادت ہوئے سرخرو تو غازی
کبھی بھول کر نہ آنا مری سرحدوں کی جانب
مری سرحدوں کی جانب کبھی بھول کر نہ آنا
مری سرحدوں کے اندر نہ قدم بڑھا سکوگے
مری سرحدوں تک آئے تو بچ کے نہ جا سکو گے!
کبھی بھول کر نہ آنا مری سرحدوں کی جانب!

(دیاور عباس)

جو ذرّے میں جھانکو تو ملے آفتاب

سعادت ، سیادت ، عبادت ہے علم
حکومت ہے دولت ہے عافیت ہے علم
یہ پوچھو کسی مرد مختار سے
قلم تیز چلتا ہے تلوار سے
نہ پھولوں کی بیجوں سے آتا ہے علم
نہ ورثے میں انسان پاتا ہے علم
تجسس سے کھلتے ہیں فطرت کے باب
جو ذرے میں جھانکو تو ملے آفتاب
اگر راز قدرت کا ہے دل میں چاؤ
تو فطرت کی رگ رگ پہ نشتر چلاؤ
جو قدرت کے ہو راز دانوں میں تم
تو اڑنے لگو آسمانوں میں تم

(خواجہ دل محمد)

دیئے سے دیئے کو جلاتے چلو

نہیں علم و دانش تجارت کا مال
یہ عرفان کی ہے دولت لازوال
بڑھے علم انسان کا تعلیم سے
کہ یہ دولت دوگنی ہو تقسیم سے
ترا علم دفن گنج الماس ہے
جہالت سب سے بڑا افلاس ہے

جو سیکھو کسی کو سکھاتے چلو
دیئے سے دیئے کو جلاتے چلو

(خواجہ دل محمد)

الٰہی ہمیں ایسے انساں عطا کر

دیانت، شرافت، محبت کے پیکر
صداقت، عزیمت، شجاعت کے پیکر
الٰہی ہمیں ایسے انساں عطا کر

نفس، مشک افشاں بہاروں سے بڑھکر
جبینیں درخشاں ستاروں سے بڑھ کر
الٰہی ہمیں ایسے انساں عطا کر

نگاہیں نہ دھندلائیں دودِ ہوس سے
دل کے چمن پاک ہوں خاروخس سے
الٰہی ہمیں ایسے انساں عطا کر

نہ منصب کا لالچ، نہ سازش کا ڈر ہو
فقط تیری رحمت پہ جن کی نظر ہو
الٰہی ہمیں ایسے انساں عطا کر

خود آگاہ، بے باک، بیدار انساں
غریبوں، یتیموں کے غمخوار انساں
الٰہی ہمیں ایسے انساں عطا کر

نہ تن کی محبت، نہ دھن کی محبت
دلوں میں فقط ہو وطن کی محبت
الٰہی ہمیں ایسے انساں عطا کر

محمدؐ کے دامن سے وابستگی ہو
خدا کے لیے دوستی، دشمنی ہو
الٰہی ہمیں ایسے انساں عطا کر
(آثر صہبائی)

صہبائی

اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے

جو عمر کو مفت گنوائے گا — وہ آخر کو پچھتائے گا
بیٹھے کچھ ہاتھ نہ آئے گا — جو ڈھونڈے گا وہ پائے گا
تو کب تک دیر لگائے گا — یہ وقت بھی آخر جائے گا
اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے
پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

اب دنیا کا وہ رنگ نہیں — وہ طرز صلح و جنگ نہیں
اغیار کا تو پاسنگ نہیں — کیا تجھ کو شرم و ننگ نہیں
گو تاج نہیں، اورنگ نہیں — پر ملک خدا کا تنگ نہیں
اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے
پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

یہ دنیا آخر فانی ہے — اور جان بھی اِک دن جانی ہے
پھر تجھ کو کیوں حیرانی ہے — کر ڈال جو دل میں ٹھانی ہے
جب ہمت کی جولانی ہے — تو پتھر بھی پھر پانی ہے
اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے
پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

(نظیر اکبر آبادی)

اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

دنیا عجب بازار ہے، کچھ جنس یاں کی ساتھ لے
نیکی کا بدلہ نیک ہے، بد دے بدی کی بات لے
میوہ کھلا میوہ ملے، پھل پھول دے پھل پات لے
آرام دے آرام لے، دکھ درد دے آفات لے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

جو چاہے لے چل اس گھڑی، سب جنس یاں تیار ہے
آرام میں آرام ہے — آزار بیچ آزار ہے
دنیا نہ جان اس کو میاں، دریا کی یہ منجدھار ہے
اوروں کا بیڑا پار کر، تیرا بھی بیڑا پار ہے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

کر چک جو کچھ کرنا ہے اب، یہ دم تو کوئی آن ہے
نقصان میں نقصان ہے، احسان میں احسان ہے
تہمت میں یاں تہمت لگے، طوفان میں طوفان ہے
رحمان کو رحمان ہے، شیطان کو شیطان ہے
کلجگ نہیں کر جگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

اپنے نفع کے واسطے، مت اور کا نقصان کر
تیرا بھی نقصاں ہوئے، اس بات پر بھی دھیان کر
کھانا جو کھا تو دیکھ کر، پانی پیئے تو چھان کر
یاں پاؤں کو رکھ پھونک کر، اور خوف سے گزران کر
کلجگ نہیں کر جگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

غفلت کی یہ جاگہ نہیں، یاں صاحب ادراک رہ
دل شاد رکھ دل شاد رہ، غمناک رکھ غمناک رہ
ہر حال میں تو بھی نظیر، اب ہر قدم کی خاک رہ
یہ وہ مکاں ہے او میاں، یاں پاک رہ بے باک رہ
کلجگ نہیں کر جگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

(نظیر اکبر آبادی)

نیک بنو، نیکی پھیلاؤ

سچ بولو، سچے کہلاؤ　سچ کی سب کو ریس دلاؤ
جب اوروں کو راہ بتاؤ　خود رستے پر تم آ جاؤ
قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو نیکی پھیلاؤ

ہے جس گھر میں ایک بھی اچھا　واں نہ رہے گا نام بُرے کا
تم بھی چلن دکھلاؤ کچھ ایسا　جس سے ہو سارے گھر میں اجالا
قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو، نیکی پھیلاؤ

محنت کر کے ہیں جو کھاتے　سب کو وہ محنت سے سکھاتے
جو نہیں ہاتھ اور پاؤں ہلاتے　سب کو اپاہج ہیں وہ بناتے
قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو، نیکی پھیلاؤ

رحم ہے سب کو رحم سکھاتا　ظلم ہے سب کو ظلم سکھاتا
نیک ہے نیکی سب کو بتاتا　بد اوروں کو بد ہے بناتا
قوم کو اچھے کام دکھاؤ
نیک بنو نیکی پھیلاؤ

(حالی)

درد جس دل میں ہو اسکی دوا بن جاؤں

درد جس دل میں ہو اس کی دوا بن جاؤں
کوئی بیمار اگر ہو تو شفا بن جاؤں
دُکھ سے ہلتے ہوئے لب کی میں دعا بن جاؤں

اُف وہ آنکھیں ہیں کہ بینائی سے محروم کہیں
روشنی جن میں نہیں، نور جن آنکھوں میں نہیں
میں ان آنکھوں کے لیے نور ضیا بن جاؤں

ہائے وہ دل جو تڑپتا ہوا گھر سے نکلے
اُف وہ آنسو جو کسی دیدۂ تر سے نکلے
میں اس آنسو کے سکھانے کو ہوا بن جاؤں

دور منزل سے اگر راہ میں تھک جائے کوئی
جب مسافر کہیں رستے سے بھٹک جائے کوئی
خضر کا کام کروں راہ نما بن جاؤں

عمر کے بوجھ سے جو لوگ دبے جاتے ہیں
ناتوانی سے جو ہر روز جھکے جاتے ہیں
ان ضعیفوں کے سہارے کو عصا بن جاؤں

خدمت خلق کا ہر سمت میں چرچا کر دوں
مادرِ پاک کو جنت کا نمونہ کر دوں
گھر گھرے دل میں جو افسردہ دعا بن جاؤں

اندھی لڑائی

کٹے جا رہے ہیں مرے جا رہے ہیں
یہ نادان انسان لڑے جا رہے ہیں

کوئی ان سے پوچھے لڑائی یہ کیوں ہے
مذاقِ نبرد آزمائی یہ کیوں ہے
بشر کی بشر پر چڑھائی یہ کیوں ہے
نہیں جانتے پر لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں مرے جا رہے ہیں

عدو کون ہے اور حمایت ہے کس کی
خصومت ہے کس سے، رفاقت ہے کس کی
مٹانا ہے کس کو، حفاظت ہے کس کی
نہیں جانتے پر لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے مرے جا رہے ہیں

حقیقت میں سب اختلافات کیا ہیں
جہاں اصولی کے نزاعات کیا ہیں
جو کرنے ہیں حل وہ سوالات کیا ہیں
نہیں جانتے پر لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں مرے جا رہے ہیں

کمی ہے نہ کھیتوں میں غلہ کی کوئی
ترقی پہ ہے علم اور آگہی بھی
جہاں کی ضرورت کو ہر شے ہے کافی
بشر پھر بھی بھوکے مرے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں مرے جا رہے ہیں

کبھی امن کا دور آئے گا آخر
نظام تشدد یہ ٹوٹے گا آخر
کبھی خون انساں بھی کھولے گا آخر
اسی آس پر ہم جئے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں مرے جا رہے ہیں

(آنند نرائن ملاؔ)

میں چھوٹا سا اِک لڑکا ہوں

میں چھوٹا سا اِک لڑکا ہوں پر کام کروں گا بڑے بڑے
میں چھوٹا سا اِک لڑکا ہوں

یہ علم کی ہیں جو روشنیاں میں ہر گھر میں لے جاؤں گا
تعلیم کا پرچم لہرا کر میں سرسید بن جاؤں گا
کیا فائدہ جو میں عمر گزاروں گھر میں اپنے پڑے پڑے
میں چھوٹا سا اِک لڑکا ہوں

جتنے بھی لڑاکا لڑکے ہیں ان سب کو نیک بناؤں گا
جو روٹھے ہوئے ہم جولی ہیں ان سب کو ایک بناؤں گا
سب آپس میں مل جائیں گے اب رہتے ہیں جو لڑتے لڑے
میں چھوٹا سا اک لڑکا ہوں

میں چار طرف لے جاؤں گا اقبال نے جو پیغام دیا
میں ہی وہ پرندہ ہوں جس کو تو نے شہباز کا نام دیا
اب میرے پروں سے چمکیں گے سب ہیرے موتی جڑے جڑے
میں چھوٹا سا اک لڑکا ہوں
پر کام کروں گا بڑے بڑے

اڑ کے پہنچو گے تم جس افق پہ
ساتھ جائے گی پرواز میری

چاند تاروں کے اے پاسبانو
میرے نغمے تمہارے لیے ہیں (جمیل الدین عالی)

خواتین کا ترانہ

ہم مائیں
ہم بہنیں
ہم بیٹیاں
قوموں کی عزت ہم سے ہے
قوموں کی عزت ہم سے ہے

ہم معنیٔ مہر و وفا ہم کشمکش ہم ارتقاء
تاریخ نے خود لکھ دیا انساں عبارت ہم سے ہے

ہم مائیں، ہم بہنیں، ہم بیٹیاں
قوموں کی عزت ہم سے ہے

زنجیر استحصال نے روکے ہوئے تھے راستے
اب چل پڑے ہیں قافلے جن میں حرارت ہم سے ہے

ہم مائیں، ہم بہنیں، ہم بیٹیاں
قوموں کی عزت ہم سے ہے

اے دور نو تیری قسم آگے ہی جائیں گے قدم
ہم تیری صف تیرا علم تیری حقیقت ہم سے ہے

ہم مائیں، ہم بہنیں، ہم بیٹیاں
قوموں کی عزت ہم سے ہے (جمیل الدین عالی)

انتخاب مُسدّسِ حالیؔ

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مُرادیں غریبوں کی بَر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے درگزر کرنے والا — بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا — قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مِسِ خام کو جس نے کُندن بنایا — کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا — پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی — عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اِک لگن سب کے دل میں لگا دی — اک آواز میں سوتی بستی جگا دی
پڑا ہر طرف غُل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اُٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

کیا اُمّیوں نے جہاں میں اُجالا — ہوا جس سے اسلام کا بول بالا
بُتوں کو عرب اور عجم سے نکالا — ہر اک ڈوبتی ناؤ کو جا سنبھالا
ہر اِک میکدے سے بھرا جا کے ساغر — ہر اک گھاٹ سے آئے سیراب ہوکر
گرے مثلِ پروانہ ہر روشنی پر — گرہ میں لیا باندھ حکمِ پیمبر
کہ "حکمت کو اک گمشدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو"

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انہی کی لگائی ہوئی ہے
کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے
مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے
خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے

جلال ان کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں
شریعت کے جو ہم نے پیمان توڑے
وہ لے جا کے سب اہل مغرب نے جوڑے

متفرق اشعار

سب ایسے تن آسان و بے کار و کاہل
تمدن کے حق میں ہیں زہر ہلاہل
یہ جب پھیلتے ہیں سمٹتی ہے دولت
یہ جوں جوں کہ بڑھتے ہیں گھٹتی ہے دولت
مگر اک فریق اور ان کے سوا ہے
شرف جس سے نوع البشر کو ملا ہے
نہ راحت طلب ہیں نہ محنت طلب وہ
لگے رہتے ہیں کام میں روز و شب وہ
وہ تھکتے ہیں اور چین پاتی ہے دنیا
کماتے ہیں وہ اور کھاتی ہے دنیا

مشقت کی ذلت جنہوں نے اٹھائی
جہاں میں ملی ان کو آخر بڑائی
نہال اس گلستاں میں جتنے بڑھے ہیں
ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھے ہیں

تمہی اپنی مشکل کو آساں کرو گے
تمہی درد کا اپنے درماں کرو گے
تمہی اپنی منزل کا ساماں کرو گے
کرو گے تمہی کچھ اگر یاں کرو گے

آواز دوست

(اقتباسات)

قبیلہ فرہاد: یہ لوگ بھی عجیب ہیں ان کو اس بات سے ہرگز کوئی دلچسپی نہیں کہ وہ یاد رکھے جائیں گے یا بھلا دیئے جائیں گے۔ غرض ہے تو صرف یہ کہ اس بے ڈھب دنیا کو کیونکر ڈھب پر لایا جا سکتا ہے۔

ان میں سے ہر شخص نے دنیا کو جس حال میں پایا اس سے بہتر حال میں چھوڑا۔ اور یہی بات انہیں عام آدمی سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ لوگ فرہاد کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی ساری عمر پہاڑ کھودتے اور نہر نکالتے گذر جاتی ہے۔ اس نفسا نفسی کی دنیا میں جہاں ہر شخص صرف اپنے لیے زندہ ہے یہ فرہادی گروہ دوسروں کے لیے زندگی لٹا دیتا ہے۔ یہ لوگ دنیا بھر کی مصیبتیں نقد حیات کے عوض خرید لیتے ہیں اور پھر بھی اس سودے میں انہیں خسارہ نہیں ہوتا۔ یہ گروہ نہ ہوتا تو دنیا غیر آباد ہوتی اور یہ گروہ ناپید نہ ہوا تو انسان ماوراء میں بھی ایک نئی دنیا آباد کرے گا۔ اس گروہ کے افراد مختلف زبانیں بولتے ہیں مگر ان کا ترانہ فارسی زبان میں لکھا ہوا ہے۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم　　سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیاباں وکہسار وراغ آفریدی　　خیابان وگلزار وباغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

زندہ شہید: جنگ تو ہر وقت ہر جگہ جاری ہے اور اس کے وار سے نہ کوئی خطہ خالی ہے اور نہ کوئی لحظہ فارغ اس جنگ میں ہر قدم پر قربانی دینی پڑتی ہے اور اس کی بھی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ انتہائی صورت شہادت ہے۔ مگر بعض لوگوں کی قسمت میں ایسی زندگی لکھی جاتی ہے کہ وہ جیتے جی شہید ناز ہو جاتے ہیں اس قبیلہ

کے لوگ زندہ شہید کا درجہ رکھتے ہیں۔

اہل شہادت اور اہل احسان: اہل شہادت اور اہل احسان میں فرق صرف اتنا ہے کہ شہید دوسروں کے لیے جان دیتا ہے اور محسن دوسروں کے لیے زندہ رہتا ہے۔ ایک کا صدقہ جان ہے اور دوسرے کا تحفہ زندگی۔ ایک سے ممکن وجود میں آتا ہے اور دوسرے سے اس وجود کو توانائی ملتی ہے۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی ہوتا ہے جو اس توانا وجود کو تابندگی بخشتا ہے۔ جو لوگ اس آخری گروہ میں شامل ہوتے ہیں انہیں اہل جمال کہتے ہیں۔ اہل جمال کی پہچان یہ ہے کہ یہ لوگ مسجد قرطبہ بھی تعمیر کرتے ہیں اور تحریر بھی۔ یہ الحکم کی طرح بادشاہ بھی ہو سکتے ہیں اور اقبال کی طرح درویش بھی۔ انہیں تخلیق حسن پر مامور کیا جاتا ہے۔ نثر ہو کہ شعر، نقش ہو کہ نغمہ، رنگ ہو کہ خشت و سنگ یہ خون جگر سے اسے یوں تمام کرتے ہیں کہ جو نظر ان کی تخلیق پر پڑتی ہے وہ روشن ہو جاتی ہے اگر ان کی تخلیق میں حسن صورت ہے تو خود ان کی ذات میں بھی ایک حسن ہوتا ہے جسے حسن سیرت کہتے ہیں۔ حسن کی دولت اہل جمال کو اتنی وافر ملتی ہے کہ وہ دوسروں میں تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ یہ تقسیم ان کی زندگی کے بعد بھی جاری رہتی ہے اور اس کی بدولت بدی اور بد نمائی کو پھلنے پھولنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔

زندگی کو ایک گروہ نے ممکن بنایا دوسرے نے توانا، اور تیسرے نے تابندہ جہاں یہ تینوں گروہ موجود ہوں وہاں زندگی موت کی دسترس سے محفوظ ہو جاتی ہے اور جس ملک یا عہد کو یہ گروہ میسر نہ آئیں اسے موت سے پہلے بھی کئی بار مرنا پڑتا ہے۔

جس سرحد کو اہل شہادت میسر نہ آئیں وہ مٹ جاتی ہے۔ جس آبادی میں اہل احسان نہ ہوں اسے خانہ جنگی اور خانہ بربادی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس تمدن کو اہل جمال کی خدمات حاصل نہ ہوں وہ خوشنما اور دیرپا نہیں ہوتا۔

نعمت عظمیٰ: خدا اپنی صفات میں انسان کو شامل کرتا ہے اور اس کی زندگی کے سفر

میں بھی اس کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا تحفہ وہ حکمت ہے جو خدا اور کتاب دونوں کی صفات میں پائی جاتی ہے عزیز الحکیم جل شانہٗ نے کتاب الحکیم میں فرمایا ہے:

یوتی الحکمۃ (بقیہ آیت آواز دوست ص پر ہے)

وہ جس کو چاہتا ہے دانائی بخشتا ہے اور جس کو دانائی ملی بے شک اس کی بڑی نعمت ملی۔ اس نعمت کے کئی نام ہیں۔ اہل شہادت کو حکمت ملی تو جنوں کہلائی۔ اہل احسان کو ملی تو خیر کثیر ہو گئی۔ اہل جمال تک پہنچی تو حسن بن گئی۔

عظمت کا راز: ان تمام پیغمبروں میں جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے دو خوبیاں مشترک ہیں ایک تو یہ کہ ان کی زندگی دوسروں کی خدمت، راہنمائی اور اصلاح میں بسر ہوئی اور دوسرے ان کی طبیعت کا وہ استقلال جس کی وجہ سے وہ نہ تو ناکامی میں متزلزل ہوئے اور نہ کامیابی میں متکبر یہ زندگیاں پامردی اور بے لوثی سے دوسروں کے لیے وقف رہیں یہی ان کی عظمت کا راز ہے اور یہی ان زندگیوں سے حاصل ہونے والا سب سے بڑا سبق ہے۔

انسان کی فطرت: انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ بلندی کی طرف مائل پرواز ہو، پستی میں وہ گرتا ضرور ہے مگر وہاں ٹھہر نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ اس کی فطرت کے خلاف ہے، اگر وہ پستی سے ہمیشہ کے لیے سمجھوتہ کرلے تو اس میں اور حیوان اور شیطان میں فرق ختم ہو جائے گا۔ یہی حال انسان کی بلندیوں کا ہے، وہ اگر کسی خاص بلندی پر اکتفا کرلے تو اس میں اور آسمانی مخلوق میں فرق ختم ہو جائے گا انسان اس فرق کو قائم رکھنے پر مصر ہے۔ لہٰذا اس کو نہ ایسی پستی گوارا ہے اور نہ ایسی بلندی پر قرار آتا ہے۔ یہ درست ہے کہ کچھ آدمی پستی کا شکار ہو جاتے ہیں اور بیشتر عام سطح پر رہتے ہیں مگر ایک قلیل جماعت بلندیوں کو سر کرنے نکل پڑتی ہے تاکہ انسان کو اس کا اصل مقام حاصل ہو جائے۔ اس مقام پر پہنچنے والوں کے بارے میں مولانا روم نے کہا ہے۔

بزیر کنگرہ کبریاش مردانند — فرشتہ صید و پیغمبر شکار و یزداں گیر

شکر عطا : عطا کا پہلا حق یہ ہے کہ انسان اس کا شکر ادا کرے دل شکر سے لبریز ہو تو روشن ہو جاتا ہے۔ شکوہ کیجیے تو بجھ جاتا ہے نا شکر گزار ہو تو پتھر بن جاتا ہے۔ شکر گزار ہمیشہ روشن ضمیر اور روشن دماغ ہوتا ہے۔ نا شکر گزار بے ضمیر اور بد دماغ ہو جاتا ہے۔

شکر والدین : انسان نا شکر گزار، زود فراموش، فسادی، اور زود رنج ہے۔ اس لیے ہدایت ہوئی کہ خدا کو یاد کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔ خدا نے والدین کا شکر ادا کرنے کی بھی تاکید کی ہے گویا عبادت میں کسی اور کا ذکر تک داخل ہوا تو وہ شرک اور شکر میں جتنے حصے دار ہوں وہ جائز۔

نا شکر گزاری کا نتیجہ بے ہنری کی صورت میں سامنے آتا ہے اور جہاں نا شکر گزار اور بے ہنر جمع ہو جائیں وہاں منافقت کا دور دورہ رہتا ہے۔ جب اشراف کی حاجت ہی نہ رہے تو کوئی ان کی تلاش اور دلجوئی کیوں کرے۔ ہنرور کی قدر نا شناسی سے بے ہنری کو فروغ ملتا ہے۔ کم ظرف کو سر آنکھوں پر بٹھایا جائے تو اشراف کی عزت میں کمی ہو جاتی ہے منافقت کے لیے یہ فضا بڑی ساز گار ہوتی ہے۔ منافق کے دل میں کچھ ہوتا ہے اور زبان پر کچھ اور، وہ دو قدم زبان کے ساتھ اٹھاتا ہے اور چار قدم دل ہی دل میں پیچھے چلا جاتا ہے۔ جس قافلے میں ایسے مسافر شامل ہوں اسے نہ کبھی سمت ملی ہے اور نہ منزل۔ جہاں سے اسے آگے روانہ ہونا چاہیے وہاں سے وہ پسپائی اور رسوائی کی راہ پر نکل جاتا ہے۔ ایسے کارواں میں عبرت اور ذوق کی کمی اور بے کسی و بے دلی کی فراوانی ہوتی ہے۔ کیونکہ عبرت وہ پکڑتے ہیں جو شکر کرنا جانتے ہوں، ذوق ان میں ہوتا ہے جو شرف و ہنر رکھتے ہوں، تمنا ان کی جواں ہوتی ہے جو منافقت سے نا آشنا ہوں۔ اگر دل شکر کی طرف نہیں آتا۔ دماغ ہنر کی طرف نہیں جاتا اور زبان حق کی طرف مائل نہیں ہوتی تو انسان انسان نہیں

رہتا بلکہ دشت و صحرا میں بدل جاتا ہے۔ جب چاروں طرف بیکراں دشت آدم زاد کی شکل میں پھیلے ہوں تو اس صورتحال کو قحط الرجال کہتے ہیں۔

قائداعظمؒ نے طلبا سے کیا کہا

گمراہ نہ ہوں: میرے نوجوان دوستو! اب میں آپ ہی کو پاکستان کا حقیقی معمار سمجھتا ہوں۔ اور دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنی باری آنے پر کیا کچھ کر کے دکھاتے ہیں۔

آپ اس طرح رہیں کہ کوئی آپ کو گمراہ نہ کر سکے۔ اپنی صفوں میں مکمل اتحاد، استحکام پیدا کریں۔ اور ایک مثال قائم کریں کہ نوجوان کیا کچھ کر سکتے ہیں۔

(جلسۂ عام ڈھاکہ سے خطاب ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء)

پاکستان کب وجود میں آیا: پاکستان اسی دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔

(طلبہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے خطاب ۸ مارچ ۴۴)

اسلامی اصولوں کی تجربہ گاہ: ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلامی اصولوں پر عمل کر سکیں۔ (اسلامیہ کالج پشاور ۱۴ جنوری ۱۹۴۸ء)

تعلیم کی اہمیت: اگر آپ اپنے ساتھ، اپنے والدین کے ساتھ اور اپنی مملکت کے ساتھ انصاف کرنا چاہتے ہیں تو آپ کا خاص کام یہ ہے کہ اپنی تعلیم پر پوری پوری توجہ دیں۔ عملی زندگی کی جدوجہد جو آپ کو در پیش آنے والی ہے اس کے لیے تیاری کا یہ واحد طریقہ ہے۔ صرف اسی طریقے سے آپ اپنی مملکت کے لیے قابل قدر اثاثہ قوت کا سرچشمہ اور باعث فخر بن سکتے ہیں ملک کو جن بڑے سماجی اور اقتصادی مسائل

آزادی قائم رکھنے کے لیے تعمیری کام کرنا حصول آزادی سے کہیں زیادہ مشکل ہے آزادی کے لیے جنگ کرنا یا جیل جانا حکومت چلانے سے کہیں زیادہ آسان ہے۔

(خطاب جلسہ تقسیم اسناد ڈھاکہ یونیورسٹی ۲۴ مارچ ۴۸ء)

نظم وضبط کی ضرورت: کوئی قوم آزاد نہیں ہوسکتی یا اپنی آزادی برقرار نہیں رکھ سکتی اگر اس میں انتشار ہو اس کا نظم وضبط کمزور ہو اور اس کے عوام مصیبت میں ہوں۔ لگاتار محنت اور قربانی کے لیے آمادگی کے بغیر ہم کامیابی کا خواب نہیں دیکھ سکتے۔ نظم وضبط (ڈسپلن) کے بغیر ہماری قوت مدافعت کسی وقت بھی ختم ہوسکتی ہے۔

(نوجوانوں کے نام پیغام ۱۹۴۴ء)

طلبہ عملی سیاست میں حصہ نہ لیں: میں آپ سے بار بار کہہ چکا ہوں کہ آجکل سیاسی حالات میں جو آئے دن نت نئی تبدیلیاں واقع ہورہی ہیں جو نئی نئی صورتیں پیدا ہورہی ہیں آپ ان میں ہرگز کوئی عملی حصہ نہ لیں آپ کی طالب علمی کے زمانے میں آپ پر قوم کا حق، آپ کے والدین کا حق اور خود آپ کا حق جو عائد ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ اپنی تمام تر توجہ اپنی تعلیم پر مرکوز کر رکھیں۔

یاد رکھیئے کہ طالب علمی کے زمانے میں اگر آپ اپنا قیمتی اور بیش بہا وقت تعلیم کے سوا دوسرے مشغلوں میں برباد کر دیا تو یہ ضائع کیا ہوا وقت، یہ برباد کیا ہوا زمانہ، پھر کبھی واپس نہیں آئے گا۔ البتہ جہاں آپ کا سب سے پہلا فرض تحصیل علم میں جد وجہد کرنا ہے۔ وہاں ساتھ ہی ساتھ آپ کو نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ، ساری دنیا میں رونما ہونے والے سیاسی معاشرتی اور اقتصادی حالات کا بھی برابر جائزہ لیتے رہنا چاہیئے۔ اور ان سے بالکل باخبر رہنا چاہیئے اور

(آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے پانچویں سالانہ اجلاس ناگپور سے خطاب ۲۶ نومبر ۱۹۴۱ء)

تعلیم کے بغیر تاریکی ہے: پیسے کے بغیر نداکت ہے بھوک ہے اور تعلیم کے بغیر ظلمت اور تاریکی ہے

کا سامنا ہے ان کے حل کرنے میں آپ صرف یہی طریقہ اختیار کر کے مدد دے سکتے ہیں کہ وہ دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور سب سے زیادہ طاقتور قوموں میں اپنا مقام حاصل کر سکے۔ (خطاب جلسہ تقسیم اسناد ڈھاکہ یونیورسٹی ۲۵ر مارچ ۴۸ء)

قومی شعور: یاد رکھیئے ہم ایک ایسی مملکت کی تعمیر کر رہے ہیں جو تمام عالم اسلام کے امور میں پورا پورا حصہ لے گی۔ اس لیے ہمیں بہت وسیع النظر ہونا چاہیئے۔ ہماری نظر صوبوں کی حدود اور قوم پرستی اور نسل پرستی کی دیواروں کے پار جانی چاہیئے۔ ہمیں وطن کا وہ شعور پیدا کرنا چاہیئے جو ہم سب کو ایک متحد اور مضبوط قوم کے سانچے میں ڈھال دے منزل مقصود تک پہنچنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔

اس منزل مقصود کے لیئے ہم نے زبردست جدوجہد کی ہے۔ اس کی خاطر لاکھوں مسلمانوں نے اپنا سب کچھ بلکہ اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔

(طلبہ اسلامیہ کالج پشاور کے سپاسنامہ کے جواب میں ۱۲ر اپریل ۱۹۴۸ء)

آزادی کے معنی مطلق العنانی نہیں: ہم نے غلامی کی زنجیریں کاٹ ڈالی ہیں۔ اب ہم ایک آزاد قوم ہیں۔ ہماری مملکت ہماری اپنی ہے۔ ہماری حکومت ہماری اپنی ہے۔ لیکن خیال رہے کہ آزادی کے معنی مطلق العنانی نہیں۔ آزادی کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ آپ دوسروں کے مفاد یا مملکت کے مفاد کو نظرانداز کر کے جو چاہیں کریں۔ نہیں بالکل نہیں۔

اب تو آپ پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اب آپ کے لیے ایک متحد اور مضبوط قوم کی حیثیت سے کام کرنا اتنا ضروری ہو گیا ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔

اب ہم سب کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہے تعمیری حوصلہ (اسپرٹ) اب جذبہ جنگ وجدل کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ جذبہ ہم نے اس وقت اپنایا تھا جب ہم حصول آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔

(فرنٹیئر مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن پشاور کے زیر اہتمام اجلاس سے خطاب ۲۵ نومبر ۱۹۴۵ء)

علم اور تلوار: یہ تلوار جو آپ نے مجھے عنایت کی ہے۔ صرف حفاظت کے لیے اٹھے گی لیکن فی الحال آپ کے لیے جو سب سے ضروری امر ہے وہ تعلیم ہے علم تلوار سے بھی زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ جائیے اور علم حاصل کیجیے۔

(اجلاس بلوچستان مسلم لیگ کوئٹہ ۳۰ جولائی ۱۹۴۳ء)

مملکت کا مستقبل اور تعلیم: آپ جانتے ہیں کہ صحیح قسم کی تعلیم کی اہمیت پر جتنا زور دیا جائے کم ہے۔ اگر ہمیں حقیقی ترقی کرنا ہے تو ہمیں سنجیدگی کے ساتھ تعلیم کے مسئلے کو حل کرنا چاہیئے۔ ہمیں اپنی تعلیمی پالیسی اور پروگرام کی تشکیل ان خطوط پر کرنی چاہیئے جو ہمارے قومی ذوق کے مطابق ہوں اور ہماری تاریخ اور ثقافت کے ہم آہنگ ہوں اس کے ساتھ ساتھ موجودہ دور میں جو زبردست ترقی دنیا میں ہوئی ہے اسے بھی اپنا نظام تعلیم وضع کرتے وقت سامنے رکھنا چاہیئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری مملکت کے مستقبل کا انحصار بڑی حد تک اس نظام تعلیم پر ہوگا جو ہم وضع کریں گے اور اس امر پر بھی ہوگا کہ ہم اپنے بچوں کی تربیت کس طرح کرتے ہیں تاکہ وہ پاکستان کے سچے خادم بن سکیں۔ تعلیم کے معنی صرف درسی اور کتابی تعلیم کے نہیں ہیں۔ حالانکہ ہماری درسی تعلیم کی حالت بھی خراب ہے۔

ہمیں تعلیم کے ذریعے آنے والی نسلوں کی توانائی کو بڑھانا ہے۔ اور ان کے کردار کی تشکیل کرنی ہے۔ اس وقت ہمیں سائنسی اور تکنیکی تعلیم و تربیت کی فوری اور اشد ضرورت ہے تاکہ مستقبل میں قوم کی اقتصادی زندگی کی تعلیم ہو سکے۔ اور ہمارے افراد سائنسی اصولوں پر وضع کی ہوئی تجارت صنعت و حرفت کو اختیار کر سکیں۔ دوسرے ممالک بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کر رہے ہیں۔ اس لیے میں فنی اور پیشہ وارانہ تعلیم پر پوری توجہ دینے پر بہت زور دیتا ہوں۔

سب سے پہلے ہمیں آنے والی نسلوں کے کردار کی تعمیر کرنی ہے۔ یعنی نیک نامی، دیانتداری بے لوث قومی خدمت اور احساس ذمہ داری کے شعور کی نشوونما۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم آنے والی نسلوں کو پورے طور پر اس قابل بنا دیں کہ وہ اقتصادی زندگی کے مختلف شعبوں میں اس طرح حصہ لیں جو پاکستان کے لیے باعث عزت ہو۔

(پہلی کل پاکستان تعلیمی کانفرنس کراچی کو پیغام ۲۷ نومبر ۱۹۴۷ء)

توجہ تیکنیکی تعلیم کی طرف ہونی چاہیئے: میرے نوجوان دوستو! آپ کو اپنی توجہ سائنس تجارت، بنکاری، بیمہ، صنعت وحرفت اور تیکنیکی تعلیم کی طرف مبذول کرنی چاہیئے۔ ہماری زندگی میں جو زبردست اور بنیادی تبدیلی واقع ہوئی ہے اسے آپ کو پوری طرح سمجھنا چاہیئے آپ کو صرف سرکاری ملازمت ہی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیئے۔ جیسا کہ آپ اس تبدیلی سے پہلے کرتے تھے۔ آپ کے سامنے اب نئے میدان نئے راستے اور نئی شاہراہیں کھل گئی ہیں جہاں لاتعداد مواقع ہیں۔

(طلبہ اسلامیہ کالج پشاور کے سپاسنامے کے جواب میں ۱۲ راپریل ۱۹۴۸ء)

ذہنی تربیت اور جسمانی صحت: زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری قوم کی کامیابی کا انحصار صحیح ذہنی تربیت اور جسمانی صحت پر ہے۔ آپ کے لیے میرا پیغام یہ ہے کہ جسمانی صحت اور قوت پیدا کیجئے۔ جنگجوئی یا فوج گردی کے لیے نہیں بلکہ سپاہیانہ قوت پیدا کرنے کی خاطر، تاکہ آپ عمر بھر قومی زندگی کے ہر شعبہ میں امن و آشتی بین الاقوامی خیرسگالی اور محبت کا سرچشمہ بنے رہیں۔

(کل پاکستان اولمپک کھیلوں کے موقع پر پیغام ۲۳ راپریل ۱۹۴۸ء)

کام کام اور بس کام: میں آپ کو مصروف عمل رہنے کی تاکید کرتا ہوں۔ کام کام اور بس کام صبر و استقلال اور عجز و انکسار کے ساتھ اپنی قوم کی سچی خدمت کرتے جائیے۔ (آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے چھٹے اجلاس جالندھر

سے خطاب - ۱۵ر نومبر ۱۹۴۲ء)

اپنا اخلاق بلند رکھو: اپنا اخلاق ہر صورت بلند رکھو۔ موت سے نہ ڈرو۔ ہمارا مذہب یہی سکھاتا ہے کہ ہمیں موت کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیئے۔ اسلام اور پاکستان کی عزت بچانے کے لیے ہمیں موت کا مقابلہ بہادری سے کرنا چاہیئے۔ مسلمان کے لیے اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نجات نہیں کہ وہ صداقت کی خاطر شہید کی موت مر جائے۔ (لاہور میں طلبہ سے خطاب، ۳۰ر اکتوبر، ۱۹۴۷ء)

روشن ضمیر بن جائیے: آپ صرف اسی صورت میں دوسروں کے خیالات بدل سکتے ہیں اور ان کو اپنی راہ پر لا سکتے ہیں جب آپ پہلے خود روشن ضمیر بن جائیں اور جو معاملہ پیش آئے اسے مکمل طور پر سمجھ لیں۔

(آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے چھٹے سالانہ اجلاس سے خطاب ۱۵ر نومبر ۱۹۴۲ء)

سچے سپاہی بنو: آپ جو کچھ سوچیں اور جو کچھ کریں وہ عوام کے بے لوث اور سچے سپاہی بن کر کریں اور پاکستان کے مکمل وفادار بن کر کریں۔ آپ کے افکار اور افعال میں متانت اور انکساری ہونی چاہیئے۔

(طلبہ اسلامیہ کالج پشاور کے سپاسنامے کے جواب میں ۱۲ر اپریل ۱۹۴۸ء)

قوم کی تقدیر بنانے میں طلبہ کا کردار: کسی قوم کی خوشحالی کا دارومدار اس کے دانشوروں اور نوجوان نسل پر ہوتا ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی قوم کی تقدیر بنانے میں اس کے طلبہ ایک اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ یہ تعلیم ہی سے ممکن ہے۔ کہ ہم اپنے لوگوں کو ان کے وجود کا احساس دلائیں اور اپنے میں قربانی اور بے لوث خدمت کا جذبہ پیدا کریں۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو کسی قوم یا فرد کو باعزم اور باکردار بناتی ہے۔

(کراچی کے بوہرہ طلبہ کے نام پیغام ۱۳ جنوری ۱۹۴۱ء)

طلبہ کا اصل کام : آپ کا اصل کام کیا ہونا چاہیئے۔

اپنی ذات سے وفا۔

اپنے والدین سے وفا۔

اور اپنی تعلیم پر کامل توجہ

(جلسۂ عام ڈھاکہ سے خطاب ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء)

فولادی کردار پیدا کریں : آپ اپنے میں ایسا کردار پیدا کریں جو فولادی خصوصیات رکھتا ہو۔ تاکہ آپ اپنی قوم کے افراد کی اور اسلام کی خدمت کر سکیں

اسلام نے ہر مسلمان پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ اپنے لوگوں اور اپنی قوم کے کام آئے۔

(کاٹھیاواڑ مسلم طلبہ کانفرنس دھوراجی کے لیے پیغام ، مئی ۱۹۴۵ء)

شاندار روایات : آپ ایک ایسی قوم ہیں جس کی تاریخ شجاعت، کردار اور آہنی ارادے کے لوگوں اور ان کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ اپنی شاندار روایات کے مطابق زندہ رہیئے۔ بلکہ ان میں عظمت وشوکت کے اور باب کا اضافہ کیجیئے۔

(لاہور میں طلبہ سے خطاب ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء)

تفکر، تحقیق اور تجزیئے کے لیے مشقیں

سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو ابھارنا اور بڑھانا تعلیم کا ایک بنیادی مقصد ہے۔ یہ ایک مذہبی فریضہ ہے، قرآن حکیم میں افلا تفکرون ، افلا تعقلون اور افلا تدبرون کے الفاظ بار بار آئے ہیں۔ خود قرآن حکیم کی آیات پر غور فکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (افلا یتدبرون القرآن)

مشہور فلسفی ڈیکارٹ کہتا ہے گویا زندگی

عبارت ہی سوچنے کی اہلیت سے ہے۔

لیکن سوچنا سمجھنا بھی از خود نہیں آجاتا۔ اس کے لیے بھی مشق کرنی پڑتی ہے بدقسمتی سے ہمارا پڑھنے پڑھانے کا طریقہ اور امتحانی نظام Reproductive ہے جس میں سوچنے سمجھنے، تفکر، تدبر اور تعقل سے کام لینے کی زیادہ ضرورت پیش نہیں آتی۔ تعلیم کو تخلیقی Creative بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہر قدم پر تفکر تدبر اور تجزیہ پر زور دیا جائے۔

تفکر و تدبر کی قوت کو جلا دینے کے لیے یہ مشقیں Exercises in Thinking تیار کی گئی ہیں ان کو انفرادی طور پر اور گروپ ڈسکشن کی صورت میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ (تجرباتی طور پر انہیں استعمال بھی کیا گیا ہے)

(۱) جاننے اور سمجھنے میں کیا فرق ہے؟ مثالوں سے واضح کیجیے۔

(۲) معلومات اور علم میں کیا فرق ہے؟ مثالیں دیجیے۔

(۳) ذہانت، قابلیت، وفاداری اور دیانت، شخصیت کی ان صفات کو ان کی اہمیت کے لحاظ سے ترتیب دیجیے۔ اور اس ترتیب کی توجیہہ بھی کیجیے۔

(۴) ہے دوڑتا اشہب زمانہ کھا کھا کے طلب کا تازیانہ

طلب کا تازیانہ سے کیا مراد ہے؟ شعر کی تشریح کیجیے۔

(۵) استاد کے تین کام ہیں۔ بتانا، سکھانا، بنانا، کس رول کی اہمیت زیادہ ہے، اور کیوں؟

(۶) شاہد اور شہید، دونوں لفظوں کا تعلق شہادت، گواہی، سے ہے۔ فرق کیا ہے؟

(۷) کس کام کی مثال دیجیے جو جرم ہو گناہ نہ ہو، لیکن ایسے کام کی بھی جو گناہ ہو، جرم نہ ہو اور ایسے کام کی بھی۔ جو گناہ بھی ہو اور جرم بھی۔

(۸) ایک روز کے اردو انگریزی اخباروں میں شہ سرخیاں یکساں ہوتی ہیں یا مختلف؟ اردو انگریزی صحافت میں اگر کوئی فرق ہے تو کیوں؟

(۹) بہت سے لوگ اپنی رائیں اور اپنے خیالات، اخبارات، رسالوں، کتابوں اور

دوسروں سے لیتے ہیں۔ ان کی اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی۔ کیا یہ تبصرہ صحیح ہے،
صحیح ہے تو کیوں، غلط ہے تو کیوں؟

(۱۰) ذہین بچے ہی زیادہ نمبر لیتے ہیں" اس رائے کے بارے میں کیا رائے ہے؟

(۱۱) جو ہنستا ہے وہ جیتا ہے۔ کیوں؟

(۱۲) ہنسی علاج غم ہے یا غم کا پردہ؟

(۱۳) جرأت کی تین قسموں، جسمانی جرأت (Physical Courage) اخلاقی
جرأت (Moral Courage) اور ذہنی جرأت (Intellectual Courage).
کو اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے ترتیب دیجئے اور اپنی ترجیح کی توجیہہ کیجئے۔

(۱۴) بعض لوگ دوسروں کی عزت کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ یہ خیال رشید احمد صدیقی کا ہے
آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے۔

(۱۵) آدمی کا شیطان آدمی ہے" یہ جملہ پریم چند نے اپنے ایک افسانہ میں لکھا ہے وضاحت
کیجئے۔

(۱۶) پریم چند ہی کا قول ہے" اعتماد یہ بت کا پتھر ہے اکھڑ جائے تو نیچے ہی آتا ہے" وضاحت کیجئے۔

(۱۷) رشید احمد صدیقی نے اپنے مضمون "اپنی یاد میں" لکھا ہے "علم کی کمی خلوص سے پوری ہو جاتی ہے
خلوص کی کمی کسی چیز سے پوری نہیں ہوتی" تبصرہ کیجئے۔

(۱۸) اقبال کا مشہور شعر ہے۔

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا پر دم ہے اگر تو، تو نہیں خطرۂ افتاد

پر دم ہونے سے کیا مراد ہے؟

(۱۹) غالب کا شعر ہے۔

بسکہ مشکل ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

آدمی ہونے اور انسان ہونے میں کیا فرق ہے؟

(۲۰) ڈاکٹر جمیل جالبی نے چراغوں کی قطار کے پیش لفظ میں لکھا ہے۔ آدمی طبعی عمل سے

پیدا ہوتا ہے۔ انسان تہذیبی عمل سے بنتا ہے۔

غالب کے شعر اور ڈاکٹر جالبی کے قول میں کوئی فرق ہے ؟

یا ایک ہی خیال کو مختلف لفظوں میں بیان کیا گیا ہے ؟

(۲۱) خون کا کردار سے کوئی تعلق ہے ؟

(۲۲) مارشل ریس (Martial Race) کے نظریئے پر بحث کیجئے ؟

(۲۳) کیا خیال صحیح ہے کہ گیہوں، کھانے والی قومیں ذہین ہوتی ہیں اور چاول مچھلی کھانے والی قومیں باغیانہ مزاج رکھتی ہیں ؟

(۲۴) کیا یہ خیال صحیح ہے کہ بھینس کا دودھ مسلسل پیتے رہنے سے ذہن سست اور گائے کا دودھ پینے سے ذہن تیز ہو جاتا ہے ؟

غذا اور ذہن کا کوئی تعلق ہے ؟

(۲۵) ایک دانا کا قول ہے "زندگی انعام بھی ہے اور آزمائش بھی" وضاحت کیجئے۔

(۲۶) ایک چینی مصنف نے لکھا ہے :

ایک اچھی کتاب کو نوجوانی میں پڑھنا ایسا ہے جیسے چودھویں کے چاند کو گھر کے دریچے سے دیکھا جائے۔ ادھیڑ عمر میں اسی کتاب کو پڑھنا ایسا ہے جیسے چودھویں کے چاند کو گھر کے آنگن سے دیکھا جائے۔ بڑھاپے میں اسی کتاب کو پڑھنا ایسا ہے جیسے اسی چاند کو کسی میدان میں دریا کے کنارے کھڑے ہو کر دیکھا جائے۔" یہ فرق کیوں ؟

(۲۷) دو مشہور مصرعے جواب ضرب المثل بن چکے ہیں۔

ع جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

ع اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اگر آپ کو یاد ہو تو آئے ہم کن کن موقعوں پر ؟

(۲۸) مخالفت اور اختلاف کرنے میں کیا فرق ہے ؟

(۲۹) جب انسان اپنے کمال کو پہنچتا ہے تو اس کی نظر اپنی خامیوں پر زیادہ پڑتی ہے
کیا یہ صحیح ہے؟ اگر ہے تو کیوں؟

(۳۰) جو خدا سے ڈرتا ہے اس سے خدائی ڈرتی ہے۔ واقعی؟

(۳۱) احسان ناخدا کا اٹھائے میری بلا۔ کشتی خدا پہ چھوڑ دوں، لنگر کو توڑ دوں۔

(۳۲) اس مضمون کا کوئی اور شعر یاد ہے؟ اس کا مطلب؟ یہ شعر کس کا ہے؟
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے   ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

(۳۳) عمر کے ساتھ ساتھ ہیروز بدلتے رہتے ہیں یا وہی رہتے ہیں؟ کیوں؟

(۳۴) ہیرو ورشپ (Hero worship) کا کیا مطلب ہے؟ ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ
نام کی ایک کتاب بھی ہے۔ کس نے لکھی ہے؟

(۳۵) اقبال کا مصرعہ ہے۔ یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے، نہ ناری ہے؟
دوسرا مصرعہ کیا ہے؟ اور شعر کا مطلب کیا ہے؟

(۳۶) اقبال کی فارسی کتاب جاوید نامہ میں شرف النساء کے محل کے تذکرہ میں آیا ہے:
اگر قرآن نہ ہو تو انسان تلوار کا صحیح استعمال نہیں کر سکتا اور اگر تلوار نہ ہو تو قرآن کے
دشمنوں کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ قرآن اور تلوار کے تعلق پر بحث کیجئے۔ اقبال نے بال جبریل
میں لکھا ہے۔ عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد
یہ وہی جاوید نامہ کا خیال ہے یا کوئی نئی بات ہے۔

(۳۷) جنگ میں دونوں فریقوں کی Achille's Heel ہوتی ہے بلکہ بڑے سے
بڑے انسان کی بھی' Achille's Heel کا کیا تصور ہے۔

(۳۸) دشمن پر اپنی ہیبت طاری کر کے اس کے دل سے عزم ویقین چھین لینا اس کے سواروں
کے ساتھ لڑنے سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔
سکندر اعظم کے اس قول میں کیا نکتہ ہے؟

(۳۹) شجاعت اور سخاوت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تلوار کا دھنی اکثر دل کا غنی ہوتا ہے۔ چودھری افضل حق کے اس قول پر تبصرہ کیجئے۔

(۴۰) یہ دور اپنے سقراط کی تلاش میں ہے۔

سقراط کس بات کی علامت ہے؟

(۴۱) مولانا محمد علی جوہر کا شعر ہے۔

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اس کا پہلا مصرعہ کیا ہے؟

اس مصرعہ میں ہر کربلا سے کیا مراد ہے؟ کیا ہر انسان کی اپنی کربلا بھی ہوتی ہے؟

(۴۲) مختار مسعود نے آواز دوست میں لکھا ہے؛

"رزق ہی نہیں بعض کتابیں بھی ایسی ہوتی ہیں جن کے پڑھنے سے پرواز میں کوتاہی آتی ہے"

آپ کا کیا خیال ہے؟ دلیلوں سے ثابت کیجئے۔

(۴۳) ایران کی مہم میں سکندر اعظم نے اپنے چیف آف سٹاف پارمینو سے کہا۔

(I do not want to steal victory)

فتح چرانے کا مطلب کیا ہے؟

(۴۴) ایک فرانسیسی ضرب المثل ہے۔

(To understand all, is to forgive all)

اس کا کیا مطلب ہے؟

(۴۵) آواز دوست کا ہی فقرہ ہے۔

"بڑے آدمی زندگی میں کم، کتابوں میں زیادہ ملتے ہیں" کیوں؟

(۴۶) "دولت اور فراغت سے اشخاص بدلتے نہیں بے نقاب ہوتے ہیں" یہ فقرہ رشید احمد صدیقی کا ہے۔ اس رائے پر رائے دیجئے۔

(۴۷) پریم چند نے ایک انشائیہ میں لکھا ہے!

سزا غلطیوں کی دینی چاہیئے نہ کہ خامیوں کی" آپ کا کیا خیال ہے؟ کوئی دلیل؟ زمانے کی عادت کیا ہے؟

(۴۸) مشہور مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کا فقرہ ہے۔

"بات بہت بری لگی سچ ہوگی"

سچی بات بری کیوں لگتی ہے؟

(۴۹) حالی کا شعر ہے۔

ہم نہ کہتے تھے حالی چپ رہو   راست گوئی میں ہے رسوائی بہت   کیوں؟

(۵۰) قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں"

یہاں حسین نام ہے یا علامت؟

اگر علامت ہے تو کس چیز کی علامت؟ اقبال کا اصل کلام کیا ہے؟

(۵۱) اقبال ہی کا شعر ہے۔

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے   کہ ترے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

طوفان سے کیا مراد ہے؟

(۵۲) حالی کا شعر ہے۔

حالی نشاط نغمہ مے ڈھونڈتے ہو اب   آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں

وقت صبح آنے کا کیا مطلب ہے؟

نشاطِ نغمہ و مے، سے کیا مراد ہے؟

۵۱) حالی ہی کا شعر ہے۔

یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا   ہم محو نالہ جرس کارواں رہے

کیا یہ ملت اسلامیہ کی پسماندگیوں کا ماتم ہے؟ یا یہ تیسری دنیا کا المیہ ہے؟

(۵۴) ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔ نہ کوئی بندہ رہا نہ بندہ نواز
اور مسجد سے باہر؟

(۵۵) تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول آخر کیوں؟

(۵۶) پہلی وحی جو رسول کریمؐ پر نازل ہوئی اس کا پہلا لفظ تھا اقرا۔ ایک مفکر نے لکھا ہے کہ یہ اشارہ روشن ضمیری اور روشن دماغی کی طرف تھا اس نکتہ میں کیا نکتہ ہے؟

(۵۷) ایک حدیث ہے: ایک حبشی غلام زیادہ بلند ہے ایک قریشی نسب عربی مسلمان سے اگر اس میں تقویٰ زیادہ ہو۔ خطبہ حجۃ الوداع میں اس مفہوم کے الفاظ تلاش کیجیے۔

(۵۸) بال جبریل کی مشہور نظم طارق کی دعا کا شعر ہے۔

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا خبر میں نظر میں اذانِ سحر میں

خبر، نظر اور اذان سحر سے کیا مراد ہے؟

(۵۹) اقبال نے اسرار خودی میں لکھا ہے۔ "سوال سے خودی ضعیف ہوتی ہے"۔ کس طرح؟

(۶۰) چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے
کیوں؟

(۶۱) غالب کا مصرعہ ہے۔

چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو۔ چشم تنگ اور کثرت نظارہ سے کیا مراد ہے؟

(۶۲) جہل کے عربی میں لغوی معنی کیا ہیں؟ ابوجہل کو ابوجہل کیوں کہتے ہیں۔ کیا وہ عام معنوں میں ان پڑھ یا جاہل تھا؟

(۶۳) حالی کا شعر ہے۔

زمانہ کی خو ہے نکتہ چینی کچھ اس کی پرواہ نہ کیجیے گا

نکتہ چینی کی نفسیات کیا ہیں؟

(۶۴) چینی دانشور چانگ چاؤ نے کہا ہے؛

ادبی کتابیں سمٹی ہوئی دنیا ہیں اور دنیا ایک پھیلی ہوئی کتاب ہے ۔ تبصرہ کیجیے۔

(۶۵) عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اقبال کے اس شعر کے پس منظر پر بحث کیجیے۔

(۶۶) فرشتہ سے بڑھ کر ہے انسان بننا

یہ حالی کے ایک مشہور شعر کا مصرعہ اولیٰ ہے اور اس کا دوسرا مصرعہ کیا ہے

انسان بننا فرشتہ سے بڑھ کر کیوں ہے ؟

(۶۷) اے گلستان اندلس وہ دن ہیں یاد تجھ کو تھا ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا

اندلس کی ڈالیوں کا آشیاں کب اجڑا ؟ اور کیوں اس کے پہلے تنکے کس نے جمع کیے تھے۔

(۶۸) ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی۔

چنگاری کا اشارہ کس کی طرف ہے ؟ اب خاکستر کا کیا حال ہے ؟

(۶۹) اہل دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہل نظر۔ اہل نظر کمیاب کیوں ہوتے ہیں۔

(۷۰) مارک ٹوئن کے ناول (Adventures of Tom Swayer). کا ایک

فقرہ ہے (All sufferings have their rewards)

آپ کی کیا رائے ہے۔

(۷۱) کسی صاحب نظر کا فقرہ ہے "ناپاک پانی سے وضو نہیں ہوسکتا" اس کا کیا مطلب ہے ؟

(۷۲) ایک فلسفی نے کہا ہے ۔

ہنسنا اور ہنستے رہنا دکھ سہنے کا بہت اچھا طریقہ ہے ۔ آپ کا کیا خیال ہے ؟

(۷۳) تندیٔ باد مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

عام لوگ اس شعر کو اقبال کا شعر کیوں سمجھتے ہیں ؟ ویسے باد مخالف کے بارے میں آپ کا کیا تجربہ ہے ؟

(۷۴) Strain اور Stress میں انسان بدلتا ہے یا بے نقاب ہوتا ہے ؟

(۷۵) غالب کا مصرعہ ہے : جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

کیوں ؛ زندگی کے بارے میں یہ کون سا رویّہ ہے۔

(۷۶) غالب ہی نے کہا ہے۔

کام اچھا ہے وہی جس کا مآل اچھا ہے۔

اور ہے خیال حسن میں ،حسن عمل کا سا خیال

آپ کا کیا خیال ہے ؟

(۷۷) اقبال نے کہا ہے : زندگی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ

کوہکن کے دل سے ہی کیوں ؟

(۷۸) بڑے آدمی اور عظیم آدمی میں کیا فرق ہے؟

(۷۹) رشید احمد صدیقی نے گنجہائے گراں مایہ میں لکھا ہے۔

"میں علم کا نہیں ، معلم کا قائل ہوں" کیوں ؟

(۸۰) اشتہار بازی کا بنیادی اصول (Conditioning) ہے اس نفسیاتی اصطلاح کا کیا مطلب ہے؟

(۸۱) چودھری افضل حق کی کتاب "محبوب خدا" میں یہ فقرے ملتے ہیں۔

ریاکار کا ڈھول دور سے بہت سہانا معلوم ہوتا ہے اسے قریب سے دیکھئے تو اس کا پول کھل جاتا ہے۔ نیک آدمی کے متعلق دور رہ کر بدگمانیاں رہتی ہیں۔ قرب اس کی محبوبیت کو بڑھا دیتا ہے۔ جو موتی ریت کی تہہ میں پائے جاتے ہیں درشہوار بنتے ہیں۔

(۸۲) ۔ (Common Sense) کا نظریہ ارسطو نے پیش کیا تھا۔ آج کل کامن سینس کو کیا کہتے ہیں؟

(۸۳) غالب کا شعر ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

وضاحت کیجئے۔

۸۴ ۔ حالی کا شعر ہے۔

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں   مجھے کچھ کہنا ہے اپنی زباں میں

محرم کیوں نہیں ملتا؟ تنہائی بڑے آدمیوں کا مقدر کیوں ہوتی ہے؟

(۸۵) (Communication Gap) کیا ہوتا ہے؟

(۸۶) مثنوی اسرار و رموز میں اقبال نے لکھا ہے۔

انسان کے لیے دشمن ایسا ہی ہے جیسے کھیتی کیلئے بادل و بارش   کیسے؟

(۸۷) ایک ماہر نفسیات کہتا ہے۔" حافظہ بھی خواہشات کے تابع ہوتا ہے" واقعی؟

(۸۸) "آوازِ دوست" میں مختار مسعود نے لکھا ہے۔

"دل شکر سے لبریز ہو تو روشن ہو جاتا ہے شکوہ کیجئے تو بجھ جاتا ہے ناشکر گزار ہو تو پتھر بن جاتا ہے"

کیسے؟

(۸۹) آوازِ دوست ہی کا فقرہ ہے۔

"نئی بنیادیں وہی لوگ بھر سکتے ہیں جو اس راز سے واقف ہوں کہ پرانی بنیادیں کیوں بیٹھ گئیں"

اس پر تبصرہ کیجئے۔

(۹۰) آوازِ دوست کا ایک اور فکر انگیز فقرہ ہے:

"بعض آدمیوں کی زندگی میں بڑائی کا ایک دن آتا ہے اس دن کے ڈھلنے کے بعد ممکن ہے کہ ان کی باقی زندگی اس بڑائی کی نفی میں گزر جائے" تبصرہ کیجئے۔

(۹۱) (Peck Order) کیا ہوتا ہے؟

(۹۲) حسد احساسِ کمتری کی وجہ سے ہوتا ہے۔ کیا یہ نفسیاتی نکتہ صحیح ہے؟

(۹۳) بعض والدین بھی بڑے (Possessive) ہوتے ہیں۔ مطلب؟

(۹۴) ایک اطالوی فلسفی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اکثر صبح سویرے روم کے ایک ایسے

چوراہے پر کھڑا ہو جاتا جہاں سے سکول جاتے ہوئے بچے گزرتے ہوتے بوڑھا فلسفی انہیں ہاتھ اٹھا کر سلام کرتا۔ کسی کے پوچھنے پر اس نے کہا۔ "میں مستقبل کو سلام کر رہا ہوں"۔ مستقبل کو سلام کرنے کا کیا مطلب ہے؟

(۹۵) شیکسپیئر نے اپنے ڈرامہ (King Lear) میں ایک کلاسیکی فقرہ لکھا ہے۔

Ripeness is All کس طرح؟

(۹۶) ماہرین تحلیل نفسی (Psycho-Analysis) نے فرائڈ کے حوالے سے ذہن (Mind) کے تین درجے کیے ہیں شعور Conscious) لاشعور (Unconscious) اور تحت الشعور (Subconscious) ان تصورات کی وضاحت کیجیے۔

(۹۷) روسی سائنسدان (Pavlov) نے ۱۹۰۷ میں Conditioning) کے عمل پر کامیاب تجربات کیے۔ یہ عمل کیا ہے۔

(۹۸) ٹی وی کے اشتہاروں کے پیچھے (Conditioning) کا اصول ہوتا ہے۔ کیسے؟

(۹۹) ہر تخلیق یا دریافت سے پہلے ایک طویل خاموشی یا ذہنی تیاری کا دور ہوتا ہے مثلاً

Newton's long incubation period preceeding his discovery of the Law of Gravity was brought to its conclusion, when he saw an apple fall.

(Incubation) کا مفہوم کیا ہے۔ نیوٹن سے پہلے لاکھوں آدمیوں نے لاکھوں بار سیبوں کو زمین پر گرتے دیکھا ہو گا۔ انہوں نے کشش ثقل کا اصول دریافت کیوں نہ کیا؟

(۱۰۰) تخلیقی عمل (Creative Process) کیا ہوتا ہے؟

(۱۰۱) کیا قوت تخلیق سراسر خداداد ہوتی ہے؟

(۱۰۲) یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ یزداں بکمند آور کا مطلب کیا ہے؟

(۱۰۳) صحیح کام کو غلط طریقے سے کرنے اور غلط کام کو صحیح طریقے سے کرنے اور صحیح کام کو صحیح

طریقے سے اور غلط کام کو غلط طریقے سے کرنے کا مطلب کیا ہے ؟

(۱۰۴) غلط جگہ شہید ہونے کا مطلب کیا ہے ؟

(۱۰۵) (E.S.P) (Extra Sensory Perception)
حقیقت ہے یا افسانہ ؟

(۱۰۶) آلڈس ہکسلے (Aldous Huxley) کے ناول (The Brave New World)
کے حقیقت بننے کا کتنا امکان ہے؟ اور (Animal Farm) کی تھیم (Theme)
کیا ہے ؟

(۱۰۷) ایک مفکر کا قول ہے (Every Opinion reacts on the one who Utters it)
کیسے ؟

(۱۰۸) (Blame is easier than praise) کیوں ؟

(۱۰۹) ایک فلسفی کا قول ہے۔ (Every vice is only an exaggeration).
اس پر تبصرہ کیجیے۔

(۱۱۰) لوگوں کے نکالے ہوئے (Conclusions) اتنے غلط نہیں ہوتے جتنے ان کے
مفروضے (Premises) یہ صحیح ہے یا غلط، صحیح ہے تو کیوں، غلط ہے تو کیوں۔

(۱۱۱) (The Devil Quoting Scriptures) کا کیا مطلب ہے ؟

(۱۱۲) (Rationalization). کا مطلب کیا ہے ؟

(۱۱۳) (Credibility Gap) کا مطلب کیا ہے ؟

(۱۱۴) (Generation Gap) کا مطلب کیا ہے ؟

(۱۱۵) (Communication Gap). کیا ہوتا ہے ؟

(۱۱۶) برٹرنڈ رسل کے ایک مضمون کا عنوان ہے۔
(The Harm That Good Men Do) وہ کیسے ؟

(۱۱۷) رسل ہی نے ایک جگہ لکھا ہے (To be happy is to be good)

کس طرح ؟

(۱۱۸) ایک لیڈر کے بارے میں ایک مبصر نے کہا۔

(He is not bad; he is only weak)

(۱۱۹) ملٹن کی مشہور نظم فردوس گم شدہ (Paradise Lost) میں شیطان اپنی ذریات سے ایک جگہ کہتا ہے۔ (To be weak is to be miserable)

(۱۲۰) کیسے ؟

(۱۲۱) ملٹن نے اپنی نظم (On His Blindness) میں لکھا ہے۔

They also serve who only stand and wait.

کس طرح ؟

(۱۲۲) (Narcisism) کیا ہوتا ہے ؟

(۱۲۳) (Scape Goat) کا نظریہ کیا ہے ؟

(۱۲۴) مولانا محمد علی جوہر کا شعر ہے۔

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

دورِ چرخ ، ساغر ، اور میکدہ کی علامتوں کی وضاحت کیجیے۔

(۱۲۵) غالب کا شعر ہے۔

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

اس شعر کے پس منظری مضمرات کیا ہیں ؟

(۱۲۶) خلیل جبران نے ایک جگہ لکھا ہے۔

جس کے ساتھ تم ہنستے ہو اسے تم بھول سکتے ہو لیکن جس کے ساتھ تم روتے ہو اسے نہیں بھول سکتے۔

کیوں؟

(۱۲۷) اکبر الہ آبادی کا ایک شعر ہے۔

تو دل میں آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا   بس جان گیا میں، تیری پہچان یہی ہے

اللہ جل جلالہ، کے وجود پر یہ دلیل عقلی ہے یا جذباتی؟

(۱۲۸) اکبر الہ آبادی ہی کا ایک شعر ہے۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا   افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اس شعر کا تاریخی پس منظر کیا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے کالج کو کس چیز کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔

(۱۲۹) امریکی مفکر ایمرسن کہتا ہے۔

In nature nothing can be given free. All things are sold. Everything has its price, and if that price is not paid, not that thing but something else is obtained. It's impossible to get anything without its price.

طلبہ کی زندگی میں اس کلیہ کا اطلاق کیسے ہو گا۔

(۱۳۰) ایک ماہر تعلیم لکھتا ہے:

"The impulse to blame others is a defensive measure so ingrained in nature that psychologists say, if you want to find out a man's weak points, note the failings he has quickest eye in others".

اس قول کو ذرا کریدیئے۔ آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے۔

(۱۳۱) لنکن کا مشہور فقرہ ہے۔ You can fool some of the people all the time and all of the people some of the time, but you can not fool all of the people all of the time.

راسپوٹین کے حوالے سے اس قول پر بحث کیجیے۔

اندھی عقیدت کا راز کیا ہے؟

(۱۳۲) پیر ریاکار ہو تو ہو مرید کبھی ریاکار نہیں ہوتا۔ اس رائے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

(۱۳۳) ایک زوردار فقرہ ہے۔

زیادہ چالاک بننے کی بے وقوفی سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیئے۔ اس کا تجزیہ کیجیے۔

(۱۳۴) ایک ماہر نفسیات کہتا ہے۔

We do not see with our eyes, we see with our brain, we do not hear with our ears, we hear with our brain.

صحیح ہے یا غلط؟ کیسے؟

(۱۳۵) (Inferiority Complex) اور (Inferiority feeling)

میں کیا فرق ہے۔ ترقی کی تحریک کس سے ہوتی ہے۔

(۱۳۶) جارج واشنگٹن کا ایک قول ہے۔

To be prepared for war is one of the most effective means of preserving peace.

کیسے؟

(۱۳۷) ایک انگریزی نظم کا ایک خوبصورت فقرہ ہے۔

Only the actions of the just smell sweet and blossom in their dust.

یہ صرف خوبصورت الفاظ ہیں یا کچھ حقیقت بھی ہے۔ کیسے ثابت کیجیے؟

(۱۳۸) خلیل جبران نے اپنی کتاب "اس نے کہا" میں استادوں سے کہا ہے۔

تم اپنی محبت اپنے بچوں کو دو، جس قدر دے سکو مگر اپنا تخیل نہ دو، وہ اپنا تخیل اپنے ساتھ لائے ہیں"

اس خیال کے بارے میں کیا خیال ہے۔

(۱۳۹) کلچر اور انارکی (Sweetness and Light) نامی کتاب میں میتھو آرنلڈ نے کلچر کو کہا ہے۔ اس نظریہ کی وضاحت کیجیے۔

(۱۴۰) مشہور امریکی شاعر ادیب اور دانشور ایمرسن اپنے نظریہ مکافات عمل کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

The retribution may follow late after the offence, but follow it must because it accompanies it. Crime and punishment grow out of the pleasure which concealed it. For the effect already blooms in the cause. The end pre-exists the means. The fruit is in the seed. You cannot do wrong and get away with it. The thief only steals from himself.

اس آخری فقرہ پر خاص طور پر غور کیجیے اور تجزیہ کیجیے۔

(۱۴۱) اقبال نے بھی کہا ہے۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
اس شعر پر ایمرسن کے نقطۂ نظر کی روشنی میں بحث کیجیے۔

(۱۴۲) ایمرسن نے اپنی مضامین میں (Law of Compensation) پر بحث کی ہے۔ خدا کچھ چھینتا ہے تو کچھ اور دیتا بھی ہے۔ کوئی محرومی کسی اور نعمت سے خالی نہیں ہوتی۔ دھوپ چھاؤں کا کھیل ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ ایمرسن کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

Every advantage has its tax. Our strength grows out of our weakness. Every man in his life time needs certain compensation. Every excess causes a deficiency, every deficiency an excess. Nature, thus, balances every gift and defect.

تبصرہ کیجیے۔

(۱۴۳) آوازِ دوست میں مختار مسعود نے لکھا ہے۔

افراد اور اقوام واقعات سے ہمیشہ اپنے مزاج کے مطابق سبق لیتے ہیں؟ صحیح ہے یا غلط؟ کیسے؟

(۱۴۴) ایک فلسفی کا قول ہے۔

A good man can afford to be good all the time but a bad man can not afford to be bad all the time.

ذرا گہرائی میں جا کر بحث کیجیے۔

(۱۴۵) (Sublimation) کا نظریہ کیا ہے۔

(۱۴۶) اقبال کا شعر ہے۔

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

(۱۴۷) نفسیاتی اصطلاح میں (Trauma) اور (Syndrome) کسے کہتے ہیں۔

(۱۴۸) خلیل جبران کا فقرہ ہے:

ہم سب تنہائی کے جزیروں میں محصور ہیں۔ باتیں کرتے رہتے ہیں تاکہ تنہائی محسوس نہ ہو۔" واقعی؟

(۱۴۹) ایمرسن کہتا ہے۔ It's a luxury to be understood

یہ LUXURY ہے یا زندگی کی ایک ضرورت؟ دوسروں سے (Communication) اتنا مشکل کیوں ہوتا ہے؟

(۱۵۰) اقبال کا شعر ہے ؎

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بہ گل بھی ہے انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

پابندیوں سے آزادی کس طرح حاصل ہوتی ہے؟

(۱۵۱) اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی۔ من میں ڈوبنے کا کیا مطلب ہے؟

(۱۵۲) سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں؟

کس طرح؟

(۱۵۳) غواص محبت کا اللہ نگہبان ہو

محبت کی غواصی میں اتنے خطرات کیوں ہوتے ہیں؟

(۱۵۴) ۱۹۳۲ء میں جب علامہ اقبال تیسری گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں ملکہ این کے محل لندن میں ٹھہرے ہوئے تھے تو علی گڑھ اور لاہور کے چند مسلمان ریسرچ اسکالرز ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے مقالوں THESES کے بارے میں ان کی رہنمائی چاہی۔

علامہ نے جواب دیا۔

صرف ڈگری لینے کی خاطر ریسرچ کرنا لاحاصل ہوگا۔ علم حاصل کرو اور علم پیدا بھی کرو۔ علم حاصل کرنے اور علم پیدا کرنے میں کیا فرق ہے۔

(۱۵۵) جب قائداعظمؒ ۱۹۴۷ء میں کلکتہ میں منعقدہ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جلسہ میں نوجوان مسلم طلباء سے خطاب فرما چکے تو بعض پرجوش اور مخلص طلبا نے قدرے پریشان ہو کر کہا۔

" سر آپ کے بعد کیا ہو گا؟"

قائداعظمؒ نے مسکرا کر فرمایا۔

مجھے یقین ہے تمہیں میں سے بہت سے جناح پیدا ہوں گے۔

"I'm sure many Junnah' will arise from amongst you".

بہت سے جناح پیدا ہونے کا کیا مطلب ہے؟

(۱۵۶) مشہور مورخ ٹائینی (Toynbee) نے اپنی تاریخ میں ایک یونانی شاعر کی چار مصرعوں کی ایک نظم نقل کی ہے۔

I was running a race with the Reaper
I hastened, he tarried, I won
Now, strike Death! You sluggard, you sleeper
You can't undo what I have done.

شاعر نے موت کو کس طرح شکست دی؟

(۱۵۷) لارڈ ایکٹن کا قول ہے

Power corrupts, and absolute power corrupts absolutely.

کیوں، کیسے تجزیہ کیجئے۔

(۱۵۸) ایک دانشور کہتا ہے۔

Our very defects are shadows of virtues. Every vice is only an exaggeration.

" اثر ہر بات کا ہر شخص پر یکساں نہیں ہوتا "

کیوں؟

کیسے ؟ بحث کیجیے۔

(۱۵۹) غالب کا ایک مصرعہ ہے۔ ع درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

وہ کیسے ؟

(۱۶۰) غالب ہی نے ایک اور جگہ کہا ہے۔

ع رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

نفسیاتی نقطۂ نظر سے توجیہہ کیجیے۔

(۱۶۱) امریکی شاعر ایڈون مارکھم (Edwin Markham) لکھتا ہے۔

He drew a circle that shut me out
Heretic, rebel a thing to flout,
But I love, I had the wit to win,
I drew a circle that took him in

تیسرے مصرعہ پر غور کیجیے۔

(۱۶۲) (To be or not to be, that's the question)

یہ جملہ شیکسپیئر کے ڈرامہ ہیملیٹ کا ہے۔ زندگی میں آپ کو کسی ہیملٹ سے واسطہ پڑا ہے ؟ یہ جملہ کس ذہنی کیفیت کا غماز ہے ؟

(۱۶۳) چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ، ہوں زندگی دشوار ہو جائے

وہ کیسے اور کیوں ؟

(۱۶۴) نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے !
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

نشہ پلا کے گرانے سے کیا مراد ہے۔

(۱۶۵) اقبال ہی کا شعر ہے۔

فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں

خبر نہیں رَوِشِ بندہ پروری کیا ہے

خواجگی اور رَوِش بندہ پروری سے کیا مراد ہے؟

(۱۶۶) اقبال کا ہی مصرعہ ہے۔

زاغوں کے تصرف میں، عقابوں کے نشیمن

زاغ اور عقاب، کن کرداری رویّوں کی علامتیں ہیں؟

(۱۶۷) پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں

کرگس کا جہاں اور ہے، شاہین کا جہاں اور

اس شعر کا نکتہ کیا ہے؟ فضا اور جہاں سے کیا مراد ہے؟

کرگس اور شاہیں کسے کہا گیا ہے؟

رومی کا شعر ہے۔ علم را بر تن زنی مارے بود

علم را بر جاں زنی یارے بود

علم کو تن اور جان پر مارنے کا کیا مطلب ہے اور فرق کیا ہے۔

(۱۶۸) انگریزی کی ایک نظم ہے۔

We are here not to play, to dream, to drift
We have hard work to do and loads to lift
Shun not the struggle, 't's God's gift

شاعر نے جدوجہد (Struggle) کو تحفۂ خداوندی (God's gift) کیوں کہا ہے؟ اس بند کو پڑھ کر اُردو کے کسی شاعر کا کوئی شعر یاد آیا۔

(۱۶۹) اقبال نے ایک بار فرمایا تھا۔

ما عرضِ حیات خواہیم، طولِ حیات نمی خواہیم

یعنی ہم عرضِ حیات چاہتے ہیں طولِ حیات نمی خواہیم

عرض حیات اور طول حیات کا تصور کیا ہے ؟
انگریزی کے ان اشعار پر غور کیجئے ؟

We live in needs, not years; in thoughts not breaths;
If feelings, not figures on a deal
We should count time by heart throbs. He most lives
We thinks most, feels the noblest, acts the best

(۱۷۰) زندگی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
کوہکن ہی کے دل سے کیوں ؟

(۱۷۱) اقبال نے کوہکن — کا جواب دوسرے مصرعہ میں یہ دیا ہے۔ جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی۔ جوئے شیر، تیشہ، سنگ گراں، ان علامتوں کی توضیح کیجیے۔

(۱۷۲) ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
اس شعر کا دوسرا مصرعہ کیا ہے ؟

(۱۷۳) فقط ذوق پرواز ہے زندگی !
اور اس کا پہلا مصرعہ ؟

(۱۷۴) تائیس Thais اور Les Miserables فرانسیسی ادب کے دو شاہکاروں کی تھیم Theme کیا ہے۔

(۱۷۵) شیکسپیئر اپنے ڈرامہ (Twelfth Night) میں ایک کردار کے بارے میں کہتا ہے۔
He is wise enough to play the fool. وہ کیسے۔

(۱۷۶) خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے
یہ کس دنیا کی باتیں ہیں ؟

(۱۷۷) انگریزی کی ایک نظم

If you think, you are beaten, you are
If you think you dare not, you don't
If you like to win, but think you can't
It is almost certain, you won't,
If you think you'll lose, you are lost
For out of the world, we find
Success begins with a fellow's will,
It's all in the state of mind.

واقعی؟ دلائل دیجئے۔

(۱۷۸) میر درد کا شعر ہے۔ زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
میر درد ہی نے ایک اور جگہ کہا ہے۔
اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
اسی ذہنی کیفیت کے لیے جدید نفسیاتی اصطلاح کیا ہے؟

(۱۷۹) میر نے (Depression) کی تعریف یوں کی ہے۔
مزاجوں میں یاس آ گئی ہے ہمارے نہ مرنے کا غم نہ خوشی زندگی کی
مزاجوں میں یاس کیوں آجاتی ہے؟

(۱۸۰) نہ تڑپنے کی اجازت، نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں، یہ مرضی میرے صیاد کی ہے
کون سا صیاد؟

(۱۸۱) ایک انگریزی شاعر کہتا ہے:

Life's battles don't always go
To the stronger or faster man;
But soon or late the man who wins

آپ کو اس خیال سے اتفاق ہے؟ ہے تو کیوں؟ نہیں تو کیوں؟

(۱۸۲) مشہور امریکی شاعر ہنری لانگ فیلو کی ایک معروف نظم ہے (Psalm of Life)
اس کا آخری بند یہ ہے۔

Let us, then, be up and doing,
With a heart for any fate
Still achieving, still pursuing
Learn to labour and to wait

اس بند کا کون سا مصرعہ اس کی جان ہے؟

(۱۸۳) غالب کا مصرعہ ہے: نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا
کیسے؟

(۱۸۴) ملٹن کہتا ہے Live well, how long, how short, permit to Heaven
یہاں Live well میں کیا کچھ شامل ہے؟

(۱۸۵) ایک حدیث ہے: من استوی یوماہ فھو مغبون ہ
(جس کا آج کل سے بہتر نہیں وہ بہت نقصان میں رہا) تشریح کیجیے۔

(۱۸۶) سورۃ العصر میں اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے۔ وتواصوا بالحق، وتواصوا بالصبر
زندگی میں اس ارشاد باری کے مضمرات پر روشنی ڈالیے۔

(۱۸۷) یونانی فلسفہ کی بنیاد Divergent Thinking
پر ہے۔ جدید سائنٹیفک طریق بھی یہی ہے اس میں

اور Convegent Thinking میں کیا فرق ہے۔ ہمارے
طرز تعلیم اور طرز تربیت کا اسلوب کیا ہے اور کیوں؟

(۱۸۷) جگر مراد آبادی کا شعر ہے:

گلشن پرست ہوں میں، مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں

گل، گلشن اور کانٹوں کی علامتوں کی توضیح کیجئے۔ زندگی میں اس رویہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

(۱۸۸) فارسی کے شاعر حافظ کا ایک شعر ہے۔

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است		با دوستاں تلطف، با دشمناں مدارا

یعنی دونوں دنیاؤں کی راحت اس امر میں ہے کہ دوستوں سے محبت کا اور دشمنوں سے مروّت کا برتاؤ کیا جائے۔ موجودہ اقداری بحران کے دور میں اس روّیے کی کتنی گنجائش ہے۔ کیوں اور کیوں نہیں؟

(۱۸۹) (Willing to wound but afraid to strike)

انگریزی شاعر پوپ کے اس طنزیہ فقرہ پر تنقید کیجئے۔

(۱۹۰) کتابوں کے بارے میں سر فرانسس بیکن کا فقرہ ہے۔

Some books are to be tasted, others to be swallowed, and some few to be chewed and digested.

توضیح کیجیے۔

(۱۹۱) ملٹن نے (Paradise Regained) میں کہا ہے۔

(Deep versed in books, but shallow in himself)

یہ کیا صورت ہے؟

(۱۹۲) الیگزانڈر پوپ نے اسی قسم کی بات یوں کہی ہے۔

The bookful block head. reads ignorantly with loads of learned lumber in his head.

کبھی ایسے پڑھے لکھے جاہل سے پالا پڑا ہے؟

(۱۹۳) شیکسپیر نے اپنے ڈرامہ ہنری ششم میں ایک جگہ لکھا ہے:

(Delays have dangerous ends)

اور ایک اور انگریزی شاعر ڈرائیڈن (Dryden) ایک جگہ کہتا ہے:

All delays are dangerous in war. صرف جنگ میں؟

(۱۹۴) ولیم پٹ نے اپنی ایک تقریر میں کہا:

Where law ends, tyranny begins. تبصرہ کیجئے۔

(۱۹۵) پٹ ہی کا قول ہے:

Necessity is the argument of tyrants. it is the creed of slaves.

اس موضوع پر ملٹن نے کہا ہے۔ Necessity, the tyrants' plea

تجزیہ اور تبصرہ کیجئے۔

(۱۹۶) انقلاب فرانس کا نعرہ تھا (Equality, Liberty, Fraternity)

بحث کیجئے۔ انقلاب فرانس میں فرانسیسی ادیبوں — روسو اور والٹیر کے رول پر تحقیق کیجئے!

(۱۹۷) انقلاب فرانس سے کچھ عرصہ پہلے کا واقعہ ہے کہ بھوکے عوام شاہی محل کے سامنے احتجاجی مظاہرہ کر رہے تھے۔ ان کے شور و غوغا سے تنگ آکر ملکہ وقت (میری انٹونیٹ۔ اپنے وقت کی حسین ترین مغرور ترین اور شاید ذہین ترین عورت) نے محل کے جھروکے میں آکر خادمہ سے پوچھا یہ لوگ شور کیوں کر رہے ہیں۔ خادمہ نے دست بستہ عرض کیا ملکہ عالیہ کہتے ہیں ہمیں روٹی نہیں ملتی۔ ملکہ نے بیزاری سے رخ بدلتے ہوئے کہا۔

"ان سے کہو کیک کھائیں۔"

کارلائل نے اپنی کلاسیکی کتاب انقلاب فرانس (The French Revolution) میں لکھا ہے کہ گلوٹین پر چڑھائے جانے سے پہلے ملکہ کے لمبے سیاہ بال راتوں رات سفید ہو گئے تھے۔ جب اسے گرفتار کرکے پیرس کے بازاروں اور گلیوں میں تذلیل سے گھمایا جارہا تھا تو طیش میں آئے ہوئے انقلابی اس پر نفرت سے تھوک رہے تھے اور اسے یاد دلا رہے تھے کہ جب اس نے ان کی بھوک کی پکار سن کر انہیں بھوک کی پکار سن کر انہیں حقارت سے کیک کھانے کا مشورہ دیا تھا۔ اقبال نے کہا ہے۔

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

انقلاب کیوں آتے ہیں؟ تاریخی حوالوں سے بحث کیجئے؟

(۱۹۸) والٹیئر (Voltaire) نے کتابوں کے بارے میں لکھا ہے جب سے دنیا بنی ہے وحشی نسلوں کو چھوڑ کر دنیا پر کتابوں نے حکمرانی کی ہے۔ کیسے؟ تاریخی حوالوں سے گفتگو کیجئے۔

(۱۹۹) لیڈرشپ کا آخری ٹیسٹ یہ ہے کہ وہ لیڈرشپ پیدا کرے۔

اکثر بڑے لیڈر، بڑے لیڈر (Groom) نہیں کر پاتے؟ وجہ؟

(۲۰۰) فرانسس بیکن کہتا ہے:

A little philosophy (knowledge) inclines a man's mind to atheism, but depth in philosophy bringeth men's minds to religion.

بحث کیجئے۔

(۲۰۱) بیکن ہی نے لیڈرشپ کے (Compulsions) کے بارے میں لکھا ہے:

He that hath wife and children hath given hostages to fortune, for they are impediments to great enterprises, either for virtu or mischief.

کیا یہ صحیح ہے کہ انسان کے (Personal obligations) بھی اس کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں؟ بڑے لیڈروں کے حوالے سے بحث کیجئے۔

(۲۰۲) فٹز جیرالڈ کے ترجمہ میں عمر خیام کی ایک رباعی ہے:

Awake, for the morning in the bowl of night
Has flung the stone that puts the stars to flight
And lo, the hunter of the east has caught,
The sultan's turret in a noose of light
(Tess)

جس کو اردو کا روپ ڈاکٹر تاثیر نے یوں دیا۔

اٹھ جاگ کہ شب کے ساغر میں سورج نے وہ پتھر مارا ہے
جو مے تھی وہ سب بہہ نکلی جو جام تھا پارہ پارہ ہے
مشرق کا شکاری اٹھا ہے مغرب کو کمندیں پھینکی ہیں
اک بیچ میں قصر سکندر، ایک بیچ میں قصر دارا ہے

عمر خیام کی رباعیوں اور طامس ہارڈی کے ناولوں جیسے ٹیس (Tess) میں کوئی قدر مشترک ہے؟ اردو کا یہ شعر بھی ذہن میں رکھیئے۔

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں جا ڈوبا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

(۲۰۳) ایک جہاندیدہ استاد نے اپنے کانووکیشن لیکچر میں طلبا سے کہا:

All Fords are exactly alike, their maker used to say. But no two persons are exactly alike. Every new born soul is a new thing under the sun; you should therefore look for that spark in yourself that makes you different from others. Society and School tend to iron out these differences but my advice to you is, never let that spark be lost. For that is your only claim to individuality

انفرادیت، کیوں ؟ انفرادیت، کے تحفظ اور نشوونما کی ضرورت اور اہمیت پر بحث کیجئے۔

(۲۰۳) تیمور نامہ میں تیمور نے اپنے مرشد کا ایک خط نقل کیا ہے جس میں حضرت علی رض کا یہ قول دہرایا گیا ہے۔

کفر سے حکومت قائم رہ سکتی ہے، ظلم سے نہیں۔ بحث کیجئے ؟

(۲۰۴) شیکسپیئر کے ڈرامہ مرچنٹ آف وینس میں پورشیا کی مشہور مرسی اسپیچ یوں شروع ہوتی ہے۔

The quality of mercy is not strain' d;
It droppeth as the gentle rain from heaven
Upon the place bereath; it is twice bless'd
It blesseth him that gives, and him that takes
't is mightiest in the mightest

یہ جو فقرہ ہے :

It blesseth him that gives and him that takes.

اس کی توضیح کیجئے۔

(۲۰۵) عہدنامہ عتیق (Old Testament) میں ایک جگہ آتا ہے۔

(Be not righteous overmuch) یہ تنبیہہ کیوں کی گئی ہے۔

ایک اُردو شاعر کہتا ہے۔ اتنی نہ بڑھا پاکی داماں کی حکایت

اس کا جواب دوسرے مصرعہ میں ہے وہ کیا ہے۔

(۲۰۶) عہدنامہ عتیق ہی کا ایک فقرہ ہے :

Answer a fool according to his folly.

اس کا کیا مطلب ؟

(۲۰۷) انگریزی شاعر ادیب، اور ڈرامہ گولڈ اسمتھ ایک جگہ لکھتا ہے :

These little things are great to little men

کیا یہ صحیح ہے کہ چھوٹے آدمیوں کو چھوٹی باتیں ہی بڑی نظر آتی ہیں۔

(۲۰۸) انگریزی شاعر پوپ بڑا طنز نگار تھا۔ اس کا ایک فقرہ ہے:

Party is the madness of many for the gain of a few.

کیسے؟

(۲۰۹) اصل میں انسان وہی ہوتا ہے جو وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں سوچتا ہے۔ عہد نامہ عتیق کا فقرہ ہے:

As one thinks in his heart, so he is.

توجیہہ کیجیے۔

(۲۱۰) پوپ کہتا ہے

Whatever day,
Makes man a slave, takes half his worth away

اقبال کا مصرعہ ہے: بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے جوئے تند آب

پوپ اور اقبال کے مصرعوں کی روشنی میں غلامی کی نفسیات کا تجزیہ کیجیے۔

(۲۱۱) شیکسپیئر کے ڈرامہ ہیملیٹ میں ہیرو پرنس ہیملیٹ کہتا ہے۔

There is nothing either good or bad, but thinking makes it so

اخلاقی اقدار (Values) کے مستقل بالذات (absolute) ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اس کے قول کی روشنی میں بحث کیجیے۔

(۲۱۲) اسی ڈرامہ کے دوسرے ایکٹ میں ایک کردار کہتا ہے۔

What a piece of work is man; noble in reason, how infinite in faculties! In form and moving, how express and admirable! In action, how like an angel! in apprehension how like a god!

انسانی عظمتوں کی شان میں یہ نغمہ سرائی حقیقت ہے یا افسانہ ؟ اس موضوع پر کسی اردو شاعر نے کچھ کہا ہے ؟ کہتا تو کون کہتا۔

(۲۱۳) کیا جنون (Madness) میں کوئی سلیقہ (Method) ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے ہیملیٹ کہتا ہے۔

Though this be madness, yet there's method in it

(۲۱۴) لاگ اور لگاؤ محبت اور نفرت میں کیا تعلق ہے۔ غالب کا شعر ہے۔

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

انگریزی شاعر پوپ کہتا ہے۔

Who love too much, hate in the like extreme

دونوں شعروں کا خیال ایک ہے، یا مختلف اور اپنی اپنی جگہ صحیح یا غلط ؟

(۲۱۵) جولیس سیزر کے پہلے ایکٹ میں ہے۔

He thinks too much, such mean are dangerous

خطرناک کیوں ؟

(۲۱۶) Twelfth Night کے چوتھے ایکٹ میں ایک کردار کہتا ہے۔

think nobly of his soul and no way approve his opinion.

اس بیان میں کوئی تضاد ہے یا نہیں ؟ ہے تو کیوں اور نہیں ہے تو کیوں ؟

(۲۱۷) ہیملیٹ کہتا ہے :

Words, words, words!
They have a plentiful lack of wit.

ان لفظوں میں طنز ہے یا نہیں ؟

(۲۱۸) یہ فقرہ Beggar that I am, I am even poor in thanks

یہ اعتراف ہے یا طنز ؟ (Poor in thanks میں کیا نکتہ پنہاں ہے ؟

(۲۱۹) برٹرنڈرسل (Conquest of Happiness) میں لکھتا ہے۔

The secret of happiness is this, let your interests be as wide as possible, and let your reactions to things and persons that interest you be as far as possible friendly rather than hostile".

تبصرہ کیجئے۔

(۲۲۰) کتابوں کے بارے میں کارلائل لکھتا ہے،

All that mankind has done, thought or gained is lying as in magic preservation in the pages of books. They are the chosen possession of man.

تبصرہ کیجئے۔

(۲۲۱) دیکھا اکثر یہ جاتا ہے کہ برے اور بدنیت اشخاص بڑے اور اچھے لوگوں کی تمام خوبیوں سے منہ موڑ کر ان کی صرف ایک آدھ کمزوریوں کو اپنی بداعتمادی و بے راہ روی کے جواز میں چن لیتے ہیں۔

رشید صدیقی کی اس رائے سے آپ کو اتفاق ہے؟ بحث کیجئے۔

(۲۲۲) ہر آدمی اپنے عمل کے خیر و شر میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ مادے کی طرح عمل بھی لازوال ہے، ایک طبعی دنیا میں دوسرا روحانی و اخلاقی دنیا میں۔

رشید صدیقی کے اس قول پر بحث کیجئے؟

(۲۲۳) کوئی مہم آج تک فرزانوں سے سر نہ ہوئی اس کے لیے دیوانوں ہی کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہ فقرہ رشید صدیقی کا ہے۔ اردو کا ایک اور شعر ہے۔

کال اٹھا نہ فرقہ زہاد سے کوئی ‏ ‏ ‏ جو کچھ ہوئے، یہی رندان قدح خوار ہوئے

دیوانوں، اور رندان قدح خوار کی علامتوں کی وضاحت کیجئے۔

(۲۲۴) بحیثیت ایک معلّم کے میرا عقیدہ ہے کہ نوجوانوں کو جتنی صحیح اور صالح تربیت بلند و برگزیدہ شخصیتوں سے ملتی ہے اتنی کتابوں اور لیکچروں سے نہیں ملتی مطالعے سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے جو بیکار بھی ہو سکتی ہیں اور خطرناک بھی، اگر کوئی بڑی شخصیت ان معلومات کو اس طالب علم کے لیے مفید مطلب نہ بنا دے۔"
معلّم کے رول پر رشید احمد صدیقی کے اس قول کی روشنی میں بحث کیجیے۔

(۲۲۵) "مذہب بڑی سخت اور بڑی قابل قدر آزمائش ہے۔" تبصرہ کیجیے۔

(۲۲۶) اکتوبر ۱۹۴۷ء میں آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی صدارت کرتے ہوئے قائد اعظمؒ نے نوجوان طلباء کے جوش و جذبے کی بڑی تعریف کی اور انہیں تحریک آزادی کے سے (Vanguard) ہراول دستے سے تعبیر کیا۔ نوجوانوں نے یہ سن کر بڑی زوردار تالیاں بجائیں تو قائد اعظمؒ اپنی مخصوص گھمبیر آواز میں فرمایا۔

Well, many Jinnahs will arise from among you. I have no fear of the future in your hands.

تاریخی تناظر میں تبصرہ کیجیے۔

(۲۲۸) اقبال نے ایک جگہ کہا ہے۔ "انسانم آرزو است"۔ مجھے انسان کی تلاش ہے۔
انسان کی تلاش کیوں؟

(۲۲۹) معروف عارفہ رابعہ بصری کے بارے میں مشہور ہے کہ بصرہ کی ایک گلی سے آپ روز روشن میں اس طرح گزر رہی تھیں کہ ایک ہاتھ میں چراغ تھا اور دوسرے ہاتھ میں پانی کا کوزہ استفسار پر فرمایا جی چاہتا ہے اس سے (چراغ سے) جنت کو آگ لگا دوں اور اس سے (کوزہ سے) دوزخ کی آگ کو بجھا دوں۔
غالب نے اس احساس کو یوں ادا کیا ہے:

طاعت میں تا رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو

اس فلسفہ پر بحث کیجیے۔ غالب ہی کا ایک اور شعر

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد — پر طبیعت ادھر نہیں آتی

بھی ملحوظ رہے۔

(۲۳۰) رشید احمد صدیقی مضامین رشید میں لکھتے ہیں۔

کام کرنا وہ نشہ ہے جس میں نہایت آسانی سے ہر طرح کے مصائب غرق کیے جا سکتے ہیں۔

واقعی؟ وہ کیسے؟

(۲۳۱) رشید احمد صدیقی نے اپنی کتاب آشفتہ بیانی میری میں لکھا ہے۔

"مذہب کی بنیادی اور فروعی باتوں میں امتیاز کرنے میں اکثر چوک ہوئی ہے جس کی تلافی کی کوشش ہمیشہ جاری رہے گی۔"

مذہب کی بنیادی اور فروعی باتوں میں امتیاز کرنے سے کیا مراد ہے؟

(۲۳۲) "ہر مذہبی آدمی اخلاقی نہیں ہوتا۔ خود غرض، ناواقف، مذہب کو بالعموم اصطلاحی حدود میں مقید رکھتے ہیں۔ اسی طرح بعض دوسرے اخلاق کو مذہب سے آزاد اور علیحدہ سمجھتے ہیں۔ مذہب اور اخلاق کو علیحدہ خانوں میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لیے کہ حقیقتاً اخلاق مذہب سے برآمد ہوا ہے اور اس کا آوردہ اور پروردہ ہے۔ اخلاق مذہب کی عملی شکل ہے۔"

یہ خیال رشید احمد صدیقی کا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ اسی موضوع پر رشید احمد صدیقی اپنے مضمون اپنی یاد میں لکھتے ہیں۔

بعض کم نظر مذہبی آدمی یہ نہیں سمجھنا چاہتے کہ خدا نے اپنی نجات انسانوں کے سپرد نہیں کی ہے بلکہ انسانوں کی نجات انسانوں کے سپرد کی ہے، خدا نے عقائد و عبادات کو خدمت خلق کے راستے سے نازل کیا ہے اور اسی معیار سے وہ ان کو پرکھے گا۔

زندگی کا مقصد کیا ہے۔ انسان کو کیوں پیدا کیا گیا۔ شرافت، خوشدلی اور بہادری سے رہنا ان سب کا جواب ہے۔"

(۲۲۳) میں علم کا نہیں معلم کا قائل ہوں۔ (رشید احمد صدیقی)

کیوں ؟ بحث کیجئے۔

(۲۲۴) بستر مرگ پر گوئٹے کے آخری الفاظ تھے :

روشنی ، روشنی !

مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک کتاب ہے انسانیت موت کے دروازہ پر، اس کے حوالے سے تلاش کیجئے کہ دوسرے بڑے آدمیوں نے دم آخر کیا کہا۔ پھر اس کی روشنی میں ان کی زندگی شخصیت اور کردار کا تجزیہ کیجئے۔

(۲۲۵) What's in name, that which we call a rose by any other name would smell as sweet.

یہ فقرہ رومیو جیولیٹ کا ہے۔ واقعی نام میں کچھ نہیں رکھا ہے ؟

(۲۲۶) ایک فقرہ ہے۔

But love can hope, where reason would despair.

عقل محو تماشائے لب بام کیوں رہتی ہے ؟

(۲۲۷) ایک شاعر کہتا ہے۔

Bliss

Where ignorance is bl'ss
'T's folly to be wise.

کیوں ؟ کیا برعکس صحیح نہیں۔ کیسے ؟

(۲۲۸) آواز دوست میں مختار مسعود نے لکھا ہے۔

جس سرحد کو اہل شہادت میسر نہ آئیں وہ مٹ جاتی ہے۔ اہل شہادت معدوم کیوں ہو جاتے ہیں ؟

(۲۳۹) قدیم روم کے درویش صفت فلسفی بادشاہ مارکس آریلیس نے اپنے خطبات میں اپنے باپ کے تین قول نقل کیے ہیں۔

صحت کو عزیز رکھو نہ کہ زندگی کو۔

جستجو سے صحیح راہ حاصل ہوتی ہے نہ کہ محض آرزو سے۔

دوسروں کی صلاحیتوں کا اعتراف کرو تاکہ ہر شخص کو اس کے حصے کا شرف حاصل ہو۔

مارکس آریلیس (Marcus Aurelius 121-181) یہ زمانہ (۱۸۱-۱۲۱) ایک بادشاہ تھا

(Stoic) کا فلسفہ کیا ہے؟

(۲۴۰) پلوٹارک نے سکندر اور اس کے جرنیل پارمینو کا وہ مکالمہ نقل کیا ہے جو لڑائی سے پہلے دارا کی طرف سے صلح اور تحائف کی پیشکش کے بارے میں ہے۔

پارمینو نے کہا:

اگر میں سکندر ہوتا تو یہ پیشکش قبول کر لیتا۔ سکندر نے برجستہ جواب دیا:

میں بھی اس پیشکش کو ضرور قبول کر لیتا اگر میں بھی محض پارمینو ہوتا۔

اس مکالمے کی روشنی میں دونوں کے کردار پر تبصرہ کیجئے۔

(۲۴۱) آواز دوست میں مختار مسعود نے لکھا ہے:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے آدمی انعام کے طور پر دیئے جاتے ہیں اور سزا کے طور پر روک لیے جاتے ہیں۔" آپ کا کیا خیال ہے؟

(۲۴۲) یونانی مورخ پلوٹارک نے (The Lives) میں پیریکلیس اور اس کے جرنیل شاعر سوفوکلیز کا ایک مکالمہ نقل کیا ہے۔

سوفوکلیز نے کسی کے حسن کا ذکر کیا بات نظارہ بازی کی تھی۔ پریکلیس نے جواب دیا۔

"میرے دوست! ایک جرنیل کے ہاتھ ہی نہیں۔ اس کی نظر بھی پاک ہونی چاہیئے"

قدیم یونان کے اس بطل جلیل پیری کلیس کے دوسرے کارناموں پر روشنی ڈالیے۔

A hundred times every day I remind myself that my inner (۲۴۳)
and outer life depends on the labours of other men, living and dead, and that I must exert myself in order to give in the same measure as I have received and am still receiving.

یہ قول مشہور زمانہ سائنس دان پروفیسر البرٹ آئنسٹائن کا ہے
کی یہ کون سی منزل ہے ؟

(۲۴۴) اسی تھیم (Theme) پر 'آواز دوست' میں مختار مسعود لکھتے ہیں۔
عطا کا پہلا حق یہ ہے کہ انسان اس کا شکر ادا کرے دل شکر سے لبریز ہو تو روشن ہو جاتا ہے شکوہ کیجئے۔ تو بجھ جاتا ہے۔ ناشکر گزار ہو تو پتھر بن جاتا ہے۔ شکر گزار ہمیشہ روشن ضمیر اور روشن دماغ ہوتا ہے ناشکر گزار بے ضمیر اور بد دماغ ہو جاتا ہے۔

(۲۴۵) " بڑا انسان اپنی شکست میں بھی زندہ رہتا ہے۔" کیسے ؟

(۲۴۶) منگولوں کی تاریخ (The Secret History of the Mongols) میں ایک واقعہ لکھا ہے جب چنگیز کے سامنے اس کے بچپن کے دوست لیکن بعد کے دشمن جموقا کو جس نے خان اعظم چنگیز خان کے تیس وفادار ساتھیوں کو جلتے تیل کے کڑھاؤ میں ڈال کے ہلاک کر دیا تھا۔ گرفتار کر کے پیش کیا گیا تو چنگیز خان نے اس سے پوچھا۔

جموقا! میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں ؟

پا بہ زنجیر جموقا نے مضبوط آواز میں جواب دیا۔ خان، وہی جو دشمن اپنے دشمن سے کرتا ہے تقریباً اسی صورت حال میں سکندر اعظم کو پورس کا جواب یاد کیجئے۔

(۲۴۷)۔ فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ (Rene Descarte) کا مشہور مقولہ ہے (I think, therefore I am) سوچنے اور ہونے

یں کیا فرق اور کیا تعلق ہے ؟

۲۴۸- ابراہام لنکن نے اپنی دوسری صدارت کی افتتاحی تقریر میں کہا تھا۔

With malice toward none, with charity for all)

اس رویہ کے قابل عمل ہونے یا نہ ہونے کے مختلف پہلوؤں پر بحث کیجیے۔

۲۴۹- نئی بنیادیں وہی لوگ بھر سکتے ہیں جو اس راز سے واقف ہوں کہ پرانی کیوں بیٹھ گئیں

یہ فقرہ آوازِ دوست کا ہے۔ کیا تاریخ سے سبق سیکھنے کی بھی کچھ شرائط ہیں۔

۲۵۰- آوازِ دوست میں مختار مسعود نے لکھا ہے۔

ڈیماستھنیز نے شجاعت کے بارے میں اپنی شاندار تقریریں کیں کہ ہزاروں آدمی انہیں سن کر اپنی جانوں پر کھیل گئے، مگر وہ جب خود میدان جنگ میں پہنچا تو پہلا موقع ملتے ہی فرار ہو گیا۔

یہ فرار ہمیں ہر ناصح، محتسب، اور مصلح کی زندگی میں ملتا ہے۔

آخری جملہ میں لفظ 'ہر' کو بنیاد پر بحث کیجیے کہ اگر ایسا ہے تو اس کی نفسیاتی وجوہ کیا ہیں۔

۲۵۱- نواب بہادر یار جنگ نے تحریک پاکستان کے عروج کے زمانہ میں کہا تھا:

پاکستان کو حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا پاکستان کو بنانا مشکل ہوگا۔ بنانا حاصل کرنے سے زیادہ مشکل کیوں ہوتا ہے۔

۲۵۲- خلوص اور تندہی سے کیے ہوئے کام، کارنامے بن جاتے ہیں۔ کیوں؟

سب انسان یکساں ہیں۔ اور منفرد بھی، کوئی کسی کی جگہ نہیں لے سکتا۔ انسان کی بڑائی اس کے (Performance) میں ہے (Position) میں نہیں۔

اس نظریہ پر بحث کیجیے۔

۲۵۳- آخری دنوں میں (A Passage to India) کے نامور مصنف ای ایم

فاسٹر کی ملازمت بڑی انوکھی تھی۔ وہ کیمبرج میں رہتے تھے اور یونیورسٹی کی طرف سے ان کو صرف اس بات کی تنخواہ ملتی کہ جب کوئی چاہے ان کے دروازہ پر دستک دے اور ان سے گفتگو کرے انکی حیثیت کچھ سبیل کی سی تھی کہ پیاسے جب چاہیں آکر پیاس بجھالیں۔

یہ اس زمانہ کی بات ہے جب فاسٹر کی عمر اسی بچاسی سال سے اوپر تھی۔

دانشوری سے استفادہ کی روایت کیوں اور کب پیدا ہوتی ہے ؟

مختار مسعود نے فاسٹر کے بارے میں یہ لکھنے کے بعد ایک جملہ کا اضافہ بھی کیا ہے۔

بڑے آدمی وہی اچھے ہوتے ہیں جو اپنے کام میں مصروف ہوں تو سو پردوں میں پوشیدہ رہیں اور جب فارغ ہوں تو سارے حجابات دور ہو جائیں اور یاران نکتہ داں کیلئے صلائے عام بن جائیں"

بچوں کی تربیت

ہماری رنگا رنگ دنیا میں ایسی چیزوں کی کیا کمی ہے جنہیں دیکھ کر آدمی اچنبھے سے انگلی دانتوں میں دباتے مگر آدمی کے بچے سے زیادہ حیرت میں ڈالنے والی شاید اور کوئی چیز نہیں۔ کسی اور جاندار کا بچہ شائد اتنا بے بس نہیں ہوتا نہ اتنے عرصے تک اپنے ماں باپ اور بڑوں کا منہ تکتا ہے۔ کوئی اور بچہ اپنی ساری قوتوں کو پوری ترقی دینے میں اتنی دیر نہیں لگاتا۔ پہلے تو اس کی بے بسی اور سست رفتاری پر ہنسی آتی ہے! پر ذرا سوچئے تو خیال ہوتا ہے کہ یہ دنیا کا حاکم اور بادشاہ انسان کا بچہ ہے، شائد قدرت چاہتی ہے کہ بڑا ہوتے ہوتے اس بادشاہت کے کام کے لائق ہو جائے، اس لئے اس کا نصاب تعلیم اتنا لمبا رکھا گیا ہے۔ اس کے جسم کی ترقی تک میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے خاص اہتمام کیا ہے کہ کام خوب پکا ہو جلد بازی میں خراب نہ ہو جائے کچھ بڑھتی ہے پھر رکتی ہے گویا ہر قدم پر پختگی کا پورا پورا انتظام کرتی چلتی ہے۔ پہلے سال بچہ بڑی تیزی سے بڑھتا ہے مگر دو سال سے پانچ سال کی عمر تک قدرت رفتار کو سست کر دیتی ہے پہلے سال کے کھنچاؤ کے بعد یہ بھراؤ کا زمانہ ہوتا ہے۔ پانچ سے سات سال تک بچہ پھر تیزی سے بڑھتا ہے یہ کھنچاؤ کا دوسرا زمانہ ہے جس کے بعد سات سے گیارہ برس تک پھر بھراؤ کے لئے رکھے ہیں۔ اس کے بعد ایک بار پھر کھنچاؤ ہوتا ہے اور اسی سے متصل ایک بھراؤ کا دور اور آتا ہے جو اسے تر شا تر شایا ولولے اور امنگ والا نوجوان بنا دیتا ہے غرض قدرت اپنا کام خوب ٹھوک بجا کر کرتی ہے، اس لئے کہ یہی تو اس کے خزانوں کا مالک ہے

از ڈاکٹر ذاکر حسین (تعلیمی خطبات)

اور یہی اس کی دنیا کا سردار۔

ہاں، غریب قدرت بہت کچھ کر دیتی ہے مگر سب کچھ تو نہیں کر سکتی۔ اس ننھی سی جان کو دنیا میں خدا کے خلیفہ کے رتبے تک پہنچانے کے لئے اس کے ماں باپ رشتہ دار اور ساری ارد گرد کی انسانی دنیا کو بھی بہت کچھ کرنا ہوتا ہے اور اکثر اسی حصے میں کسر ہو جاتی ہے اور آدمی کے سپرد اپنے بچوں کی تربیت اور دیکھ بھال کا جو کام ہے اس میں وہ ایسی ایسی حماقتیں کر گزرتا ہے کہ اکثر قدرت کا منشا پورا نہیں ہو پاتا اور منشا پورا ہوتا تو رہا دور ہمارے دیس میں تو لاکھوں بچوں کو پیدائش کے سال بھر کے اندر اندر ہی اس دنیا سے رخصت کر دیا جاتا ہے اور لاکھوں کو پانچ سال تک پہنچنے سے پہلے پہلے۔ جو بچ رہتے ہیں وہ ابا جان کی نادانی، نانی اماں کے لاڈ پیار کا تختۂ مشق بنتے ہیں۔ ذہن میں طرح طرح کی گتھیاں ڈال دی جاتی ہیں جو عمر بھر سلجھاتے نہیں سلجھتیں۔ ان سے بھی کوئی بچ نکلے تو مدرسوں میں ایک سے ایک بقراط استاد پڑا ہوا ہے وہ انہیں آدمی بنانے کی کوشش میں، جانوروں سے بدتر درجہ پر پہنچا دیتا ہے اور جب یہ دنیا میں خدا کی خلافت کا کاروبار سنبھالنے نکلتے ہیں تو نہ تن درست ہوتا ہے نہ من، نہ ولولہ نہ امنگ، نہ ہمت نہ یقین، ڈرے ڈرے سہمے سہمے، ہر چیز سے خوف، ہر چیز پر شبہہ، نہ کسی سے لگاؤ نہ کسی پر بھروسہ، نہ کام کا شوق، نہ تفریح کا سلیقہ کچھ کرتے بھی ہیں تو غلاموں کی طرح سزا کے ڈر سے یا انعام کی لالچ سے نہ اپنے ارد گرد کی حقیقتوں سے آشنا، نہ ان سے دوچار ہونے کی قابلیت خیالی پلاؤ پکاتے ہیں اور ہوائی منصوبے گانٹھتے ہیں، جنہیں قدم قدم پر زندگی کی سخت حقیقت پاش پاش کر دیتی ہے۔ یہ زندگی کو بیکار جاننے لگتے ہیں اور زندگی ان سے بیزار رہتی ہے۔ دنیا ان کے لئے قید خانہ اور یہ دنیا کے لئے عذاب۔

اس بدحالی کو اور بڑوں کی مداخلت سے چھوٹوں کی زندگیاں تلخ اور بے اثر ہوتے دیکھ کر، بعض نیک دل لوگ تو یہ تک کہنے لگے ہیں کہ بچوں کی تربیت کے لئے کچھ کرنا ہی

نہ چاہیئے انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو تو کچھ نہ کچھ ہو ہی رہیں گے۔ اس خیال میں کچھ تو ماں باپ اور استادوں کی غفلتوں اور غلطیوں پر بجا غصے کی آمیزش ہے مگر ساتھ ہی آزادی کے فلسفے کی نظروں کو چکا چوند کرنے والی چمک کا بھی تھوڑا بہت میل ہے جس کی تیز روشنی کبھی کبھی غریب تاریکی میں رہنے والوں کی رہی سہی نظر کو بھی ختم کر ڈالتی ہے اور یہ بیچارے بے سمجھے الفاظ کے گورکھ دھندے میں پھنس کر نہ ادھر کے رہتے ہیں نہ ادھر کے۔ بچوں پر طرح طرح کی پابندیوں کے برے نتائج دیکھ کر بہت سے اچھے سمجھدار لوگوں نے ان پابندیوں کو کم کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے جو اپنی جگہ پر ٹھیک بات ہے، مگر اس سے ہمارے یہاں کے خیالوں کے اچکے نہ جانے کیا سمجھ لیتے ہیں اور لگتے ہیں تلقین کرنے کہ بس بچوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ ہاں چھوڑ سکتے تو ضرور چھوڑ دیجیے۔ مگر آپ کا ننھا ایک تندرست بچے کی ساری قوتیں لے کر دنیا میں آیا ہے، یہی کوئی بیس بائیس ہزار سال کی عمر پاتے پاتے تہذیب و شائستگی کے اس مرتبہ پر پہنچ جائے گا جس پر خیر سے آپ ہیں کہ اپنی موجودہ حالت پر پہنچنے کے لئے کہتے ہیں کہ انسانیت کو کم (بڑھ) اتنا ہی زمانہ لگا ہے!

اس مدت پر مجھے ایک قصہ یاد آیا۔ آپ جانتے ہیں کہ امریکہ کے لوگ دنیا کے سارے کو دولتوں کی طرح ہر چیز کی قیمت بہت پوچھا کرتے ہیں۔ ایک امریکن کروڑپتی ایک مرتبہ آکسفورڈ پہنچے۔ کہتے ہیں کہ آکسفورڈ کے ہرے ہرے لان بہت ہی اچھے ہیں امریکن کروڑپتی صاحب ان پر چلے تو ریجھ گئے۔ فوراً جیسے کسی نے بٹن دبا دیا ہو، یہ سوال منہ سے نکلا "ایسے لان کتنے میں تیار ہو جاتیں گے؟" ساتھ جو پروفیسر صاحب تھے انہوں نے کہا "میں تو علم الانسان کے شعبے کا صدر ہوں، ان تفصیلات سے بالکل ناواقف ہوں، آپ کہیں تو مالی کو بلا دوں آپ اس سے دریافت فرمالیں۔" "بلائیے"۔ مالی آیا۔ کروڑپتی صاحب نے کہا "ہم بالکل ایسا ہی لان اپنے یہاں چاہتے ہیں کتنے میں تیار ہو جاتے گا؟" مالی نے کہا "صاحب! اس میں کتنے کا کیا سوال ہے کوڑیوں میں تیار ہوتا ہے کوڑیوں میں۔ زمین تو

آپ کے پاس ہوگی ہی، ذرا اچھی طرح ہموار کرا لیجئے گا اس پر گھاس جما دیجئے گا، جب گھاس ذرا بڑھ جائے تو اسے کاٹ کر اوپر سے رولر پھیر دیجئے گا اور بس۔ یہی کوئی سمجھئے پانچ سو برس کرتے رہیے گا ایسا لان تیار ہو جائے گا"۔ ہاں تو اسی طرح اگر بچوں کو آزاد چھوڑ کر کوئی صاحب ان کی صحیح تربیت کرنا چاہیں تو ان بچوں کو کوئی بیس ہزار سال زندہ رکھنے کی تدبیر کرلیں۔ حالات موافق ہوتے اور اللہ نے چاہا تو اس عمر کو پہنچتے پہنچتے خاطر خواہ نتیجہ نکل آئے گا۔ اس وقت تک تو ہمارا خیال یہی ہے کہ بچوں کو مدد کی ضرورت ہے، ہدایت کی ضرورت ہے ہمدردی اور محبت کی ضرورت ہے، سمجھنے سمجھانے کی ضرورت ہے اس میں شک نہیں کہ کام مشکل ہے پر صرف سہل کام ہی تو کام کرنے کے نہیں ہوتے۔ پچھلے دنوں بچے کی جسمانی نشو و نما اس کی ذہنی ترقی اور نفسی حالت کے متعلق بہت کچھ چھان بین ہوتی ہے۔ اگر والدین اور استاد اپنے کام کی اہمیت کو سمجھیں اور سوچیں کہ انسان کی تھوڑی سی توجہ سے دنیا میں کتنی مصیبت گھٹ سکتی ہے اور کتنی خوشی بڑھ سکتی ہے تو وہ ضرور اس تحقیقات سے فائدہ اٹھا کر اپنا کام سمجھ بوجھ کر انجام دیں۔

اس وقت اس تحقیقات کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ مختلف عمر کے بچوں کی صحت کے لئے کیا تدبیریں کرنی چاہئیں ان کے لئے غذا کون سی مناسب ہے، ان میں سونے جاگنے کھانے پینے، پیشاب پاخانے کے اوقات کی پابندی کی عادتیں کس طرح ڈالنی چاہئیں!۔ یہ معمولی باتیں آپ جانتے ہی ہیں۔ میں تو اس وقت صرف ان ہی گتھیوں کا ذکر کرتا ہوں جو اکثر والدین اور سرپرست بے جانے اپنے بچوں کے ذہن میں ڈال دیتے ہیں اور اس میں بھی بس چند موٹی موٹی باتوں کا۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ننھا بچہ بھی ایک شخصیت رکھتا ہے وہ کوئی بے جان چیز نہیں، کھلونا نہیں۔ جب لوگ لوگ اسے گڑیا سے زیادہ نہیں سمجھتے ہیں تو یہ اسی وقت سے چپ چاپ اپنے لئے کوئی مقصد کوئی منزل مقرر کر لیتا ہے اور اس تک پہنچنے کی برابر کوشش کرتا رہتا ہے۔ ساری دنیا کو

اس مقصد کی روشنی میں دیکھتا ہے اور اگر اپنے ارد گرد کے حالات کو غلط سمجھ کر یہ مقصد مقرر کر لیا ہے تو ساری دنیا کو غلط سمجھنا پڑتا ہے اپنے چھوٹے ہونے، کمزور ہونے بڑے بھائی سے چھوٹے ہوتے یا چہیتے بھائی کی بد صورت بہن ہوتے، ماں باپ کے حقیر سمجھنے غرض طرح طرح کی کمیوں کا اسے احساس ہوتا ہے۔ یہ احساس اس کے تخیل کو حرکت دیتا ہے، وہ اپنی حالت کو سدھارنے اور اپنی حیثیت کو ابھارنے میں لگ جاتا ہے کمی کا احساس اور اس کی تلافی کی کوشش یہ دو چیزیں اس کی زندگی کا مرکز ہوتی ہیں۔ ان میں غلطی ہوتی ہے تو ساری زندگی غلط راہ پر پڑ رہتی ہے۔ ماں باپ کی طرف سے تربیت کی بنیادی غلطیاں یہ ہوتی ہیں کہ وہ یا تو بچے میں کمی اور گھٹیا پن کا احساس غیر ضروری شدت سے پیدا کرا دیتے ہیں یا تلافی کی کوششوں میں حائل ہوتے ہیں، انہیں غیر معمولی طور پر اکسا کر غلط راستے پر جانے دیتے یا ڈال دیتے ہیں۔ کمیوں کا صحیح احساس ہو اور تلافی کی مناسب تدبیر تو بچے کی تربیت ٹھیک ہو۔ مگر ان میں سے کسی میں زیادتی ہوئی اور توازن بگڑا۔ مثلاً ماں باپ کی بات چیت سے ان کے عمل سے ان کی سختی، لعنت ملامت سے، اگر بچے میں اپنے گھٹیا اور کم درجہ ہونے کا احساس زیادہ قوی ہو جاتے تو وہ اس سے بچنے کی نت نئی تدبیریں کرتا ہے۔ آگے بڑھنا چاہتا ہے بہتر بننا چاہتا ہے، توجہ اپنی طرف منعطف کرانا چاہتا ہے، یہ سب اپنی جگہ پر ٹھیک ہے لیکن اگر حد مناسب سے بڑھ جاتے تو اسی سے بچے میں کینہ اور حسد پیدا ہو جاتا ہے ایسے بچے اپنے مقابلے والوں کی، بھائی کی بہن کی، دوسرے بچوں کی برائی چاہنے لگتے ہیں۔ اپنی قدر بڑھانے کے لئے دوسروں کی چغلیاں کھاتے ہیں ان پر جھوٹے الزام لگاتے ہیں، ان کے راز فاش کرتے ہیں اور بعض صورتوں میں تو یہ جذبہ مجرمانہ رنگ اختیار کر لیتا ہے اور ننھے ننھے بچے دوسروں بچوں کو جسمانی نقصان پہنچانے سے بھی نہیں چوکتے۔ کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ ماں باپ اور عزیز بچے کی آگے بڑھنے کی خواہش کو بیجا طور

پر ابھار کر اس کے حوصلے کی شدت کو اور دوسروں سے بڑھ چڑھ کر رہنے کی خواہش کو مرض کے ہر درجے تک پہنچا دیتے ہیں اپنے بچے کو درجے کے امتحان میں اوّل نمبر پر دیکھنے کی بے معنی خواہش نہ جانے کتنے بھلے مانسوں سے یہ کراتی ہے۔ اس مصنوعی اکساؤ سے بچے کی ذہنی حالت میں ایک ایک تناؤ پیدا ہو جاتا ہے جس کو وہ زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کر سکتا، اس جزوی مقصد کے حاصل کرنے کے لئے، جس پر بڑوں نے توجہ جما دی ہے اور جس میں کامیابی سے ان کی آفریں و تحسین مل سکتی ہے یہ بچہ اپنی ساری قوت اسی پر صرف کرتا ہے۔ امتحان میں اول آتا ہے تو بس کتابیں ہیں اور یہ ہے۔ نہ کھیل کی سدھ نہ ورزش کا دھیان ساری دنیا تج دی جاتی ہے۔ کچھ دن دوسروں کی امیدوں کو پورا کرنے میں لگا رہتا ہے مگر ان کی بوجھل اور یک طرفہ توقعات کا بار اس کے کمزور شانوں کے لئے ضرورت سے زیادہ ثابت ہوتا ہے لیکن دوسروں سے داد لینے کا چسکہ پڑ جاتا ہے اس لئے چھوٹی چھوٹی فرضی باتوں میں کامیابی حاصل کر کے ان کا اشتہار کرتا ہے جب یہ امکان بھی ختم ہو چکتا ہے تو بسا اوقات بالکل نئی راہ اختیار کرتا ہے کہ بغیر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کئے اسے چین نہیں آتا۔ سوچتا ہے بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا۔ گھر سے غائب رہنے لگتا ہے، مدرسہ سے بھاگتا ہے، مار کوٹ ہونے لگتی ہے، اسے بھی شہرت کا ذریعہ سمجھتا ہے اس جیسی مصیبت میں مبتلا اور لڑکے بھی ہوتے ہیں ان کے گروہ میں جا کر ملتا ہے ان کی سرداری کے لئے مجرمانہ کارروائیوں تک اتر آتا ہے اور یہ سب کیوں؟ اس لئے کہ والد صاحب کو سخت اصرار تھا کہ بچہ اوّل نمبر پاس ہو! لطف یہ ہے کہ اکثر معلموں، ڈاکٹروں، وکیلوں، غرض تعلیم یافتہ باپوں کے بچے اس مصیبت میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں غالباً اس لئے کہ ان علمائے وقت کو اوّل نمبر پاس ہونے والے بیٹے کا باپ ہونا بہت پسند ہوتا ہے!!

اس کے بالکل مخالف ایک غلطی والدین اور بڑوں سے یہ ہوتی ہے کہ وہ بچے کو حقیر

اور ذلیل سمجھتے ہیں اپنی بزرگی جتانے کے لئے انہیں بے چارہ بچہ ہر ملتا ہے "احمق ہے" "گدھا ہے"۔ "نکما ہے کسی مصرف کا نہیں"۔ غرض بات بات پر بچے پر برسے پڑتے ہیں اسے شرمندہ کرتے ہیں۔ سب کے سامنے اس کے عیب گنواتے ہیں، اسے ذلیل کرتے ہیں۔ یہی بچے جن پر بزرگوں کی یہ توجہ ہوتی ہے بڑے ہو کر کسی چیز کو اچھا نہیں سمجھتے ہر ایک کو اٹکاتے ہیں۔ نہ کسی کی تعریف کرتے ہیں نہ سن ہی سکتے ہیں۔ بچپن میں انہیں ذلیل کیا گیا تھا، اب یہ اس کا بدلہ لیتے ہیں اور سب کو برا سمجھتے ہیں۔ دنیا سے ان کی ان بن ہوتی ہے۔ بچے کو بچپن میں ذلیل اور مایوس کر کے بزرگ اس کی ساری زندگی کو تلخ بنا سکتے ہیں۔

بچپن میں بعض مواقع ایسے آتے ہیں کہ بچے کو اپنی کمیوں کا دوسروں سے ادنیٰ ہونے کا شدید احساس پیدا ہوتا ہے یہی وقت بچے کو سہارا دینے کا ہوتا ہے اس وقت ذرا سی غلطی یا غفلت سے اس کی نفسی زندگی کو اکثر ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔

میری یہ باتیں سن کر شاید کوئی صاحب فرمائیں کہ یہ عجیب معاملہ ہے، بچے کی ہمت بڑھایئے تو آپ خفا، اسے برا کہئے تو آپ ناخوش، آپ بھی خوب شخص ہیں۔ ہاں! کیا کیجئے معاملہ کچھ یوں ہی ہے نہ ضرورت سے زیادہ تعریف بچے کے لئے اچھی ہے، نہ بے جا مذمت۔ نہ اتنا گرایئے کہ پھر قدم ہی نہ اٹھا سکے نہ اتنا چڑھایئے کہ زمین پر قدم ہی نہ رکھے۔ مختصر سی بات ہے یہ شرطے کہ ذہن نشین ہو جائے بچے کو خدا کا بندہ سمجھئے نہ وہ آپ کی ملک ہے نہ آپ کا کھلونا آپ کے پاس خدا اور انسانیت کی امانت ہے اس میں جو صلاحیتیں قدرت نے رکھی ہیں انہیں نہ بہت اکسا کر خراب کیجئے، نہ دبا کر، اور ہاں اس بات کا دوسرا پہلو بھی یاد رہے کہ اگر بچہ آپ کا کھلونا نہیں ہے تو آپ بھی بچے کا کھلونا نہیں ہیں۔ آپ بھی خدا کے بندے ہیں بس ذرا زیادہ تجربہ کار، نہ آپ اس پر ظلم کریں نہ وہ آپ پر، نہ آپ اس سے کھیلیں نہ وہ آپ سے دونوں میں ایک

دوسرے پر بھروسہ ہو محبت ہو اور اگر خدا دے تو آپ میں ذرا تھوڑی سی زیادہ سمجھ! بس۔

بچے کی ذہنی زندگی میں دو چیزوں پر خاص دھیان دینے کی ضرورت ہے ایک اس کے احساس پر کہ وہ اوروں سے کم ہے اور دوسرے اس کمی کو دور کرنے کے لئے اس کی کوششوں پر۔ انہیں دو چیزوں سے اس کی ذہنی زندگی کا سانچہ بنتا ہے انہیں میں اسے سہارے اور مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور اس میں ماں باپ سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ ماں سے یہ غلطیاں عام طور پر خاص خاص موقعوں پر ہوتی ہیں۔ ماں باپ ان سے آگاہ ہو جائیں تو شاید ان غلطیوں سے بچنے میں آسانی ہو۔

سب سے پہلے تو ان غلطیوں سے بچنے کی ضرورت ہے جو ماں باپ اس وجہ سے کرتے ہیں کہ انہیں یا تو اپنے بچے کی ان جسمانی خرابیوں کا علم نہیں ہوتا جو وہ ساتھ لے کر پیدا ہوا ہے یا علم ہوتا ہے تو وہ ادھر توجہ نہیں کرتے اور ان کمیوں کی وجہ سے بچے کو جو دشواریاں پیش آتی ہیں ان کا ذرا خیال نہیں کرتے۔ کتنے بچے ہیں جو آنکھ کی پیدائشی خرابیوں کی وجہ سے کبھی بلا تکلیف لکھ پڑھ نہیں سکتے کسی کو دھرا دکھائی دیتا ہے، کسی کے سر میں پڑھنے سے درد ہونے لگتا ہے۔ یہ بچے جب پڑھنے لکھنے میں اوروں سے پیچھے رہتے ہیں تو بجائے اس کے کہ ان کی اصلی مشکل کو حل کیا جائے انہیں برا بھلا کہا جاتا ہے، سزا دی جاتی ہے۔ بچہ اپنے قصور کو سمجھتا نہیں، سزا کو ظلم جانتا ہے اور اپنے بس بھر اس سے بچنے کی نئی نئی تدبیریں نکالتا ہے یا اپنی نا اہلی کا یقین کر کے محنت اور توجہ سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ بچوں میں بہت بڑی تعداد خلقی طور پر بیں ہتوں کی ہوتی ہے۔ آپ کا جی آزمانے کو چاہے تو بچوں کی کسی جماعت سے کہئے کہ اپنے پنجے میں پنجہ ڈالو۔ جن بچوں کا بایاں انگوٹھا سیدھے انگوٹھے کے اوپر ہو وہ خلقی بیں ہتے ہیں۔ یہ طریقہ سو فیصدی سچا نہیں لیکن تقریباً ٹھیک نتیجے بتا سکتا ہے، ان بے شمار بیں ہتے بچوں کو رہنا سہنا ہے دیں ہتوں کی دنیا میں گذر کرنے کو تو کہتے ہی ہیں لیکن ان کی دشواری کا کچھ اندازہ کرنا چاہیئے اور ان سے کچھ تو ہمدردی ضروری ہے۔ اگر آپ ہندوستان سے جہاں

سڑک پر بائیں ہاتھ کو بچتے ہیں جرمنی جائیں جہاں داہنے کو بچنا ہوتا ہے تو آپ ان غریب بچوں کی دشواری کا کچھ اندازہ ہو گا جہاں قدم قدم پر کسی نہ کسی سے معافی مانگنی پڑے گی یا ڈانٹ سُننی ہو گی۔ اگر آپ خود اپنی موٹر کار چلا رہے ہوں تو خدا جانے کیا گزرے مگر اس سے بہت زیادہ مصیبت ان بیں ہتے بچوں کو آپ کی دیں ہتی دنیا میں اٹھانی پڑتی ہے سیدھے ہاتھ سے لکھنا سکھایا جاتا ہے، جب اچھا نہیں لکھتے تو بُرا بھلا سننا پڑتا ہے کیا تعجب ہے کہ بہتیرے بھلے مانسوں کا خط ایسا خراب ہوتا ہے کہ تحریر بھی بعض لوگوں کی تقریر کی طرح رازوں کو چھپانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ یہ بچے کوشش سے سیدھے ہاتھ سے لکھنے کی پوری مشق بہم نہیں پہنچا سکتے۔ بعض مشہور مصور جو سیدھے ہاتھ سے کام کرتے تھے خلقی بیں ہتے تھے۔ مگر ضرورت اس کی ہے کہ دشواری کو سمجھ کر بچوں کی ہمت افزائی کی جائے، الٹی ڈانٹ سے انہیں ضد یا کم ہمتی کا سبق نہ دیا جائے یہی حال آنکھ کان کے بہت سے نقائص کا ہے۔ پیدائشی نقائص کے بعد بچے کی آئندہ ذہنی نشوونما کے لئے خطرہ کا ایک وقت وہ ہوتا ہے جب اس کا دودھ چھڑاتے ہیں۔ عموماً جس طرح دھوکا دے کر، ڈرا دھمکا کر دودھ چھڑاتے ہیں، ماں اس زمانے میں جس طرح بچے سے چھپی چھپی الگ الگ رہتی ہے وہ بچوں میں ماؤں کی دنیا کی طرف سے ایسی بے اعتباری پیدا کرنے کا سامان ہوتا ہے جو اکثر ساری عمر ساتھ نہیں چھوڑتا۔ ماں کی گود اور ماں کا دودھ ہی تو بچے کی ساری لذت و مسرت کی کائنات تھی اب چالوں سے ان سے محروم کیا جاتا ہے تو جس پر بچہ سب سے زیادہ بھروسہ کرتا تھا اس پر شبہہ کرنے لگتا ہے۔ دودھ چھڑانے کے ساتھ یہ ضروری نہیں کہ ماں بچے سے الگ الگ دُور دُور بھی رہے اور اسے اپنی محبت سے اور اپنی گود کی روح پرور حرارت سے بھی محروم کرنا چاہیے اس زمانے میں تو بچے سے اور زیادہ محبت کی ضرورت ہے تاکہ بچہ اپنی زندگی کے اس پہلے انقلابی تجربے کے اثرات پر سے آسانی کے ساتھ گذر سکے۔

ایک اور خطرے کا وقت وہ ہوتا ہے جب بچہ بولنا شروع کرتا ہے۔ بولنا جماعتی فعل

ہے اور بولنے کی صلاحیت جماعتی احساس سے فروغ پاتی ہے۔ جو بچے دوسروں سے بے جھجک ملتے ہیں وہ جلد بولنا سیکھتے ہیں، جو ٹھٹکے ٹھٹکے اکیلے رہتے ہیں وہ دیر میں۔ اور بچوں کا یہ ٹھٹکنا اور جھجکنا بے وجہ نہیں ہوتا، اس کی وجہ بھی بھروسہ کی کمی ہوتی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اس زمانہ میں بچوں کو ملنے جلنے کا موقع دیا جائے۔ ان کی ہمت بڑھائی جائے اور خود مختار بے سہارے رہنے کی عادت ڈالی جائے۔ کھیل کود اور سہل سہل کام کرنے کے موقعے نکالے جائیں تاکہ ان میں کامیابی سے ان کی ڈھارس بندھے اور اپنے پر بھروسہ بڑھے اور اپنے گھٹیا رہنے کے خیال اور اوروں سے کم رہنے کے احساس پر غالب آسکیں بعض ماں باپ خصوصاً مالدار اپنے بچوں کے اوپر اتنے خدمتگار مسلط کر دیتے ہیں اور لاڈ پیار میں وہ اہتمام فرماتے ہیں کہ غریب کو اپنی ضرورتوں تک کے اظہار کا موقع نصیب نہیں ہوتا۔ اظہار سے پہلے ہی کوئی نہ کوئی اسے پورا کرنے پر آمادہ ملتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ اکثر بہت دیر میں بولنا سیکھتے ہیں اور وہ بھی واجبی واجبی۔ بدایوں کے وہ مشہور للا جو خاصی بڑی عمر تک اپنی انا کی انگلی تھامے باہر نکلتے تھے، انہی باثروت کم نصیبوں میں تھے! یہی بات تھی کہ سن شعور کو پہنچ گئے تھے اور تتلاتے تھے۔ کسی نے پوچھا میاں صاحبزادے کیا پڑھتے ہو، تو شرماتے، چہرہ لال ہوگیا، انا کے لہنگے سے منہ آدھا چھپا لیا اور بولے جی ہاں بولے "تاؤ ہی بولے مٹھ دسے وبلیل ٹِل پلتھا ہوں"۔

ہکلانے کی عادت بھی، اکثر بلا کسی عضوی خرابی کے بچپن میں اسی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے کہ دوسروں سے تعلق پیدا کرنے میں کسی کمی کے احساس سے، دوسروں کے اٹکانے سے، ماں باپ کے بُرا کہنے سے جھجک پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گفتگو کے ذریعے دوسروں سے تعلق پیدا کرنے میں کوئی سہولت پیدا ہو جائے مثلاً کسی لکھی ہوئی یا یاد کی ہوئی نظم کو پڑھنا ہو اور اس طرح خود سوچنا نہ پڑے اور مخاطب کی طرف سے توجہ ہٹا لینا ممکن ہو تو ہکلانے میں بہت کمی ہو جاتی ہے۔ اکثر ہکلانے والے غصہ میں بالکل نہیں

ہکلاتے، خوب رواں رواں سناتے ہیں۔ عشق اور محبت کی خلوتوں میں بھی کہتے ہیں کہ ہکلاہٹ جاتی رہتی ہے! لیکن دوسروں سے تعلق پیدا کرنے کی دشواری کے علاوہ ایک اور وجہ ہکلاوٹ کی عادت پڑجانے کی یہ ہوتی ہے کہ بچہ ہمیشہ دوسروں کی توجہ اپنی طرف کھینچنا چاہتا ہے۔ جو بچے شروع سے صاف بولتے ہیں ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا پر جن بچوں کی بولی میں کوئی نقص ہوتا ہے ان کی طرف سب توجہ کرنے لگتے ہیں۔ اسے چھیڑتے ہیں اس پر ہنستے ہیں اس کی نقل کرتے ہیں۔ ناچار یہ بچہ بھی اپنی بولی کی طرف سے زیادہ توجہ کرنے لگتا ہے اور اس توجہ سے بولنا اور مشکل ہوجاتا ہے۔ بہت سے کام جنہیں آدمی عادت کے طور پر بے تکلف کرتا ہے اگر ان کی طرف توجہ ہوجاتے تو کرنا مشکل ہوجاتا ہے اس بات پر مجھے ایک دوست کا قصہ یاد آیا۔ یہ ناردے کے رہنے والے بہت بڈھے آدمی تھے۔ کوئی ستر، پچھتر کی عمر تھی، کئی سال ہوتے انتقال فرماگئے۔ کہیں گے کہ کاہے پر یاد کیا۔ ان کی داڑھی بڑی شاندار تھی۔ ایسی ویسی نہیں، پوری ناف تک اور نہایت گھنی سفید جیسے براق۔ ایک دن ریل میں بیٹھے جارہے تھے، سامنے ایک خاتون بیٹھی تھیں اور ان کی آٹھ برس کی لڑکی۔ یہ بچی پہلے تو کئی منٹ تک ہر نیلزون کی طرف دیکھتی رہی پھر ماں کے کان میں کچھ کہا۔ ماں مسکراکر چپ ہورہی۔ اس نے پھر ماں سے کہا "پوچھوں" ماں چپ رہی۔ پھر کہا "پوچھوں" تو ماں نے کہا "پوچھ"۔ بچی ہر نیلزون کے پاس ادب سے آکر کھڑی ہوئی اور کہا "دادا ابا ایک بات پوچھوں؟" ہر نیلزون نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "بیٹی پوچھو" بچی بولی۔ "دادا ابا تم رات کو سوتے وقت یہ ڈاڑھی لحاف کے اندر رکھتے ہو یا باہر؟" غریب دادا ابا نے بہت سوچا مگر سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دیں، آدمی سچے تھے کہہ دیا کہ بیٹی یاد نہیں آتا" خود بیان کرتے تھے کہ اس دن، دن بھر یہی دھیان رہا۔ رات ہوئی سونے لیٹا تو پہلے داڑھی لحاف کے اندر رکھی جی گھبرایا باہر رکھی پھر بے کلی سی رہی اسی اندر باہر میں تین پہر رات بیت گئی آخر اٹھ کر ایک صوفے پر بیٹھا۔ پیروں پر کمبل ڈال لیا تو آنکھ لگی۔ ہاں تو ہکلے بچے بھی جب اپنی بولی

کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں تو بولنا اور مشکل ہو جاتا ہے اور کمزور یا کسی کمی کا احساس رکھنے والے بچوں کو اپنی اس نئی کمزوری سے بڑوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا ایک اور وسیلہ ہاتھ آجاتا ہے۔ اسی طرح کمی کا احساس رکھنے والے بچے جب کوئی مثبت طریقہ اپنی کمیوں کی تلافی کا نہیں اختیار کر پاتے تو کچھ کمزوروں کی سیاست سے کام لیتے ہیں اور اوروں کو متوجہ کرنے کی منفی تدبیریں سوچتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کام میں سستی کرنے لگتے ہیں بیمار بن کر پڑ جاتے ہیں، کھانا نہیں کھاتے اور کچھ نہیں بن پڑتا تو بستر پر پیشاب کر دیتے ہیں۔ خصوصاً جس غذا کو ماں کھلانا چاہتی ہے اس سے انکار ہوتا ہے ماں کی طرف سے خوشامد ہوتی ہے پھر دھمکیاں، پھر ڈکائی، ان کا مقصد سب سے حاصل ہوتا ہے اوروں کو متوجہ کر لیا۔ رفتہ رفتہ غذا کی طرف سے ہی طبیعت میں ایک روک سی پیدا ہو جاتی ہے اور بچے کبھی کبھی واقعی بیمار ہو جاتے ہیں۔ بستر پر پیشاب کر دینے کی وجہ بھی عموماً کوئی عضوی خرابی نہیں ہوتی۔ بچے کا مثانہ اور آنتیں ٹھیک ہوتی ہیں یہ تو بس ماں باپ یا استاد کی توجہ حاصل کرنے کی ایک چال ہوتی ہے۔ اس پر سزا دینے سے ضد یا توجہ حاصل کرنے کی کامیابی سے ایک غیر عقلی محرک پیدا ہو جاتا ہے جس کا عمل رفتہ رفتہ عادت بن جاتا ہے۔ اگر ان حالتوں میں طبی علاج کی جگہ ذہنی علاج کیا جائے یعنی بچے کی توجہ طلبی کو کسی اور طرح تسکین دی جائے اس کا اعتماد حاصل کیا جائے اسے ہمت دلائی جائے تو یقیناً زیادہ کامیابی ہو۔ برخلاف اس کے کہ بچے کو اوروں کے سامنے شرمانا بڑی غلطی ہے اس سے بچے میں اپنے اوپر بھروسہ اور کم ہوتا ہے اور مرض گھٹنے کی جگہ بڑھتا ہے۔

پھر بچے کی تربیت کے لئے ایک کٹھن مرحلہ دوسرے بھائی بہن کی پیدائش کے وقت پیش ہوتا ہے جس خاندان میں بہت سے بچے ہوں وہاں سب سے بڑا بچہ ایک عرصے تک اکیلا بچہ ہوتا ہے یہ شرف دوسرے بچوں کو حاصل نہیں ہوتا جب پیٹھ بہن بھائی پیدا ہوتا ہے تو اس بڑے بھائی کو ایسا لگتا ہے کہ اس نو وارد نے مجھے تخت سے

اُتار دیا اور اس میں ابا اماں نے اس اجنبی کی مدد کی اور مجھ سے بے وفائی برتی۔ اس پر ماں باپ سے اور نو وارد سے خفا ہوتا ہے تو کیا بے جا کرتا ہے اور اپنی کھوئی ہوئی مملکت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے کوشش کرتا ہے تو کیا تعجب اور یہی ہوتا ہے میں ایک خاندان کو جانتا ہوں اس میں دو بچے ہیں ایک بھائی ایک بہن۔ بہن چھ برس چھوٹی ہے۔ بھائی کی عمر گیارہ برس کی ہے، باپ انشورنس کمپنی کے ایجنٹ ہیں ہمیشہ دورہ میں رہتے ہیں۔ شادی کے بعد چار برس بے اولاد گذرے۔ بڑی دعاؤں منتوں تعویذ گنڈوں اور علاج معالجے کے بعد بچہ پیدا ہوا۔ ظاہر ہے ماں کی آنکھ کا تارا تھا اس نے جو چاہا وہی ہوا۔ بچے کی ماں لکھی پڑھی سلیقے مند بی بی ہے بچے کی معمولی تربیت اچھی ہوئی تھی۔ تیسرے درجے تک مدرسے میں خوب شوق سے پڑھنے جاتا تھا۔ سب امتحانوں میں پاس ہوتا تھا۔ ادھر دو برس سے حال ہی کچھ اور ہے۔ ماں کو طرح طرح سے دق کرتا ہے۔ مارتا ہے، بال کھینچتا ہے، مہمانوں کے سامنے خاص طور پر بدتمیزی کرتا ہے، کپڑے پھاڑتا ہے، میلا رہتا ہے، استاد برابر شکایت لکھ لکھ کر بھیجتے ہیں، آپ سمجھے کہ معاملہ کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ بہن نے اس کی زندگی کا سانچہ بدل ڈالا۔ اس کا آنا ہی ناگوار تھا۔ جب یہ تین سال کی ہوئی اور اپنے میٹھے میٹھے بولوں سے ماں کا دل لبھانے لگی یہ مدرسے میں رہتا اور وہ ماں کی گود میں، باپ بھی دورہ سے آتے تو اسی سے باتیں زیادہ کرتے یہ ناقابل برداشت تھا، اب یہ اسے بہن کیسے سمجھتا۔ اسے رقیب جانتا ہے مدمقابل گردانتا ہے۔ اس کا تخت چھن گیا۔ آپ چاہتے ہیں کہ وہ کوئی تدبیر نہ کرے۔ اسی تخت کو پھر سے پانے کے لئے یہ طفلانہ جتن کرتا ہے یہ کوششیں بے شک طفلانہ ہیں آپ کا جی چاہے ان پر ہنسئے اس کے دل سے پوچھئے اسے یہی تدبیر آتی ہے۔ ایسی بدتمیزی سے ماں کو بے وفائی کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے، استادوں کی خراب رپورٹوں سے خوش ہوتا ہے اس لئے کہ ایک مرتبہ کسی استاد نے کہہ دیا تھا کہ تم پڑھتے لکھتے نہیں ہو ہم تمہارا نام کاٹ دیں گے تم گھر ہی پر پڑھا کرو۔ اس سے امید ہو

گئی ہے کہ مدرسہ سے نجات پاکر گھر رہ سکوں گا تو دن بھر وہ رقیبہ ماں پر قابض نہ رہ سکے گی۔ غرض اس بچے نے ساری زندگی اسی ایک خیال پر منحصر کر دی ہے۔ لیکن کیا یہ سب ضروری اور لازمی ہے نہیں اگر ماں بڑے بچے کو چھوٹے کی آمد سے پہلے اس واقعہ کے لئے تیار کر لے تو اس میں بہت کچھ کمی ہو سکتی ہے۔ پھر رقابت کے اس امکان کا خیال رہے تو یہ اپنی محرومی کو اس درجے محسوس نہ کرے۔ سلیقہ والی ماؤں کے لئے یہ ناممکن نہ ہونا چاہیئے کہ وہ اس بڑے بچے کے لئے اس واقعہ پیدائش کو حریف کی ولادت کے حادثہ کی جگہ واقعی بھائی، دوست، ساتھی کی آمد کی مبارک موقعہ بنا دے۔

زیادہ بچوں والے خاندان میں اس سے بھی عموماً بچوں کی ذہنیت پر بُرا اثر پڑتا ہے کہ ان کا مرتبہ ان بچوں میں کیا ہے؟ عموماً سب سے چھوٹا بچہ یا تو سب سے تیز ہوتا ہے یا بالکل نکما۔ وجہ صاف ہے یہ سب سے کم ہوتا ہے اس لئے سب سے بڑھنا چاہتا ہے اگر صلاحیت ہے اور حالات موافق ہیں تو بڑی تیزی سے بڑھتا ہے اور سب پر سبقت لے جاتا ہے اگر قوتیں حوصلہ کا ساتھ نہیں دیتیں تو بالکل شل ہو کر مایوسی سے کندھا ڈال دیتا ہے سب سے چھوٹے بچے کے لئے یہ خطرہ بھی ہے کچھ نہ ہو اور یہ امکان بھی کہ سب کچھ ہو جاتے اس کے مقابلے میں سب سے بڑا بچہ عموماً قوت کا پرستار۔ جبر کا حامی، حکومت اور قانون کا ساتھی ہوتا ہے اس لئے کہ اس نے اقتدار کا مزا چکھا ہے اور جب دوسرے بچوں کی پیدائش نے اس سے یہ اقتدار کچھ چھینا تو وہ اس وقت سے اسے اور بھی قیمتی سمجھنے لگا ہے۔

ماں باپ اگر ان موقعوں پر جن کا ذکر میں نے کیا ہے ذرا ہوشیاری سے کام لیں تو بچے کی زندگی میں بہت سے پیچ نہ پڑنے پائیں۔ ضرورت ہے محبت کے ساتھ تھوڑی سی سمجھ اور اور تھوڑے سے علم کی اور ہاں صبر کی۔ محبت تو کہتے ہیں ماں باپ کو بچوں سے ہوتی ہی ہے مگر یہ آخری تین چیزیں ذرا کمیاب ہیں!

بک اونر : آصف سعید

سکین بائے : سلمان سلیم

03048890501

سلمان

SALMAN SALEEM

PRESENTS